گمنام ریاست

(حصہ دوم)

سلیمان شاہد

عنوان | صفحہ نمبر

باب ششم

☆ نظام تعلیم 47

☆ نواب اورنگزیب کا اسلامیہ کالج کیلئے چندہ 47

☆ نوابی دور کی تعلیم 48

☆ علمی فروغ کیلئے کوششیں، شہزادوں کی تعلیم 49

☆ 1961ء میں دیر کی تعلیمی شرح 50

☆ شعروادب 51

باب ہفتم

☆ ذرائع امدورفت 53

☆ ریاست دیر کی قدیم شاہرا 53

☆ نواب شاہ جہان کا عہد 53

☆ انگریز فوج کیلئے سفر میں مشکلات پیدا کرنا 53

☆ ڈاک بس سروس 54

☆ کچھوے کی چال 55

☆ بیرونی گاڑیوں اور سیاحوں پر پابندی 56

☆ ریاست کا بیرونی دنیا سے رابطہ 57

☆ انتظام صحت 58

☆ صحتمندی 59

باب ہشتم

☆ معیشت، عہد شاہ جہان 60

☆ بازاروں پر اجارہ داری 61

عنوان	صفحہ نمبر
☆ ٹھیکیداری نظام	61
☆ کرنسی کے گردش کو روکنا	62
☆ پائی پائی کی وصولی	63
☆ ذرائع آمدن	64
☆ قومی خزانے کا راز، کرنسی	67
☆ عوامی خرچ، رعایا کی مفلسی	68
☆ نواب کی شاہ خرچیاں	69
☆ دوام اقتدار کیلئے خرچ	70
باب نہم	
☆ تعمیرات	72
☆ شاہی و سرکاری عمارات	73
☆ سرکاری ریسٹ ہاؤس اور بنگلے	75
☆ فوجی قلعے	78
☆ میاں گل جان بنگلہ، نور محل تبرکات	79
☆ میاں کلے بازار	79
☆ پرانی مساجد، انگریزی باقیات	80
باب دہم	
☆ جنگلات	81
☆ ناغہ سسٹم	81
☆ جنگلی جانوروں اور پرندوں کی بہتات	82
☆ زراعت	83

عنوان	صفحہ نمبر
☆ دیسی گھی اور مال مویشیوں کی فراوانی	84
☆ نظام اپاشی	85
☆ دریائے پنجکوڑہ	85

گیارہواں باب

☆ نواب شاہ جہان کے عہد میں جاگیر سازی	86
☆ مورثی زمینیں	86
☆ فوج اور جرمانوں کے ضمن میں جائیداد سازی	87
☆ کوہستانی جنگلات	87
☆ ترکلانی قبیلے اور اخون خیل جائیداد	88
☆ نواب اول خان محمد شریف خان کی جائیداد	89
☆ بھائی عالمزیب خان سے جائیداد قبضہ کرنا	89
☆ سوتیلے بھائی تیمر خان کی جائیداد	90
☆ محمد نواز خان کو جائیداد سے محروم کرنا رعایا اور حکمران کی جائیداد	90

بارھواں باب

☆ ریاستی دور میں رعایا کی بود و باش	91
☆ معاشرتی نظام، ہنر اور پیشے	92
☆ تجارت اور کھیتی باڑی	94
☆ چھوٹا سا گھر	96
☆ ریاستی دور کی عورت	97

	عنوان	صفحہ نمبر
☆	جرگہ، مہمان نوازی	98
☆	شادی، ڈھول سرنا بجانا	99
☆	بچے کی پیدائش	101
☆	انتقال	102
	کھیل کود	103
☆	لباس، جوتے اور زیورات	106
☆	پشتو ضرب المثل اور کہاوتیں	107
☆	دنوں اور مہینوں کے نام	108
☆	علم و مذہب	108
	تیرھواں باب	
☆	خارجہ پالیسی	112
☆	انگریزوں سے تعلقات	113
☆	شاہ ایران اور شاہ افغانستان سے تعلقات	113
☆	گورنر جنرل سے تعلقات	114
☆	انگریزوں سے چالبازیاں	114
	چودھوں باب	
☆	نواب شاہ جہان کے عہد میں سیاسی سرگرمیاں	118
☆	تقسیم ہند کی مخالفت اور انگریزوں کی حمایت	119
☆	کانگریس کی مخالفت	119
☆	باچا خان تحریک اور نواب دیر	119
☆	مسلم لیگ اور جماعت اسلامی	120

عنوان	صفحہ نمبر
☆ پنڈت جواہر لعل نہرو پر چھراؤ	121
☆ ریاست دیر کا پاکستان سے الحاق	122
☆ جہاد کشمیر	122
چودھواں باب	
☆ اقتدار شاہ جہان کے دوام بخش محرکات	125
☆ بااثر خاندانوں سے انتظامیہ کی تشکیل	126
☆ بااثر خاندانوں میں رشتے	127
☆ پڑوس حکمرانوں سے رشتے	128
☆ طاقتور قبائل کی حمایت	129
پندرھواں باب	
☆ جاسوسی نظام	130
☆ ملاکنڈ انتظامیہ کی جاسوسی	130
☆ پڑوس ریاستوں میں جاسوس	130
☆ صحافت کے بارے میں رویہ	132
☆ پریس اور ریڈیو سٹیشن پر اثر دخل	132
☆ دستاویزات پر پابندی	133
☆ رعایا کی زبان بندی	134
سولھواں باب	
☆ تحریک آزادی دیر	135
☆ دیر کے غیور اور بہادر مجاہدین	136
☆ معرکہ سمکوٹ	136

عنوان	صفحہ نمبر
☆ گمنام ہیرو	137
☆ تحریک وحدت ترکلانی	140
☆ بغاوت 1959ء	141
☆ ریاستی فوج کا ظلم وستم	142
☆ حکمران دیر کا زوال	144
☆ محمد شاہ خسرو اور شہاب الدین کا اقتدار پر اختلاف	145
☆ محمد شاہ خسرو پر زہر کا الزام لگانا	146
☆ نواب شاہ جہان کی گرفتاری	147
☆ اخون الیاس کا آنا اور نواب شاہ جہان کا جانا	148
☆ آزادی کا پیغام	149
☆ ریاست کی نظم ونسق میں تبدیلیاں	152
☆ نواب نے مزاحمت کیوں نہ کی؟	153
☆ نواب دوران نظر بندی	154
☆ وفات	155
☆ نواب شاہ جہان کی طرز حکومت کے پہلو	156
☆ نواب محمد شاہ خسرو کی عہد حکومت	159
☆ نواب شہاب الدین المعروف جندول خان	163
☆ نواب محمد شاہ جہان کی ذاتی زندگی	165
☆ نواب محمد شاہ جہان کا رعب ودبدبہ	200
☆ نواب محمد شاہ جہان کی خوبیاں	207
☆ شاہی خاندان کا موجودہ حال	216
☆ ریاست دیر انقلاب کے بعد	225

سلیمان شاہد ایسا پشتون نوجوان ہے جو اپنی خوبصورت سرزمین اور اس کے غیور باشندوں کیلئے محبت رکھنے کے ساتھ ساتھ شعور بھی رکھتا ہے۔ علاقہ دیر کا رہنے والا یہ نوجوان ایک طرف اعلیٰ تعلیم کے حصول کیلئے سرگرم عمل ہے تو دوسری طرف اپنے جنم بھومی، اس کے قدرتی خزانوں اور انسانی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا عشق اس کے دل و دماغ اور اس کے خون اور ارادوں میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ اور جان فشانی کے ساتھ اس کوشش میں مصروف ہے کہ یہاں تعمیر و ترقی اور خوشحالی کا ایسا دور آئے کہ سر بہ فلک پہاڑوں کی ثمر بخش وادیوں، سرسبز و شاداب میدانوں، لہلہاتے کھیتوں، شیریں چشموں اور گنگناتی ابشاروں کی یہ دھرتی تعمیر و ترقی اور خوشحالی کی راہ پر گامزن ہو سکے۔

صد افسوس کہ ماضی قریب میں اس سرزمین کی خداداد طبعی حسن اور انسانی توانائیوں پر اندھیرے چھائے رہے۔ سلیمان شاہد نے سب سے پہلے ایک روشن منزل کی طرف بڑھنے کی خاطر انھی اندھیروں کا پردہ چاک کرنے اور ہر لحاظ سے روشن فضاء پیدا کرنے کیلئے قلم اٹھایا۔ یہ کام اسلئے مشکل تھا کہ آج تک دیر کی تاریخ اور تمدن پر بہت کم لکھا گیا۔ اس باہمت نوجوان نے یہ کٹھن سفر قدم بقدم مشکلات اور آزمائشوں کا مقابلہ کرتے ہوئے شروع کیا۔ جس کے نتیجے میں اس کی تحریر" گمنام ریاست" ایک کامیاب کوشش نظر آتی ہے۔ جس پر اس کا ذہن اور قلم مبارکباد کے مستحق ہیں۔ امید اور دعا ہے کہ اس سلسلے میں اس کا ہر اگلہ قدم سرخروئی کے ساتھ آگے بڑھے۔

سلیمان شاہد کو ایک عرصہ سے علم و ادب کے شوق اور اپنے قومی اور انسانی حدف کی طرف بڑھنے کے جذبے نے میرے ساتھ متعارف کروایا۔ اس دوران میں نے اس کے ذہن کو سمجھنے اور اس کے تعمیر و ترقی کے جذبات کی خاطر اپنی بساط کی حد تک اس کی تحلیل نفسی بھی کی۔ مجھے خوشی ہوئی کہ میں نے اس کو اپنے ارادوں میں اور شوق کی جانب بڑھنے میں مخلص، باہمت اور قابل پایا۔ مجھے امید ہے کہ وہ اس جانثاری کی حد تک کوششوں کے نتیجے میں آگے بڑھتا رہے گا۔ نیز میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کو اپنی قوم اور وطن کی محبت اور خدمت کے ساتھ انسانیت کی خدمت کرنے کا جذبہ بھی اپنی ہم عمر رکھنے والوں میں کسی سے کم نہیں۔

اجمل خٹک

ریاست دیر کا تعارف

ریاست دیر جغرافیائی لحاظ سے صوبہ سرحد کا اہم علاقہ ہے۔ اس کے مشرق میں سوات، شمال مشرق میں گلگت، شمال میں چترال، مغرب میں باجوڑ اور افغانستان اور جنوب میں ملاکنڈ ایجنسی اور ارنگ برنگ کے علاقے واقع ہیں۔ پاکستان کی قومی شاہراہ (کراچی سے چترال، گلگت تا چین) بھی دیر سے گزرتی ہے۔ افغانستان سے سرحدیں ملنے کی وجہ سے بھی انگریزوں نے دیر کی سرزمیں کو اہمیت دی۔ ریاست دیر گزشتہ دس ہزار سال سے انسانی اماجگاہ رہی ہے۔

یہی تفصیل گمنام ریاست حصہ اول میں موجود ہے۔

ریاست دیر کے شاہی خاندان نے دیر پر 1640ء تا 1967ء یعنی تین سو سترہ سال مسلسل حکومت کی جس میں عمر اخان کا پانچ سالہ دور اقتدار بھی شامل ہے۔ 1897ء میں دیر میں نوابی کا آغاز ہوا۔ 1967ء میں دیر کے چوتھے نواب خسرو کو اقتدار سے ہٹایا گیا۔ کچھ عرصہ تک دیر ملاکنڈ ایجنسی میں شامل رہا۔ 1969ء میں ریاست کی جداگانہ حیثیت ختم کر کے اسے باقاعدہ ایک ضلع کی حیثیت سے پاکستان میں شامل کیا گیا۔ 1996ء میں انتظامی دشواری کی وجہ سے دیر کو دو اضلاع میں تقسیم کیا گیا۔

حکمران خاندان

دیر کے شاہی خاندان کا تعلق پائندہ خیل قبیلے سے تھا۔ پرانے زمانے میں دیر، سوات اور چترال پر مذہبی خاندانوں نے حکومت کی۔ دیر کے شاہی خاندان کا تعلق بھی ایک مذہبی گھرانے سے تھا اس خاندان کے آباؤ اجداد نہا گدرہ کے کوہان نامی علاقے کے باسی تھے اور کھیتی باڑی کے پیشے سے منسلک تھے۔

شاہی خاندان کا جد اعلیٰ اخون الیاسؒ بابا

دیر پر اس خاندان کے تسلط کی ابتداء اخون الیاسؒ بابا سے ہوتی ہے۔ جو پائندہ بابا کی چوتھی پشت میں تور بابا کے ہاں پیدا ہوئے۔ آپ کا پورا شجرہ نسب کچھ اس طرح ہے۔ اخون الیاسؒ بن تور بابا بن ابراہیم بن بھامت خان بن موسیٰ بن پائندہ بابا بن ملے بابا بن خواجو بن اکو بن یوسف بابا۔

اخون الیاس نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اور مزید علم کی تلاش میں موضع خال کے میاں نورؒ کے ساتھ 1640ء میں ہندوستان کی راہ لی۔ یہ دونوں طالب مشہور پیر حضرت بنوڑؒ کے مرید رہے۔ اپنے پیر کے ساتھ مکہ مکرمہ میں کچھ عرصہ گزارنے کے بعد اخون الیاسؒ نے نہا گدرہ آکر دین کی تبلیغ شروع کی ۔آپ نے مختصر عرصے میں بہت نام کمایا اور اثر روسوخ حاصل کیا۔1676ء میں وفات پائی اور لاجبوک درّہ میں دفن ہوئے۔

ملا اسماعیل 1676ء تا 1752ء

اخون الیاسؒ کا جانشین بڑا بیٹا ملا اسماعیل بنا۔ جس کے پاس زائرین کی آمد جوق در جوق جاری رہی۔ آپ نے آخری دور میں نہا گدرہ سے بیبیوڑ ہجرت کی اور یہاں لوئی بابا کے نام سے آپ کا مزار موجود ہے۔ ملا اسماعیل کے دوسرے بھائی عبداللہ نے اپنے والد اخون الیاس کے ساتھ لاجبوک درّہ آکر رہائش اختیار کی۔ آپ کی اولاد لاجبوک میاں گان کے لقب سے جانی جاتی ہے۔

خان غلام خان 1752ء تا 1804ء

اخون بابا اور ملا اسماعیل کو بنیادی شرعی علوم پر دسترس ہونے کی وجہ سے لوگ وظیفہ کی شکل میں زمین (سیرئی) اور مال مویشی ہدیہ کرتے تھے۔ جائیداد اور مال مویشی کی فراوانی دیکھ کر اخون بابا کے پوتے خان غلام خان دنیاوی طرز حکمرانی میں دلچسپی لینے لگے اور نوکر چاکر رکھ کر بیبیوڑ سے باقاعدہ خانی نظام کا آغاز کیا۔ اسی وجہ سے انھیں دیر کا پہلا حکمران مانا جاتا ہے۔

خان ظفر خان 1804ء تا 1814ء

غلام خان کے جانشین خان ظفر خان ہوئے۔ آپ نے تنخواہ دار فوج تشکیل دی۔ سلطان خیل اور پائندہ خیل کے جنگجو قبائل کو لے کر آپ نے کوہستان کے کافروں پر حملہ کر کے ان کے ساڑھے تین سو سالہ اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔ فتح پا کر آپ نے کافروں کا قلعہ مسمار کر دیا۔ بیبیوڑ سے دیر ہجرت کر کے وہاں ایک نیا قلعہ تعمیر کیا اور اسے اپنی حکومت کا پایہ تخت بنا دیا۔ جس کے آثار اب بھی بہتر حالت میں نواب محل کے نام سے دیر خاص میں موجود ہیں۔

خان قاسم خان شہید 1814ء تا 1822ء

جنگجو خان ظفر خان کے بعد قاسم خان تخت نشین ہوئے۔ والد کی طرح جنگوں کا سلسلہ جاری رکھا اور سلطنت کو جنوباً سخاکوٹ اور مغرب میں اسمار تک بڑھا دیا۔ اس خان کو سازش کے تحت بیٹوں نے شہید کر دیا۔ خاوند کے شہید ہوتے ہی مہتر چترال کی بہن اپنے یتیم بیٹے کو لے کر چترال پہنچی۔ تاکہ یتیم غزن کو سوتیلے بھائی زک نہ پہنچا سکیں۔ خان قاسم شہید کو دیر خاص میں دفن کیا گیا ان کے نام سے قبرستان خان شہید کے نام سے منسوب ہے۔

خان غزن خان 1822ء تا 1868ء

خان قاسم خان کی شہادت کے بعد خانہ جنگی شروع ہوئی۔ غزن خان جب سترہ سال کے ہوئے تو اپنے ماموں مہتر چترال کی مدد سے لشکر تشکیل دے کر دیر میں اپنے بھائیوں پر حملہ آور ہوئے۔ شدید جنگ کے بعد ایک بھائی سعید خان قتل اور دو بھائی باجوڑ فرار ہو گئے۔ تخت نشین ہو کر غزن خان ایک بیدار مغز حکمران ثابت ہوئے۔ چند سالوں میں وہ دوبارہ آسمار اور سخاکوٹ تک علاقوں پر قابض ہو گئے۔ 1863ء میں معرکہ امبیلہ (بونیر) میں غزن خان نے ہزاروں سپاہیوں کے ساتھ انگریزوں سے بھی زور آزمائی کی۔

ریاست دیر پر شاہی خاندان کے تین سو سترہ سالہ دور حکومت میں غزن خان کے دور کو عہد زریں کہا جاتا ہے۔ چھیالیس سال تک حکمران رہنے کے بعد آپ نے 1868ء میں وفات پائی۔

خان رحمت اللہ خان 1870ء تا 1884ء

غزن خان کی وفات کے بعد ان کے بڑے بیٹے جامداد خان حکمران بنے۔ ان کا عرصہ اقتدار بہت مختصر ثابت ہوا کیونکہ دو سال اقتدار میں رہنے کے بعد ان کے بھائی خان رحمت اللہ خان نے ان سے اقتدار چھین لیا۔ حملہ آور خان جنگجو ہونے کے علاوہ بیس سال اپنے والد غزن خان کے فوج کا سپہ سالار بھی رہ چکا تھا۔ کچھ وجوہات کی بناء پر جب انھوں نے بیٹے خان محمد شریف خان کو بے دخل کیا تو وہ سیدھا جندول پہنچا جہاں ترکلانی سردار خان عمرا خان کی حکمرانی تھی۔ ولی عہد نے ان کو اپنے باپ پر لشکر کشی کیلئے ابھارا جس کی وجہ سے جندول اور دیر کے مابین لشکر کشیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ بھرپور مزاحمت کے باوجود

عمر اخان نے آدھے دیر کو جندول کا حصہ بنادیا۔ انہی جنگی بغاوتوں اور انتشار کے زمانے میں خان رحمت اللہ خان کی وفات ہوئی۔ انھیں خان شہید قبرستان میں والد غزن خان کے سنگ دفنا دیا گیا۔

خان محمد شریف خان 1884ء تا 1890ء

رحمت اللہ خان مرحوم کے بعد شرینگل میں مقیم خان محمد شریف خان نے نو بھائیوں کی مخالفت کے باوجود بزور شمشیر اقتدار پر قبضہ کرلیا۔ کچھ عرصہ بعد اس حکمران پر بھائی جمروز خان اور بھتیجے نے قاتلانہ حملہ کیا لیکن خان کے محافظوں کی جوابی فائرنگ سے حملہ آور مارے گئے۔ خان محمد شریف خان کے عہد میں ان کے خلاف عمر اخان نے کئی تابڑتوڑ حملے کئے۔ بالاخر 1890ء میں جندول کے لشکر نے دوطرفہ حملہ کر کے پورے دیر پر قبضہ جمالیا اور خان شریف کو خانی سے معزول کر کے سوات میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔

سلطنت جندول کا عروج وزوال

ترکلانی قبیلہ کے نامور حکمران خان عمر اخان نے 1880ء میں جندول کا اقتدار سنبھالا۔ وہ پندرہ سال تک اپنی سلطنت کو وسعت دینے کیلئے رسہ کشی میں مصروف رہے۔ پہلے انگریزوں سے قربت رہی۔ لیکن جب انھوں نے دیر پر قبضہ جما کر جنوب میں سخاکوٹ، مغرب میں اسمار اور شمال میں کافرستان پر پے در پے حملے کئے۔ تو انگریزوں کی روش بدل گئی۔ علاوہ ازیں انگریز ان کے نعرائے پختونستان سے بھی خائف تھے۔

اپنی حکومت کو توسیع دینے کے آخری مرحلے میں عمر اخان نے چترال کو قبضہ کرنے کیلئے مہم جوئی کو دوام دیا۔ جندول کا جھنڈا چترال میں دروش قلعہ پر لہرادیا۔ شومئی قسمت سے انگریز آڑے آگئے اور انھوں نے عمر اخان کا راستہ روک لیا۔ لشکر جندول نے انگریزوں سے بھرپور ٹکر لی لیکن انگریزوں نے حسب سابق بھرپور حکمت عملی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بیس ہزار کا مزید تازہ دم لشکر براستہ ملاکنڈ کمک کیلئے بلوالیا۔ جندول لشکر نے انگریزوں کو پانچ محاذوں پر روکنے کی کوشش کی لیکن شکست ہی ان کا مقدر بنی اور یوں عمر اخان کا تختہ الٹ دیا گیا عمر اخان جندول چھوڑ کر کابل ہجرت کر گئے اور وہاں پر مستقل سکونت اختیار کر لی۔

(عمر اخان کی مہم جوئیاں، طرز حکومت اور دھڑن تختہ ہونے کا حال دیکھئے پہلا حصہ گمنام ریاست)

ریاست دیر میں نوابی کا آغاز 1897ء

جندول کا تختہ الٹا کر انگریزوں نے 1895ء میں دیر سمیت عمرا خان کی سلطنت جندول بھی معزول خان محمد شریف خان کو سونپ دی۔ دو سال بعد انھیں 12 دسمبر 1897ء کو چکدرہ میں ایک پروقار تقریب میں نواب آف دیر Duke کا خطاب دیا۔ چار سو رائفلوں کے علاوہ دس ہزار سالانہ وظیفہ مقرر کیا گیا۔ انگریزوں کے خلاف جندول کی شکست کے باوجود جندول عوام نے انگریزوں اور نواب دیر کے خلاف جدوجہد جاری رکھی۔

1895ء تا 1904ء حکومت میں رہ کر بھی خان محمد شریف خان ترکلانی قبیلہ کی سرکوبی نہ کر سکے اور نہ ہی انھیں پروان چڑھنے کا موقع مل سکا۔ ان کا دور اقتدار جو کہ نو سالوں پر محیط ہے، اندرونی خلفشار کی وجہ سے عدم استحکام کا شکار رہا۔ 1904ء میں فالج زدہ ہو کر آپ مشہور بزرگ خواجہ معین الدین المعروف بہ تیمر گرہ صاحب کی گود میں جہان فانی سے رخصت ہوئے۔ وہاں سے ان کی میت دیر خاص لے جا کر خان شہید قبرستان میں دفنادی گئی۔

نواب دوم محمد اورنگزیب خان المعروف چاڑا (گونگا) نواب

آپ کی پیدائش 1877ء میں بمقام براول بانڈئی ہوئی۔ بچپن میں ایک نوکرانی کے ہاتھوں تالاب میں گرنے سے قوت گویائی میں فرق آیا اور زبان میں لکنت پیدا ہوئی۔ اسی نسبت سے آج وہ چاڑا نواب کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ 1890ء میں جب عمرا خان نے دیر پر قبضہ کرلیا تو یہ تیرہ سالہ شہزادے اپنے خاندان سمیت نہا گدرہ کے پہاڑوں سے ہوکر سوات خان چھم پہنچے۔ 1895ء میں ان کے والد نے نوابی حاصل کی اور 1904ء میں ستائیس سال کی عمر میں یہ اپنے والد کی جگہ تخت نشین ہوئے۔

نواب اورنگزیب ایک سادہ مزاج اور کٹر پختون تھے۔ آپ خیرات وزکواۃ میں انتہائی فراخ دل تھے۔ آپ کے دربار میں اہل علم کی بڑی عزت تھی۔ پانچ وقت نماز باجماعت ادا کرنے کے علاوہ آپ ہر جمعہ کو روزہ رکھتے تھے۔

نواب اورنگزیب کے دور میں بغاوتیں

بادشاہت کے معاملے میں نواب اورنگزیب نہایت بدقسمت رہے۔ جب انھوں نے دیر کا تاج سر پر سجایا تو انھیں سوات اور جندول کے متنازعہ علاقے بھی اقتدار میں سپرد کئے گئے۔ جس طرح کہ علاقہ شموزئی جو 1853ء میں عزن خان نے بزور شمشیر دیر کا حصہ بنالیا تھا اور جندول کا علاقہ جو کہ 1895ء میں انگریزوں نے نواب دیر کو سپرد کیا تھا۔

تاریخ شاہد ہے کہ یہ نواب بیس سالہ دور اقتدار میں بیشتر اوقات بغاوتیں دبانے میں مصروف رہے۔ یہ نواب اورنگریب کی سیاسی کمزوری تھی کہ وہ انگریزوں کو اعتماد میں لے سکے نہ جندول اور سوات کے باغیوں کے ساتھ کوئی اہم معاہدہ کرسکے بلکہ سارا عرصہ محاذ آرائی میں گزار دیا۔ نواب اورنگزیب ایک دلیر، بہادر اور جنگجو حکمران تھے مگر وہ جنگی چالوں میں ماہر نہ تھے یہی وجہ تھی کہ وہ مرتے دم تک جندول اور سوات کو دیر کا حصہ بنانے میں ناکام رہے۔

(ان جنگوں کی تفصیل کیلئے دیکھئے، گمنام ریاست حصہ اول)

1908ء دلی نواب محمد اورنگزیب خان اپنے کابینہ کے ساتھ

نواب اورنگزیب بحیثیت حکمران

میدان حرب کے ایک بہادر سپہ سالار ہونے کے باوجود آپ میں انتظامی خوبیوں کا فقدان تھا ۔ان کی سب سے بڑی کمزوری اختیارات کو دوسروں کے سپرد کرنا اور دوسروں پر حد سے زیادہ اعتماد کرنا تھا ۔آپ کے دور میں جاسوسی نظام کمزور رہا اسلئے آپ سوات اور دیر کی لڑائیوں میں سازشوں سے بے خبر رہے۔آپ انتہائی درگزر کرنے والے تھے اور یہی وجہ تھی کہ انتظامی افسران غلطی پہ غلطی کرتے چلے گئے اور حکومت پر آپ کی گرفت ڈھیلی پڑتی گئی جو کہ بعد میں آپ کے زوال کا باعث بنی۔

نواب پر اپنے درباریوں کا ظلم

زوجہ محترمہ خارو بی بی (ولی عہد محمد شاہجہان کی سوتیلی ماں) جس سے نواب بے پناہ محبت کرتے تھے۔''خارو''پشتو میں مینا کو کہتے ہیں۔ان کا اصل نام معلوم نہ ہوسکا۔شاید خارو ہی ان کا اصل نام تھا یا نواب پیار سے خارو کہا کرتے تھے۔ان کا پہلا خاوند بہورا نامی شخص تھا جس سے یہ حسین وجمیل عورت نواب نے تین ہزار روپیہ کے عوض خرید لی تھی۔

نواب پر فالج کا حملہ ہوا وہ محل تک محدود ہو کر رہ گئے۔خزانے کی چابیاں اور انتظامی اختیارات پہلے سے وزیر اور مشیروں کے پاس تھے۔ان کے نام پیشو گے مرزا،عبدالحق،گورامان اور سپہ سالار صفدر خان تھے۔ملکہ کیلئے نواب کی انس ومحبت کو دیکھ کر درباریوں نے اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ۔جب یہ بے ایمان افسر نواب سے کوئی بات منوانا چاہتے تو ملکہ کا سہارا لیتے۔

نواب کی بیماری کے آیام میں خارو بی بی کی وفات ہوئی۔جس سے نواب کو شدید ذہنی صدمہ ہوا اور وہ ان کی یاد میں تڑپتے اور روتے رہے حتی کہ پاگل پن کے آثار نمایاں ہوتے گئے۔ملکہ کی موت ایک معمہ بن گئی بعض لوگوں کا خیال تھا کہ وہ فطری موت نہیں مری بلکہ اسے مارا گیا تھا۔

نواب کی یہ ذہنی اور جسمانی ابتری دیکھ کر لالچی افسر اب دونوں ہاتھوں سے خزانہ لوٹنے لگے۔ کہتے ہیں کہ نواب کی زبان پر ہر لحہ خارو بی بی کا نام جاری رہتا۔دیر کے کئی سال خوردہ لوگوں سے یہ قصے سنے گئے۔'' جب نواب اپنی خوابگاہ میں جاتے تو ایک افسر بھیس بدل کر خارو بی بی کا روپ دھار لیتا اور نواب کو متوجہ کرنے کیلئے ان کے سامنے سے گزرتا۔موافق حلیہ اور چال ڈھال دیکھ کر نواب کو فوراً خارو

بی بی یاد آجاتی اور پوچھنے لگتے یہ کون تھی؟۔

باقی ساتھی آ کر کہتے کہ "یہ خارو بی بی تھی اور کہہ رہی تھی کہ اتنی رقم بھیج دیں تو پھر میں آؤں گی۔ بیوی کے عشق میں دیوانہ نواب اپنے خزانچی کو بلا کر کہتے" :ھلہ زر ورکڑئی چہ سومرہ غواڑی" "جلدی سے دے دیں جتنا مانگتی ہے"۔ بعض افسران (معذور) نواب کو ہاتھوں میں اٹھائے خارو بی بی کی قبر پر لے جاتے۔ اس کے پاس ہی قبر کے قریب ایک بندہ چھپ کر خارو بی بی کے مشابہ آواز نکالتا اور کہتا کہ "میں باہر آجاؤں گی لیکن مجھے اتنا زیور چاہیئے" اور اسی بہانے وہ بے تحاشہ سونا بھی بٹورتے

ولی عہد کو ہر لمحے کی خبر بانڈئی پہنچتی رہی۔ دیر دربار آتے ہی، افسران ولی عہد کے خلاف ہرزہ سرائی سے ان کے والد کو گمراہ کرتے رہے۔ ولی عہد جذبہ احترام کی وجہ سے ان ساری باتوں کو برداشت کرتے رہے۔ کئی وجوہات کی بناء پر درباری افسران کی حمایت محمد شاہ جہان کی بجائے عالمزیب خان کے ساتھ تھی۔ یوں بہکاوے میں آ کر عالمزیب خان ہی نوابی کا جھولا جھولنے لگا۔ جس سے اقتدار کیلئے بھائیوں میں رسہ کشی میں اضافہ ہوا۔

ریاست میں یہ چرچا تھا کہ دیر کا آئندہ نواب عالمزیب خان ہوگا۔ فالج زدہ نواب بھی چھوٹے بیٹے کا طرفدار تھا کیونکہ وہ جنگجو اور مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ وہ باتونی اور چالاک بھی تھا جبکہ ولی عہد براول بانڈئی سے محل آ کر ریاستی معاملات میں دخل دیئے بغیر واپس چلا جاتا اور معجون کے نشے سے دل بہلاتا رہتا۔

محمد شاہ جہان کے ہاتھوں اپنے باپ کا قتل

ولی عہد شاہ جہان بچپن سے کافی خاموش طبع اور تند خو تھا۔ بے ایمان درباری افسران نے ان کی انکھوں میں وہ قہر وطوفان دیکھا جو بعد میں حقیقت کا روپ دھارنے والا تھا۔ یہ افسران ہرگز یہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ دیر کا آئندہ بادشاہ بنے۔ اقتدار کی اس کشمکش میں ولی عہد نے ایک خطرناک کھیل کھیلنے کا فیصلہ کیا۔ جب انھیں درباری افسران کے ہاتھوں اپنے قتل کی بو محسوس ہونے لگی تو انھوں نے اپنے فالج زدہ باپ کو راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کرلیا۔

نواب اورنگزیب (چاڑا نواب) کی وفات کے متعلق ان کا پوتا سلطان خان (رہائش جان بٹئی درّہ براول) کہتے ہیں کہ ''میں نے اپنے والد عالمزیب خان سے سنا تھا کہ ولی عہد شاہ جہان نے اپنے باپ کو زہر دے کر مروایا''۔ یہ بات مرحوم نواب کے ذاتی ڈاکٹر جو ڈاکٹر ملا کے نام سے مشہور تھے، سے بھی ایک پائندہ خیلی بزرگ نے سنی تھی لیکن ولی عہد کے خوف اور دہشت کی وجہ سے افسران نے یہ راز اندرون خانہ چھپائے رکھا۔

سپہ سالار کی گرفتاری

چاڑا نواب کی لاش کو دربار کے دریچہ (دربچہ) نامی عمارت میں رکھا گیا تھا اور اس دوران نواب کی شدید علالت کی خبر پھیلا کر ولی عہد نے سپاہی بھیج کر فوج کے سپہ سالار صفدر خان کے گھر کا محاصرہ کرلیا کیونکہ وہ عالمزیب خان کا دیرینہ حمایتی اور ان کی حکمرانی کا خواہشمند تھا۔

حملے کی بو سونگھ کر صفدر خان، جان کی بازی لگا کر فرار ہونے میں کامیاب ہوا اور ایک فرنگی چوکی میں پناہ لے لی۔ وہاں سے انگریزوں نے سپہ سالار کو ملاکنڈ منتقل کیا۔ سپہ سالار کے علاوہ وہ درباری افسران جو مرحوم نواب کے ہاں اہم عہدوں پر فائز تھے اور عالمزیب خان کے حمایتی تھے ولی عہد نے ان کا بھی قلع قمع کیا جو باقی بچے انھیں نظر بند کر دیا اور کچھ فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔

نوابی کا خطاب 1925ء

خلاف توقع بھائی کی حمایت حاصل کرنے کیلئے شاہجہان نے سیاسی بصیرت اور دور اندیشی کا ثبوت دیا۔ اور چند مراعات کے بدلے انھیں اپنا وفادار بنا دیا۔ چکدرہ قلعہ میں انگریزوں کی ثالثی کے نتیجے میں دونوں بھائیوں کے درمیان 11 اپریل 1925ء کو ایک معاہدہ ہوا جس میں عالمزیب خان کے مطالبات کو اہمیت دی گئی۔ چکدرہ معاہدہ کے بعد ولی عہد نے فوراً ہندوستان کا پہلا دورہ کیا اور نہایت چالاکی سے وائسرائے ہند کو باور کرا کے چھ ماہ کے مختصر عرصہ میں ایک تقریب کے دوران نواب آف دیر کا خطاب حاصل کیا۔

بے ایمان افسروں کو سزائیں

محمد شاہ جہان نے جب سپہ سالار کو راستے سے ہٹا لیا، نوابی کا خطاب حاصل کیا اور ریاست پر گرفت مستحکم کر لی تو اپنے باپ پر ڈھائے گئے مظالم کا بدلہ لینے کی ٹھان لی۔ ان افسران جن میں چھ لوگ خاص طور پر مدعی تھے، چکیاتن پل لے جا کر دریا میں لٹکا دیا گیا۔ یہ دسمبر کا مہینہ تھا، ہزاروں سلطان خیل، پائندہ خیل کو بلایا گیا تھا۔ اس روز دریا کے آر پار برف پڑی تھی لوگ گرم چغے اور چادر پہنے ہوئے بھی سردی سے ٹھٹھر رہے تھے۔ ہزاروں لوگوں کے جم غفیر میں ان افسران کو لمبی رسیوں سے باندھ کر چکیاتن پل کے نیچے گہرے ٹھنڈے پانی میں کچھ دیر کیلئے ڈبو دیا جاتا یہ چیختے چلاتے تو نکال کر دوبارہ ڈبو دیئے جاتے۔

حال ہی میں نواب کے ایک وفادار جمالدار کے منہ سے یہ بات سنی گئی ہے ''یہ سزائیں میں نے ان افسران کو اپنے ہاتھوں سے دی تھیں۔ میں اس زمانے میں ایک نوعمر سپاہی تھا۔ ان میں بعض کی عورتوں کو بھی اس اذیت سے گزارا گیا تا کہ اسے دیکھ کر غدار افسروں پر نفسیاتی خوف طاری ہو اور لوٹا ہوا مال واپس کر دیں''۔

بعض افسران نواب کے تیز جاسوسی نظام کے خدشے کے باعث چپ سادھ کر ان سزاؤں کا حال سینوں میں لئے وفات پا گئے اسلئے ان سزاؤں کے قصے اتنے مشہور نہ ہو سکے۔ چکدرہ کے ایک بزرگ کہتے ہیں کہ ''چالیس سال پہلے میری ان ہی افسران میں سے ایک کیساتھ ملاقات ہوئی تھی اور ان کی انگلیوں پر زخم کے نشانات میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے''۔

سپہ سالار صفدر خان کا قتل

عالمزیب خان اور سپہ سالار صفدر خان کے درمیان جو ملاکنڈ جیل میں تھا، خفیہ رابطے تھے۔ ایک دن انگریزوں سے فرار ہو کر جب وہ زولم (شگوکس) پہنچے۔ بھاری انعام کے لالچ میں کچھ لوگوں نے سپہ سالار کو جندول پہنچنے سے پہلے گرفتار کر کے نواب کے حوالہ کر دیا۔ حبیب الرحمٰن میر منشی لکھتے ہیں کہ'' صفدر خان کو کچھ عرصہ نظر بند رکھنے کے بعد ایک دن عبدالرحیم (سمکوٹ خان) کے ذریعے مسجد کے سامنے چبوترے پر بٹھا کر مار دیا گیا''۔

انتظام سلطنت میں درپیش مسائل

اقتدار میں آتے ہی نواب شاہ جہان نے ایک سال میں جہاں دربار اور ریاست سے اپنے مخالفین کا صفایا کیا وہاں سینکڑوں مخالفین نے جنم لیا۔ ریاست میں قانون سازی اور انتظام چلانے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ان کا بھائی عالمزیب خان تھا جن کے پاس جندول کا اقتدار تھا۔ نواب کو پتہ تھا کہ ان کا بھائی ان کے قوانین سے کبھی اتفاق نہیں کرے گا۔ اسلئے دیر اور جندول کا سارا اقتدار سنبھالنا اور بھائی کو معزول کرنا ان کا مطمح نظر بن گیا۔

نواب شاہ جہان نے اپنے بھائی سے سختی کے بجائے نرمی برتی۔ اس کو معلوم تھا کہ تلوار کے زور پر بھائی کو خاموش رکھنا مشکل ہے۔ دیر اور جندول کے عوام کی حمایت اور فرنگی کے سامنے پوزیشن کی کمزوری آڑے آرہی تھی۔ شاید یہی وجوہات تھیں کہ نواب نے براہ راست ٹکر لینے کی بجائے پیٹ پیچھے وار کرنے کی ٹھانی۔

عالمزیب خان کو کمزور کرنے کے حربے

حبیب الرحمٰن میر منشی لکھتے ہیں کہ" بھائی عالمزیب خان کے حمایتیوں کو کچلنے کیلئے نواب نے اپنے طرفداروں کو مخالفوں پر حملے کیلئے ابھارا۔ نتیجتاً شجادئی سے لیکر تالاش تک کا پورا علاقہ شورش کی زد میں آ گیا اور چند ماہ میں عالمزیب کے حمایتی یا تو نواب کے طرفدار بن گئے یا چپ سادھ لی۔

نواب نے ابتدائی پانچ سال تک اپنے بھائی کے ساتھ محاذ آرائی سے اجتناب کیا اور مختلف حیلوں حربوں سے کمزور کرنے کے درپے رہا۔ ایک حربہ یہ تھا کہ اس نے اپنے چند وفادار عالمزیب خان کے دربار میں شامل کئے تا کہ انھیں گمراہی اور عیاشی کے راہ پر ڈال دیں۔ چالاک نواب کا مقصد یہ تھا کہ ان کا بھائی جندول اور دیر کے عوام میں ہر دلعزیز حکمران نہ بن سکے اور عیش وعشرت اور منشیات کی دنیا میں غرق رہے۔

عالمزیب خان سے براہ راست جنگ

نواب شاہ جہان نے جب انگریزوں سے مضبوط تعلقات استوار کئے تو خزانہ بھر گیا، نئی انتظامیہ تشکیل دے کر قبائلی سردار بھی طرفدار بنائے گئے۔ اب نواب نے بھائی کو جندول کے اقتدار سے ہٹانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ جندول پر حملے کئے گئے۔ براول اور میدان قلعوں میں جنگی سرگرمیاں شروع کر دی گئیں اور ملک بارکنڈ کی کمان میں ساڑھے تین ہزار فوج نواب کے اشارے کا انتظار کرنے لگی۔

ان دنوں اتفاقاً پولو کھیلتے ہوئے عالمزیب خان گھوڑے سے گر گئے۔ سپہ سالار کو بستر پر پا کر نواب نے فوری جندول پر حملہ آور ہونے کا حکم دیا۔ یہ خبر عالمزیب خان کو ملی تو وہ بستر سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ دونوں لشکروں کا بمقام کافرگٹ (جندول میدان پہاڑی) آمنا سامنا ہوا جس کے نتیجے میں خونریز جنگ ہوئی۔ جندولی لشکر غالب آیا اور نواب کو منہ کی کھانی پڑی۔ کافرگٹ پر دیر لشکر کو پسپا کر کے عالمزیب خان جندول میں طور قلعہ پر حملہ آور ہوا جو معاہدہ کی رو سے نواب شاہ جہان کی عملداری میں آتا تھا۔ اس لڑائی میں نواب کی طرف سے اسّی سپاہی کام آئے مگر عالمزیب خان قلعہ سر کرنے میں ناکام رہا۔

عالمزیب خان نے باڑوہ قلعہ کے دفاع پر اپنی توجہ مرکوز کی کیونکہ مخالف لشکر اب قلعہ باڑوہ کی جانب پیش قدمی کر رہا تھا۔ لشکر پہنچتے ہی سید بادشاہ کی کمان میں یہ قلعہ نوابی لشکر نے فتح کر لیا مگر ان کے دوسو تیرہ سپاہی کام آئے۔ لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا مگر ہر محاذ پر عالمزیب خان جندول عوام کی معیت میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنا رہا۔

نواب کی جنگی چال

عالمزیب خان کو زخمی دیکھ کر نواب کیلئے جندول فتح کرنے کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا۔ نواب شاہ جہان نے یہاں جنگی کھیل کھیلنے کا فیصلہ کیا۔ حبیب الرحمٰن میر منشی لکھتے ہیں کہ ''گنوڑئی جان، عبداللہ خان رباط، عبدالجلیل اخونزادہ خال پر مشتمل وفد نے جندول جا کر عالمزیب خان سے کہا ''تم دونوں بھائیوں کی لڑائی کی وجہ سے ریاست کی حیثیت انگریزوں کے سامنے کمزور ہو رہی ہے۔ بہتر یہی ہوگا کہ آپ جنگی سرگرمیاں بند کر کے دو چار دن کیلئے باجوڑ چلے جائیں۔ نواب کو مطمئن کر کے ہم آپ کو واپس بلا لینگے یوں آپ کے بھائی کے دل میں بھی کچھ نہ رہے گا اور آپ کو جندول کے چند قلعے بھی واپس دلا دیئے جائینگے''۔ اس جرگہ کی باتوں میں آ کر انہوں نے باجوڑ کی راہ لی۔

عالمزیب خان کا باجوڑ پہنچنا تھا کہ نواب نے فوری طور پر جندول کا سارا نظام الٹ پلٹ کر دیا۔ تنظیم نو میں باڑوہ قلعہ حضرت سید اخونزادہ، طور قلعہ حیات اللہ خان، منڈا قلعہ طالب جان المعروف دیپور ملک، کوٹکے پایہ خیل بزرگ احمد تحصیلدار اور صدر کلے سید جان، سنگ پارہ اور مسکینی قلعہ صوبیدار شاہ طہماس خان کے حوالے کیا گیا۔

عالمزیب خان اور انگریز سرکار میں اختلاف پیدا کرنا

بڑے بھائی کی یہ حیران کن چال دیکھ کر عالمزیب خان نے حج کا ارادہ کر لیا۔ اتفاقاً امیر امان اللہ خان (حکمران افغانستان) کی بہن بھی اس جہاز میں سفر کر رہی تھی۔ جاسوس نواب کیلئے یہ خبر لائے تو نواب نے دہلی پہنچ کر انگریزوں کے سامنے یہ واویلا کیا کہ مجھ پر افغانستان سے حملہ ہونے والا ہے۔ ان کی یہ سازش کامیاب رہی اور حج سے واپسی پر عالمزیب خان کو انگریزوں نے گرفتار کر کے ایبٹ آباد میں پابند سلاسل کر دیا۔

پانچ ماہ بعد گھڑ سوار دستہ عالمزیب خان کو ایبٹ آباد جیل کی شکار گاہ سے بھگا کر باجوڑ لے آیا۔ خار (باجوڑ) کے نواب محمد جان کی بہن عالمزیب خان کی بیوی تھی۔ عالمزیب خان چونکہ باجوڑ سے ریاست دیر پر حملوں کی منصوبہ بندی کرنے والا تھا۔ تو نواب کو ایک دفعہ پھر فکر لاحق ہوگئی اور اب وہ بھائی کو باجوڑ سے نکالنے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔

باجوڑ میں 1934ء کے لگ بھگ باچا خان اور گاندھی کی کانگریسی تحریک زوروں پر تھی اور عالمزیب خان اکثر ان محفلوں میں دیکھے جاتے تھے۔ دوسری جانب نواب دیر چونکہ تحریک آزادی کو دبانے میں انگریزوں کا وفادار تھا اسلئے نواب نے انگریزوں کو مطمئن کرالیا کہ میرا بھائی نواب خار کے مالی تعاون سے تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا ہے۔ انگریزوں نے ردعمل کے طور پر خار کے نواب پر دباؤ بڑھایا اور ان کو مجبوراً نواب دیر سے ایک معاہدہ کرنا پڑا۔ جس کی رو سے عالمزیب خان کو باجوڑ سے نکل کر اتمان خیل کے علاقوں میں آنا پڑا۔

عالمزیب خان کی آخری شکست

علاقہ اتمان خیل میں مقیم عالمزیب خان کے ساتھ لشکر اور اسلحہ کی کمی تھی۔ نواب خار بھی انگریزوں کے دباؤ کی وجہ سے مدد کا متحمل نہ تھا۔ پھر بھی وہ جنگی سرگرمیوں میں مشغول رہا نواب کے جاسوس پل پل کی خبر دے رہے تھے کہ وہ کس طرف سے حملہ کر رہا ہے اور اس کیساتھ کتنا لشکر اور اسلحہ ہے انہی خفیہ معلومات کی بدولت نواب نے دگنی تیاری کر کے گولڑہ کے محاذ پر اپنے بھائی کو ایک دفعہ پھر شکست سے دوچار کیا۔ کچھ عرصہ بعد عالمزیب خان پر جزام مرض کے حملے میں دانت تک خراب ہو کر گرنے لگے اور اپنے والد اورنگزیب کی طرح بیماری نے اسے اپاہج کرنا شروع کر دیا۔ ہر طرف سے کمزور اور بے بس ہونے کے علاوہ وہ مالی مشکلات کا بھی شکار ہونے لگا شاید اسی وجہ سے تلوار میان میں رکھ کر مردان میں رہائش پذیر ہوا۔

نواب محمد شاہ جہان کا اصل روپ

قریباً پانچ سال تک نواب شاہ جہان اور بھائی عالمزیب خان دیر اور جندول کے مشترکہ حکمران رہے۔ اس زمانے میں ان کے قوانین اتنے سخت اور ظالمانہ، نہ تھے۔ اس عرصے تک وہ

انگریزوں کو اعتماد میں لیتے رہے ۔ بھائی کی بے دخلی کے بعد اب اس کے طرز فکر اور طرز حکومت میں یکسر تبدیلی واقع ہوئی۔ اب وہ ایک ایسا قانون لاگو کرنا چاہتا تھا کہ لوگوں کو یکسر اپنا زر خرید غلام بنالے یا مطیع بنائے رکھے۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ انگریزوں کے سامنے اپنی قوم کو اجڈ ظاہر کرے تا کہ من پسند قانون پر عملدرآمد کرا سکے اور انگریز انسانی حقوق کا نام بھی نہ لے سکیں۔ عیار نواب نے اس غرض سے ایک دلچسپ ڈرامہ رچانے کا فیصلہ کیا۔

ولی عہد محمد شاہ جہان کا دہلی کا دورہ

1929ء میں جندول پر قبضہ جمانے کے بعد شاہ جہان نے فوراً دہلی کا دوسرا دورہ کر کے وائسرائے ہند کو ریاست دیر کے دورے کی دعوت دی۔ وائسرائے ہند نے اس سال اکتوبر میں ملاکنڈ دورہ کیا۔ اپریل 1930ء میں دوسرے دورے کے موقع پر دیر کے ایک خوبصورت سیاحتی مقام کامرانی سر پر شکار کھلانے کے بعد نواب وائسرائے ہند کو دھوم دھام سے تیمر گرہ لے آیا جہاں پہلے سے ہزاروں پائندہ خیل قبائل کو بلایا گیا تھا۔ یہ لوگ بے خبر اپنے سرداروں (مشران) کی پکار پر یہاں آئے ہوئے تھے انہیں کیا معلوم تھا کہ کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔

انگریزوں کے سامنے اپنی قوم کو وحشی ظاہر کرنا

صاحب علی بابا جو تیمر گرہ شاہی باغ میں مالی رہے ہیں کہتے ہیں کہ ''میں خود اس اجتماع میں شریک تھا مجھے اتنا تک یاد ہے کہ اس زمانے میں حیا گی کے میر علی کا کا تیمر گرہ کے تحصیلدار تھے۔ چار فوجی گاڑیوں میں سوار انگریز نواب سے ملاقات کے لئے اندر گئے۔ ملاقات کے بعد جب نکلے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ان کی موٹروں کے سامنے گھاس پڑی ہے، لوگوں کے ہجوم نے گاڑیوں کو گھیرے میں لے رکھا ہے، کچھ کارندے ڈنڈے ہاتھ میں لے کر گاڑیوں کے اردگرد کھڑے ہیں جبکہ بعض ان کے ٹائر دبا رہے ہیں یہ عجیب وغریب نظارہ دیکھ کر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ ہزاروں لوگ سیٹیاں بجا کر خوشی سے اچھل رہے تھے۔ جب نواب سے پوچھا گیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے تو اس نے جواباً کہا میری قوم نے دراصل پہلے کوئی گاڑی دیکھی نہیں ہے۔ یہ سادہ لوح اور نادیدہ قوم ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ گاڑیاں تھک ہار گئی ہیں اور اب انھیں کھانا پیش کیا جا رہا ہے۔

قوم کے ہزاروں لوگوں کو کیا معلوم تھا کہ نواب کے مقاصد کیا ہیں۔ دراصل نواب کے مقاصد یہ تھے۔

۱۔ وہ انگریز کو اپنی قوم سے ڈرانا چاہتا تھا تاکہ وہ ریاست دیر سے نکل جائے اور ان کی رعایا کی غربت، پسماندگی اور طرز زندگی کا انھیں قریب سے دیکھنے کا موقع نہ مل سکے۔

۲۔ تاکہ قوم کو وحشی اور گنوار ظاہر کر کے وہ پرانی ڈگر پر حکومت چلاتا رہے اور قوم پر جتنی بھی سختی کرے انگریز اس پر خاموش رہیں۔

اس ناٹک کے بعد یہ ایک روایت سی بن گئی کہ جب انگریز ریاست میں داخل ہوتے تو نواب اپنے کارندوں کے ذریعے ان کو طرح طرح سے تنگ کرتا اور الزام رعایا کے کھاتے میں ڈالتا۔ یوں فرنگی سامراج کے دلوں میں دیر کے عوام کیلئے کوئی نرم گوشہ نہ رہا اور یہ سلسلہ آخری وقت تک قائم رہا۔

میاں گل عبدالودود اور نواب شاہ جہان حکمرانی کی نیت

میاں گل عبدالودود 1915ء تا 1949ء ریاست سوات اور نواب شاہ جہان 1924ء تا 1960ء تک ریاست دیر کے حکمران رہے۔ دونوں پڑوسی ریاستوں کے حکمرانوں کا نظریہ اور طرز حکومت سراسر مختلف تھا۔ میاں گل عبدالودود نے کیوں فلاحی ریاست قائم کی اور شاہ جہان کیسے ایک تند خو اور مطلق العنان حکمران بنا۔ اس کے کئی وجوہات تھیں۔

نواب شاہ جہان کی طرح آمر (فاشسٹ) بننا میاں گل عبدالودود کیلئے شاید ممکن نہ تھا۔ اقتدار کیلئے سید وبابا کے پوتے میاں گل عبدالودود نے دو تایا زاد بھائی قتل کر کے مذہبی اثر رسوخ کھو دیا تھا۔ 1863ء میں سید وبابا نے معرکہ امبیلا میں انگریزوں کے خلاف جہاد کیا، یوں اس خاندان کے انگریزوں سے تعلقات کشیدہ چلے آرہے تھے۔

میاں گل عبدالودود وسیع النظر بھی تھے سفر حج کے دوران آٹھ ملکوں کا پیدل سفر کر کے شاید انھوں نے ایک مثالی ریاست کا خواب دیکھا تھا اس دور اندیش کو یہ بھی معلوم تھا کہ انگریزوں اور یوسفزئی خوانین کی حمایت ایک فلاحی ریاست کی صورت میں حاصل کی جاسکتی ہے۔

اس کے برعکس نواب شاہ جہان یوسفزئی کو نوابی وراثت میں ملی تھی۔ انھیں انگریز کی جانب سے پچاس ہزار روپیہ سالانہ معاوضہ ملتا تھا۔ وہ سلطان خیل اور پائندہ خیل قبائل کی رفاقت کے گھمنڈ میں

مبتلا تھا۔ براول بانڈئی تک محدود رہتے ہوئے اس کی ذہنی نشوونما محدود رہی تھی۔ خاندان پر ظلم ڈھانے والے بے ایمان افسروں نے بھی اسے تنگ نظر اور انتہا پسند بننے پر مجبور کیا تھا۔

نواب شاہ جہان کو اپنی رعایا اور خوانین کے مزاج کے بارے میں اچھی طرح معلوم تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر وہ نرمی برتے گا تو اس کا بھائی، قبائلی سردار اور سینکڑوں مخالفین اسے اقتدار سے محروم کر دینگے اور اسی طرح اس کے باپ سے غداری کرنے والے بھی سزا سے بچ جائینگے۔ شاید یہی وجوہات تھیں جنہوں نے نواب شاہ جہان کو ایک سخت گیر اور ڈکٹیٹر حکمران بننے پر مجبور کر دیا تھا۔

نواب محمد شاہ جہان اور انگریزوں کی حکمرانی میں مماثلت

نواب محمد شاہ جہان کو مطلق العنان اور خود غرض بنانے میں انگریزوں کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ 1895ء میں محمد شاہ جہان کی ولادت ہوئی اور اسی سال انگریزوں نے دیر اور جندول کو عمرا خان سے چھین کر نواب شاہ جہان کے دادا شریف خان کے حوالے کیا۔ خانہ جنگیوں اور دیر اور سوات کی سرحدی جنگوں کے طفیل دیر کئی میدانوں میں پسماندہ رہا۔ جبکہ انگریزوں نے ان تنازعات کو ختم کرنے کیلئے کوئی مداخلت نہیں کی۔ مسلسل شورشوں کی وجہ سے شاہی گھرانے کے نوجوانوں کی تربیت صحیح خطوط پر نہ ہو سکی جس کا سب سے بڑا نمونہ نواب محمد شاہ جہان تھا۔

فرنگی سامراج کی منفی پالیسیوں کو اپنی قوم کو قابو رکھنے کیلئے استعمال میں لانا شاہ جہان کی ایک اور کامیاب چال تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ نواب موصوف انگریزوں کی طرز حکومت کا گہرا مطالعہ رکھتا تھا اس نے اپنے نظام کو انگریزوں کی چند پالیسیوں سے مربوط کیے رکھا۔ مثلاً جاسوسی نظام میں مولویوں کو شامل کرنا، رعایا کو دانستہ طور پر گنوار رکھنا، حکومت کو طاقتور اور عوام کو کمزور بنانا، قبائلی سرد' کو وظیفہ (برات دینا اور زیادہ ملتی جلتی پالیسی Divide and Rule پر عمل پیرا رہ کر نواب ۔ رصے تک حکومت کی۔

نواب محمد شاہ جہان کا عہد حکمرانی

1924ء تا 1960ء

نواب محمد شاہ جہاں خان

1917، دیر سوات کی آپس میں جنگوں کی خاتمے کیلئے فیرنگی حکومت کیلئے ثالثی میں جرگے کے بعد میاں گل عبدالودود ولی عہد محمد شاہ جہاں مہتر چترال میاں گل شیرین جان

انتظام ریاست

نواب محمد شاہ جہان کے دور میں انتظامی امور کے پیش نظر ریاست دیر کو نو تحصیلوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔
(1) اویزئی (2) تیمر گرہ (3) بلامبٹ (4) میدان (لعل قلعہ) (5) منڈا (6) باڑوہ (حال ثمر باغ) (7) براول (8) دیر (9) تحصیل کوہستان

ریاست کا دارالخلافہ دیر خاص ہوا کرتا تھا۔

انتظامیہ کی تشکیل

اقتدار میں آتے ہی نواب شاہ جہان نے اپنے والد کی ساری انتظامیہ کو برطرف کر کے بالکل نئے سرے سے بھرتیاں شروع کیں۔ اس کا حکم تھا کہ ریاست میں کہیں بھی معمولی نوکر چاکر بھی اس کی اجازت کے بغیر بھرتی نہ کیا جائے۔ بھرتی کے وقت مختصر انٹرویو خود لیتا تھا۔ خاندان کا شجرہ، والد اور دادا کا نام پوچھا جاتا۔ وہ کمال حد تک مردم شناس تھا۔ اس کے اکثر تحصیلدار صوبیدار اور افسروں کو بہت ذہین اور متاثر کن شخصیات پایا گیا۔ جو کہ نواب کے اچھے انتخاب کی مثالیں تھیں۔

سب سے پہلے ایسے لوگوں کو انتظامی عہدے دیئے جو اس کے والد کے وفادار تھے۔ بیشتر اہم عہدے کمزور خاندانوں کو اس غرض سے دیئے تا کہ مطیع رہیں۔ فوج میں نیلی آنکھوں والوں، بن ٹھن کر رہنے والوں اور رشتہ داروں کو عہدوں سے دور رکھا۔ نئی فوج کی بھرتی کیلئے نیزہ بازی میں ماہر کئی بہادر بھی شامل کئے گئے۔

کابینہ

تحصیلدار

تحصیلدار فوجی اور سول سربراہ کی حیثیت سے ریاستی قوانین کو لاگو کرنے کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ تحصیلدار عدالتی امور اور ریاستی آئین سے پوری طرح باخبر ہوتا تھا۔ فیصلوں میں قانون کی پاسداری کا خیال رکھتا تھا۔ تحصیلدار کے ساتھ خواندہ سیکرٹری ''مرزا'' کہلاتا جو سول اور فوجی کیسوں کا ریکارڈ، فوج میں اسلحہ اور کارتوس کی مقدار، حاضریاں، اخراجات کے علاوہ عشر اور جرمانوں کی ہر مد کی مکمل تفصیل رکھتا تھا۔

نواب شاہ جہان دور کے تحصیلدار

تحصیل ادیزئی رضا خان وردگ اور بعد میں فضل غفور ڈوگ درّہ۔ تحصیل تیمر گرہ (نوے قلعہ) حضرت علی کاکا، دلاور جان (گنوڑئی جان)۔ تحصیل بلامبٹ عبداللہ جان، فضل غفور، رضا خان وردگ۔ تحصیل لعل قلعہ بارکند ملک (محمد زمان) بعد میں سید دلاور جان المعروف گنوڑئی جان۔ تحصیل منڈا دپور ملک ترکلانی (طالب جان)، حیاسیرئی کے محمود جان ملک شینواری۔ تحصیل باڑہ حضرت سید اخونزادہ، یار جان، تحصیل براول، شاہ مراد خان سلطان خیل عشیرئی درّہ، آمان اللہ خان کاٹنی۔ تحصیل دیر گل زرین۔ تحصیل کوہستان اکبر سید خان۔

صوبیدار (وزیر) خزانہ آمدن

صوبیدار خزانہ آمدن تالاش کے حبیب الحسن تھے۔ حبیب الحسن کے والد جب الحسن چاڑا نواب کے قریبی افسران میں سے تھے۔ نواب نے حبیب الحسن کے باقی بھائیوں کو بھی بڑے عہدے دیئے جن میں ایک حیاسیرئی کے تحصیلدار شیر حسن اور ایک کارخانہ افسر نور حسن تھا۔

صوبیدار خزانہ خرچی

خزانہ خرچی صوبیدار فاتح جان تھے۔ جو نواب کے تقاضے پر روزانہ دربار میں آمدنی اور اخراجات کی تفصیل پیش کرتے۔ اناج، مہمان خانہ، نواب کے ذاتی استعمال کی چیزوں کے علاوہ ریاست کے اسلحہ کا ریکارڈ بھی ان کے پاس ہوتا تھا۔

قاضی القضاۃ

ان کا اصل نام مفتاح الدین تھا۔ گاؤں جڑ جوڑئی کی مناسبت سے ان کو جڑ جوڑئی مولوی صاحب پکارا جاتا تھا۔ ان کا عہدہ چیف جسٹس کے برابر تھا۔ پیچیدہ مسائل حل کرنے میں وہ نواب کے معاون خاص تھے۔

وزیر خارجہ

درگئی سکول سے چھٹی جماعت پاس فضل غفور سابقہ مشیر مال اور تحصیلدار ''ادین زئی'' ریاست کے خارجہ امور بھی سنبھالتا۔ اس نے وائسرائے ہند سے ملاقات کے علاوہ، وائسرائے ہند اور شاہ ایران

کی بیٹیوں کی شادیوں میں شرکت کی۔ بحیثیت وزیر خارجہ قائداعظم سے دہلی اور کراچی میں دو دفعہ ملاقات کر کے پاکستان اور ریاست دیر کا تاریخی معاہدہ بھی کیا۔

مشیر مال

منجائی کے تور خان صوبیدار مشیر مال (وزیر مالیات) تھے۔ ریاست کے سارے عہدیداروں میں سب سے اعلیٰ تعلیم یافتہ یعنی آٹھویں جماعت پاس تھے۔ کہتے ہیں کہ یہ افسر حساب کتاب میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ نواب کے استفسار پر لمحوں میں حساب کتاب ٹھیک پیش کرنے میں ماہر تھے۔

میر منشی

[1] میر منشی حبیب الرحمٰن نواب کے پرسنل سیکرٹری تھے۔ روزانہ آئے ہوئے عریضے نواب کے سامنے پیش کرنا اور ان کے اوپر احکامات کا اندراج ان کی ذمہ داری تھی۔ فارسی اور اردو کے ماہر تھے اردو اور انگریزی سرکاری دستاویزات کا فارسی میں ترجمہ کیا کرتے۔

سٹیٹ مرزا

نور محمد المعروف ارباب صاحب ساری تحصیلوں کے مرزاؤں کے افسر اعلیٰ تھے۔ نواب کی موجودگی میں فوج کی تقرری، اسلحہ کی تقسیم، تنخواہ کے عوض فوج میں زمینوں کی تقسیم اور برات کی تقسیم وغیرہ ان کی ذمہ داریاں تھیں۔

کونسل

1935ء میں نواب نے ایک کونسل بنا کر گیارہ سالہ ولی عہد محمد شاہ خسرو کو اس کا چیئرمین بنایا۔ یہ کونسل زیادہ عرصہ نہ چل سکی۔ نواب روزانہ دسترخوان پر عمائدین کو بلا کر انگریزوں کی اصلاحات کے متعلق مطالبات سمیت اہم قومی امور میں ان سے مشاورت کرتا۔ محفل میں عمائدین کو ان کے لقب سے مخاطب کر کے ان کی رائے لیتا۔ مثلاً چکدرے خان ته سه وائیے گندیگار میاں سنگ چل او کو اخوانزاده ته پکے غلے نیے . عمائدین کی رائے جان کر بھی نواب ہمیشہ اپنا فیصلہ ٹھونستا۔

---

[1] یاد رہے کہ میر منشی حبیب الرحمٰن دیر کی تاریخی کتاب (ریاست دیر تاریخ کے آئینے میں) کے مصنف بھی ہیں۔

دفاعی نظام

نواب نے تیرہ ہزار فوجیوں کو بھرتی کرنے کے علاوہ چند اہم مقامات پر سینکڑوں گھوڑے بھی پال رکھے تھے جبکہ اسلحہ سازی کیلئے کارخانہ تعمیر کر کے باہر سے کاریگر بھی بلوائے۔ مگر عالمزیب خان کے ساتھ محدود جنگوں کے علاوہ کوئی بڑی جنگ نہیں لڑی گئی۔ اور فوجی زیادہ تر انتظامی امور سنبھالتے رہے۔

دلچسپ بات یہ کے اردلی کی وردی کے علاوہ فوج میں وردی کا مخصوص انتظام نہ تھا۔ فوجیوں کو انگریزی طور طریقوں اور فوجی القابات سے محروم رکھا۔ فوجی پریڈ اور انگریزی سلوٹ پر پابندی تھی۔ اس کے باوجود فوجیوں کی پھرتی اور چستی کمال کی تھی۔

سپہ سالار فوج

عبدالمالک نے سابقہ سپہ سالار صفدر خان کی جگہ دیر فوج کی کمان سنبھالی۔ گرفتاری سے کچھ عرصہ پہلے ولی عہد محمد شاہ خسرو پر باپ کو زہر دینے کا الزام لگایا گیا۔ اس واقعے سے ولی عہد اور باپ میں کشیدگی بڑھی۔ نتیجے میں ولی عہد کے حمایتی افسران سمیت سپہ سالار عبدالمالک بھی عہدے سے ہٹائے گئے کیونکہ ولی عہد نے ان کے گھر میں پرورش پائی تھی۔

فوجی صوبیداری

صوبیدار کی کمان میں سو سپاہی اور دو جمالدار ہوتے تھے۔ جمالدار کے ماتحت پچاس سپاہی اور پانچ حوالدار، جبکہ دس سپاہی حوالدار کے زیر کمان ہوتے تھے۔ صوبیدار اور جمالدار کو ریاستی امور میں عمل دخل حاصل تھا۔ ریاست کے بعض قلعوں کے فوجی سربراہ بھی صوبیدار کہلاتے تھے۔

حضور اردل

اردل حضور (حاضر اور چوکس) دو سو سپاہیوں پر مشتمل تھا۔ نواب کی ذاتی حفاظت کے علاوہ رات کو دارالحکومت کی نگرانی ان کے ذمہ تھی۔ شام ہوتے ہی سو سپاہی محل اور گردونواح میں پوزیشن سنبھالتے جبکہ سو سپاہی بازار پر پہرہ دیتے۔ ان کا لباس خاکی ہوتا۔ روایتی بندوق پتے (یو بندے) ہاتھ میں لئے میگزین سجائے گشت پر معمور رہتے۔ ان کی تنخواہ ششماہی چھتیس روپیہ تھی۔

سپہ سالار فوج عبدالمالک

صوبیدار خزانہ حبیب الحسن

حضرت سید اخونزادہ تحصیل دار

طور خان صوبیدار

عبداللہ جان تحصیل دار

امان اللہ خان تحصیل دار

محمود جان ملک تحصیل دار

تحصیل دار طالب دیپور ملک

فضل غفور تحصیلدار

میر منشی حبیب الرحمن

گل زرین تحصیل دار اپنے بیٹوں، دوست اور پوتے کے ہمراہ

صوبیدار فضل الرحمن اپنے بیٹے اور مسلح سپاہیوں کے ساتھ

تحصیلدار عبداللہ جان اپنے بیٹے عبدالسعید جان اور نواب ملیشیا کے ساتھ

والی سوات اپنے وزراء اور مصاحبین کے ساتھ

اردل لیجار

303 تھری ناٹ تھری (غوگین) لئے یہ سپاہی خطرے کے وقت طلب کئے جاتے۔ان کی ششماہی تنخواہ بیس روپے تھی۔ریاستی قلعوں میں ان کی تعداد ساڑھے تین ہزار کے لگ بھگ تھی۔یہ فوجی چھ ماہ نوکری اور باقی عرصے میں کاشت کاری کرتے تھے۔

گھڑسوار فوج

تین اہم مقامات پر گھوڑوں کے اصطبل تھے۔قلعہ منڈا میں غونڈے صوبیدار، براول باندئی میں برکت جان صوبیدار اور دیر خاص میں علاقہ شمشی خان کے خان عرف سور صوبیدار کے دست کمان میں تین سو گھوڑے ہوا کرتے تھے۔نواب کا ذاتی اصطبل علیحدہ تھا۔

تیارخوارہ، بیگاریان، قومی لشکری

تیارخوارہ (مفت خور) فوج کی تعداد دس ہزار تھی یہ بارہ روپیہ ششماہی تنخواہ لیتے اور بوقت ضرورت طلب کئے جاتے۔نوابی دور میں عوام سے مفت کام لینا بیگار کہلاتا تھا۔قلعوں کی تعمیر، شکاری پرندوں کی ترسیل، جنگلات کی کٹائی وغیرہ ان سے کروائی جاتی۔سلطان خیل اور پائندہ خیل قبائل پر مشتمل ایک بڑا قومی لشکر تھا جس پر نواب کو اپنی فوج سے زیادہ اعتماد تھا۔ان سے خوف زدہ ہونے کے باوجود انھیں ساتھ رکھتا تاکہ اقتدار کو دوام دے سکے۔

نواب شاہ جہان کا انتظام سلطنت

پوری ریاست میں انتظام چلانے کیلئے نواب شاہ جہان نے ایک ایسا نیٹ ورک قائم کیا تھا جس سے وقت بچانے میں مدد ملتی تھی۔ریاست کا حاکم اعلیٰ نواب اور انتظامی افسر اعلیٰ تحصیلدار ہوتا جس کے ماتحت صوبیدار، جمالدار، مرزا اور قاضی امور ریاست سنبھالتے۔

دیہی نظم ونسق کیلئے ہر گاؤں میں ''مَلک'' مقرر ہوتا تھا۔ریاستی قوانین کے نفاذ کے علاوہ گاؤں کے لوگوں کو بیگار کے لئے اکٹھا کرنا، عشر وصولی یا مقدمات کے فیصلے بھی اس ملک کی ذمہ داریوں میں شامل تھے۔ہر گاؤں میں ملک کی بڑی عزت ہوتی گھوڑے پر سوار ملک جہاں سے گزرتا تو لوگ کھڑے

ہوکر کہتے ''پاسہ ھلکہ ملک صاحب راغے''۔ چند ملک پھر ایک خان کے ماتحت ہوتے اور یہی خان تحصیلدار کے سامنے جوابدہ ہوتا۔

ہر قوم پر دو مشران (سردار) مقرر ہوتے جن کیلئے باقاعدہ وظیفہ مقرر تھا۔ نواب کی طرف سے ان کو شاہی دعوتوں میں بلایا جاتا اور تحائف سے نوازنا اس کے علاوہ تھا۔ کسی قوم کو کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو نواب ان مشران کو اپنے پاس بلا کر مسئلہ سلجھاتا۔

انتظامیہ سے رویہ

نواب شاہ جہان نے اپنے باپ کے برعکس انتظامیہ سے رویہ مختلف رکھا۔ بعض ایسے افسران بھی تھے جس کا نواب دل سے احترام کرتا تھا۔ حکمران کا چونکہ ہر حکم مانا جاتا یوں اس کا رویہ شفقت امیز رہتا۔ وہ افسروں کو اپنے استعمال شدہ کوٹ، چادر وغیرہ بھی تحفے میں دیا کرتا۔ معمولی غلطی پر مشتعل ہوجاتا افسران کو غلیظ گالیاں دے کر غصہ نکالتا۔

اس کے برابر بیٹھنا محال تھا۔ شکار کھیلنے جاتا تو تحصیلدار گھوڑے کی لگام پکڑ کر افسران کی معیت میں پیدل چلتا۔ ایسی حرکتیں شاید محکومین کو ذہنی لحاظ سے مفلوج اور غلام رکھنے کیلئے کرتا۔ نواب انتظامیہ کا نظم وضبط قابل دید تھا۔ عہدیدار صبح سویرے اٹھ کر فرائض منصبی سنبھالتا۔ غیر حاضری کا تصور نہ تھا۔ پگڑی کا استعمال عام تھا۔ فرائض کی بجا آوری میں تساہل پر نواب برہم ہوجاتا۔

عہدوں کی مدت

ریاستی ملازمت عمر بھر رہتی، عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے بیٹے کو بھرتی کیا جاتا۔ ملازمت سے استعفیٰ کو بغاوت سمجھا جاتا۔ کئی لوگ چاہنے پر بھی اس سے چھٹکارا حاصل نہ کرسکے۔ میدان کی تاریخی شخصیت محمد امین المعروف بہ گل ملک کہتے ہیں ''میں بیس سال تک نواب کے ہاں جمالدار رہا۔ حکم بجالانے پر اس کا رویہ شفقت بھرا ہوتا۔

جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ ہر مخالف کو میرے ذریعے ہٹانا چاہتا ہے تو میں نے ایک دن نوکری چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ سہ پہر کا وقت تھا استعفے کا سن کر وہ اتنا غصہ ہوا جسے میں بیان نہیں کرسکتا۔ کئی عہدیدار سر جھکائے خاموش کھڑے تھے۔ نواب کے الفاظ یہ تھے'' مجھے اس پر شک تھا کہ اس کے ایمان میں فرق

آ گیا ہے، پھر بڑبڑایا ''اب میں تیرے خون سے ہاتھ رنگونگا''۔ خطرہ بھانپ کر میں نے دارالحکومت سے نکلنے کا فیصلہ کیا اور افغانستان بھاگ گیا۔

گل زرین تحصیلدار کا مجموعی میعاد عہدہ پینتیس سال، سپہ سالار عبدالمالک اڑتیس سال، تحصیلدار منڈا طالب جان ستائیس سال، رضا خان تحصیلدار چونتیس سال اور فضل غفور تحصیلدار کا چھبیس سال رہا۔ نواب شاہ جہان کا طریقہ تھا کہ وہ انتظامی افسروں کی ادھر ادھر ٹرانسفر نہیں کرتا تھا۔ دیکھا جائے تو اسلحہ کارخانہ افسر، سپہ سالار، صوبیداران خزانہ، قاضی القضاء اور کئی تحصیلداروں نے کئی کئی عشروں تک ایک ہی عہدے اور ایک ہی مقام پر انتظامی فرائض انجام دیئے۔

اسلحے کا کارخانہ

1933ء میں محل جل جانے کے بعد نواب شاہ جہان نے اسلحہ کے کارخانے کو از سر نو تعمیر کر کے تین کنال پر محیط اسلحہ گودام بنایا۔ اس کارخانے میں جدید قسم کا ہتھیار بنانے کے لئے خام مال باہر سے درآمد کیا جاتا تھا۔ بیشتر اسلحہ ہاتھوں سے تیار ہوتا تھا۔ کاریگر کابل سے بلائے گئے تھے، تورکا بلے اور کابلے استاذ یہاں اسلحہ انجینئر تھے۔ یہ لوگ ہمہ تن اسلحہ سازی میں مصروف رہتے۔

دیر کے کارخانے میں 12بور، 16بور، 22 بور، 28بور اور 40بور چرہ دار بندوقوں کے علاوہ 303 (غوگین) وبنج ٹکہ (پنز ڈزے) پیتے اور یو بندے (سنگل بیرل) بندوقیں بھی بنائی جاتی تھیں۔ علاوہ ازیں دو من وزنی بندوق دمبالہ پور اور توپ کے علاوہ ائیر گن بھی تیار ہوتی تھیں۔ یہ توپ ڈیڑھ کلومیٹر دور تک گولہ پھینک کر قلعے کے مضبوط برج کو اڑانے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ اسلحہ سازی کے علاوہ توپ کے گولے، کارتوس اور ائیر گن کے گولے بھی اس کارخانہ میں بنائے جاتے تھے۔

یہ کاریگر انگریزی اسلحہ کی ہو بہو نقل میں انتہائی ماہر تھے۔ نواب نے شکار کے لئے لندن سے ڈبل ایجکٹر نامی بندوق درآمد کی۔ بعد میں دیسی کاریگروں نے ہو بہو نقل تیار کر کے سب کو ورطہء حیرت میں ڈال دیا۔ اور نواب بعد میں یہی Made in Dir بندوق استعمال کرتا رہا۔

اسلحہ تیار کر کے گودام میں مقفل کیا جاتا۔ قفل کی تین چابیاں تھیں۔ گل زرین تحصیلدار، کارخانہ افسر نور حسن اور وزیر خزانہ حبیب الحسن تینوں اپنی اپنی چابی لاتے تب گودام کا دیو ہیکل صندوق کھلتا۔ نواب شاہ جہان کی گرفتاری کے بعد اسلحہ اور مشینری حکومت پاکستان نے قبضہ میں لے لی بعد میں نواب محمد شاہ خسرو نے حکومت سے مقدمہ جیتا اور مشینری حاصل کر کے دربار کی ایک پرانی عمارت میں منتقل کر دی۔ [1]

---

[1] دیر محل کی سیر کرتے وقت اسلحہ گودام اور محل کے مرکزی دروازے کے عین سامنے کھڑی توپیں دو توپیں بھی دیکھی جا سکتی ہیں جو مقامی کاریگروں کی صنعت گری کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔

بیرونی نظارہ کارخانے کی بنی ہوئی توپ نمایاں ہے۔

دیر دربار کا مرکزی دروازہ دوسری منظر پر تحصیل دار کا منظر

اسلحہ ڈپو کا صدر دروازہ

نظامِ عدالت

1523ء میں یوسفزئی اقوام اور اتحادیوں نے پشاور تا لواری تمام علاقے قبضہ کئے۔ کابل سے مہاجرین قبائل نے مفتوحہ علاقوں کا ویش (بٹوارہ) کر کے اپنے لئے قوانین بھی بنائے۔ کاٹلنگ کے مقام پر سینکڑوں پختون سرداروں کا اجتماع ہوا اور ایک تاریخی چارٹر پیش کیا گیا جو دفتر[1] کے نام سے موسوم ہوا کتابی صورت میں یہ قانونی تحریر اب ناپید ہے مگر چند دلچسپ قوانین یہ تھے جیسے بے نمازی کا منہ کالا کرنا، چور کو گدھے پر بٹھا کر جوتوں کا ہار پہنانا اور گھر سے بھاگنے والی عورت کا سر منڈوانا وغیرہ۔ 1880ء تک یہ قوانین دیر، سوات اور جندول میں رائج رہے۔ عمرا خان نے اقتدار میں آ کر پہلی بار شریعت نافذ کی جوان کے بعد نواب اوّل خان محمد شریف خان اور نواب دوم اورنگزیب کے دور میں بھی رائج رہی۔

نوب محمد شاہ جہان کی عدلیہ

نواب اورنگزیب کے دور میں عدلیہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگئی تھی۔ شاہ جہان نے اقتدار سنبھالتے ہی عدالتی فیصلوں کا اختیار تحصیلدار کو سونپ دیا جو قاضی کے ذریعے معاملات چلاتا تھا۔ ان فیصلوں کا تحریری ریکارڈ رکھنے کیلئے فارسی سند یافتہ مرزا مقرر تھا۔

عدالت عالیہ (سپریم کورٹ) نواب اور قاضی القضاۃ پر مشتمل تھی۔ قاضی القضاۃ دیوانی اور فوجداری مقدمات کے علاوہ اسلامی فقہ کا ماہر ہوتا۔ جب سائل نواب کو عریضہ پیش کرتا تو نواب حکم جاری کرتا۔ (معاملہ سائل درخواست بروئے شریعت یا بہ رواج وطن فیصلہ کردہ باشت)۔ یعنی درخواست کنندہ کا فیصلہ رواج یا شریعت کے مطابق کردو۔ فیصلہ پہلے نواب کو سنایا جاتا اور پھر نواب کا تصدیق کردہ حکم نامہ جاری کیا جاتا۔

---

[1] دفتر شیخ ملی کی طرف اشارہ ہے حضرت شیخ ملی بابا پختونخوا کے سب سے بڑے ریاضی دان اور چیف جسٹس کے طور پر ابھرتے ہیں)

تعزیراتی قوانین

☆ قتل کا جرمانہ پانچ سو روپیہ افغانی تھا اور قاتل کو مقتول کے ورثاء کی رضامندی سے سزائے موت دی جاتی یا بری کیا جاتا۔

☆ چوری کا جرمانہ پچاس روپیہ تھا جبکہ رنگے ہاتھوں چور کو مارنے والا بری قرار دیا جاتا۔

☆ شادی شدہ عورت اغواء کرنے پر ایک ہزار روپیہ جرمانہ تھا اور دونوں کو واجب القتل قرار دیا جاتا

☆ خاوند قتل ہونے پر بیوہ سیدھی عدالت پہنچتی۔ قاتل کو گرفتار کر کے ایک جمالدار اور پانچ سپاہیوں کے پہرے میں مجرم کو روخان خوڑ (ندی) لے جا کر ایک مخصوص پتھر پر بٹھایا جاتا اور مقتول کی بیوہ خود بندوق لیکر قاتل پر گولی چلاتی۔

☆ جس گاؤں کے حدود میں قتل یا چوری ہوتی تو گاؤں والوں کی ذمہ داری تھی کہ وہ ملزم حکومت کے حوالے کریں، ورنہ گاؤں والوں سے ایک ہزار روپیہ جرمانہ وصول کیا جاتا۔

☆ جرم سے انکار کی صورت میں ملزم دریا میں غسل کر کے قاضی کے سامنے قرآن پر حلف اٹھا کر اپنی بے گناہی کا ثبوت دے کر بری ہو جاتا۔

نواب شاہ جہان کی گرفتاری کے بعد اس کے عدالتی نظام میں کافی ردوبدل کیا گیا۔ یہ قوانین 25 جنوری 1963ء کو دستور العمل کے نام سے کتابی شکل میں محفوظ کئے گئے۔

ا ریاست سوات کا عدالتی نظام دیر کی نسبت اسلئے بہتر تھا کہ دیر میں عورتوں کے حقوق نہ ہونے کے برابر تھے ،اسی طرح شریعت کے نام پر اس عدالتی نظام میں حکومت مخالفین کو دبایا گیا، لوگ جائیداد سے محروم ہوئے حتی کہ بہت سے لوگ یا تو ریاست سے بے دخل کر دیئے گئے یا وہ خود ریاست چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ دوسری جانب سوات کا عدالتی نظام دیر کی بہ نسبت شفاف اور منصفانہ تھا البتہ کچھ کمزوریاں اس میں بھی تھیں۔ جیسا کہ سلطان روم لکھتے ہیں۔ "پیر محمد خان نے اپنے چچا جہروز خان کو قتل کر دیا لیکن والی سوات نے اس سے قصاص نہیں لیا کیونکہ والی مقتول کو پسند نہیں کرتا تھا"۔

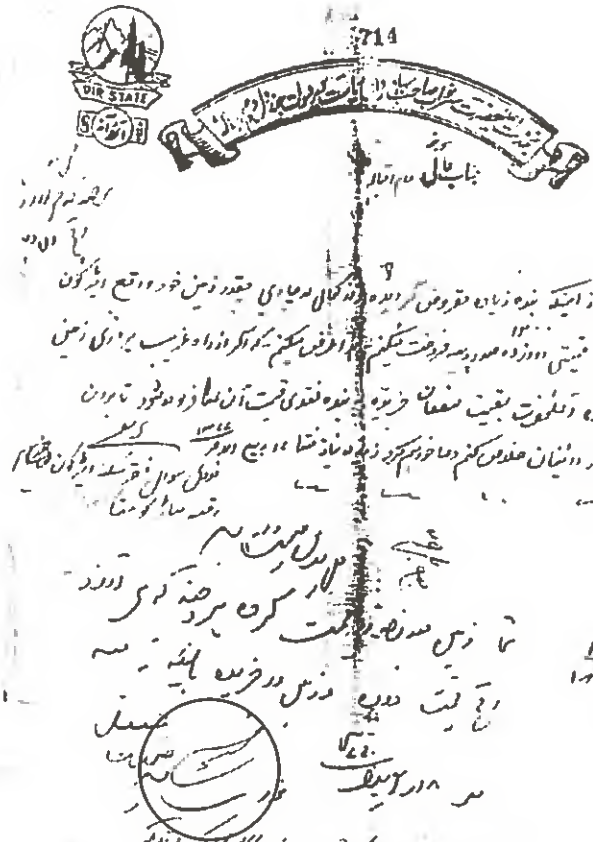

نواب شاہ جہاں کے عہد کے سرکاری عریضے کا ایک عکس

اور

دائرے میں نواب شاہ جہان کا دستخط

نواب کے نظام عدالت کی خوبیاں

☆ ریاستی عدالت میں فریقین کو اختیار دیا جاتا کہ وہ شریعت یا جرگہ میں کسی ایک کا انتخاب کریں پھر مقدمہ کا شریعت یا جرگہ کے ذریعے ایک یا دو دن میں فیصلہ ہو جاتا تھا۔ اگر پھر بھی کوئی پیچیدگی رہ جاتی تو مزید کاروائی کیلئے عدالت عالیہ سے رجوع کیا جاتا۔

☆ ریاست پرامن تھی، چوری ڈاکہ زنی، قتل اور دسرے واردات شاذ و نادر ہی وقوع پذیر ہوتی تھیں بلکہ جرائم نہ ہونے کے برابر تھے۔

☆ اس زمانے ایک ظالم یا جابر تھا باقی کسی کی جرات نہ تھی کہ کسی پر ظلم کرے گویا عدالت کے سخت قوانین نے بااثر لوگوں کو ظلم ستم ڈھانے اور غریبوں کا استحصال کرنے سے روک رکھا تھا۔

نظام قانون پر تنقید

"نواب شاہجہان اپنے آپ کو مطلق العنان تصور کرتا تھا۔ جب کوئی مسئلہ پیش آتا تو بلا خیر و شر اور بلا امتیاز انصاف و بے انصافی اپنی مرضی سے حل کرتا تھا اس کا خیال اور عقیدہ بالکل فرعون جیسا تھا۔"[1]

نواب کا ہر فیصلہ اٹل ہوتا اور اسے چیلنج کرنا ناممکن تھا۔ بلکہ اپیل کو تعویذ کی شکل میں تہہ کر کے بدست خود پھاڑتا اور ردی کی ٹوکری کی نذر کرتا۔ جس سے آمرانہ ذہنیت کا پتہ چلتا ہے۔ شریعت کو بالائے طاق رکھ کر اپنے حمایتیوں کی طرفداری کرتا۔ اس سے شہ پا کر حمایتی جب مخالف فریق کی جائیداد کو ہتھیا لیتے یا اسے نقصان پہنچاتے تو عدالت صرف تماشہ دیکھتی رہ جاتی۔

نواب علاقائی سطح پر امتیاز روا رکھتا۔ سلطان خیل اور پائندہ خیل علاقوں پر دست قانون نرم تھا۔ سرداران اور مشران کو اختیار دیا گیا کہ وہ علاقائی مسائل کا حل خود تلاش کریں۔ دوسری جانب جندول، میدان، سیند تا ادینزئی کے عوام پر نہ صرف قانونی گرفت سخت رکھی بلکہ بھاری جرمانوں سے ان کو مرعوب کئے رکھا۔ اس دوغلے پن سے واضح ہوتا ہے کہ شریعت محض ایک دکھاوا تھا۔

---

[1] داستان دیر صفحہ ۶۱

بنیادی حقوق کی پامالی

نواب نے رعایا کے تمام معاشرتی حقوق سلب کر لئے تھے زندگی کا کوئی بھی شعبہ اس کی مداخلت سے خالی نہ تھا۔ مکان بنانے، لباس پہننے اور الفاظ کی ادائیگی میں اس کی پسند کا خیال رکھا جاتا۔ علم وہنر کے تمام راستے مسدود کر رکھے تھے۔ علاج ومعالجہ اور آزادانہ تجارت وغیرہ سب نواب کی انانیت کی بھینٹ چڑھ گئے تھے۔ جبکہ روگردانی کرنے والوں کو عبرتناک سزائیں دی جاتیں۔

کتوں کو انسانوں سے زیادہ مراعات حاصل تھیں۔ ان کی خاطر مدارت اور پالنے پوسنے کے طریقے انوکھے تھے۔ مثلاً

☆ کتوں کے لئے ہسپتال قائم تھا جبکہ عوام کیلئے ریاست بھر میں کوئی شفاخانہ نہ تھا۔

☆ کتوں کیلئے امپورٹڈ کمپنی کی پرفیوم اور شاہی قالین جیسی سہولیات میسر تھیں۔

☆ کتوں کو ململ کا لباس پہنایا جاتا جبکہ خواتین اور ملک بوسیدہ اور پیوند بھرے کپڑے پہنتے تھے۔

☆ کتوں کو گود میں رکھتا جبکہ رعایا کو خوفزدہ رکھا جاتا۔

☆ کتوں کی گوشت اور دودھ سے تواضع جبکہ رعایا کی قسمت میں ساگ شوربا۔

☆ کتوں کیلئے بجلی کے قمقمے جبکہ عوام مٹی کا دیا جلانے سے قاصر۔

بقول شاعر

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی
گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن

عورت اور عدالت

ریاست میں جہاں چکور کے شکار پر پابندی تھی۔ وہاں غیرت کے نام پر عورت کے قتل کی چھوٹ دی گئی تھی۔ کوئی عورت ماری جاتی تو نواب دلیل پیش کرتا کہ ''کوئی پختون اپنے آپ پر جھوٹا الزام نہیں لگوا سکتا''۔ (یو پختون په زان باندی ددروغو تهمت نه شی لګولے)۔

عورت کی شکایت (رپورٹ) درج کرنا تو درکنار، ریاست سے باہر نکلنے کی صورت میں بلامبٹ تحصیلدار سے اجازت نامہ (ویزہ) لینا پڑتا تھا۔ جسے واپسی پر چکدرہ پھاٹک میں دکھانے کے بعد

داخلے کی اجازت ملتی تھی۔ اللہ بخش یوسفی اور ریاض الحسن کے مطابق نواب کے محل میں سینکڑوں خواتین مقید تھیں۔ شاید عورتوں کو اس بناء پر حقوق سے محروم رکھا گیا تا کہ اس کے کرتوت ہمیشہ راز میں رہے۔[1]

قانون کے رکھوالے

انتظامی افسر قانون سے بالاتر تھے۔ اگر کوئی خان یا ملک تحصیلدار کے خلاف شکایت کرتا تو ازالہ کی بجائے اسے مطعون ہونا پڑتا۔ انتظامیہ کی انتقامی کاروائی کا ہر دم خطرہ رہتا۔ ایک روز میدان کے علاقے کربوڑئی کے ایک کسان نے عشر لانے میں دیر کردی۔ ایک آفسر نے غصے میں آکر اسے لات ماردی جس سے وہ شخص مرگیا۔ یہ دیکھ کر ترکلانی قبیلہ کا جرگہ تحصیلدار کے پاس پہنچا اور مقتول کے قصاص کا مطالبہ کیا لیکن مقتول کے ورثاء کو انصاف نہ مل سکا۔ [2]

---

[1] ریاست سوات میں عورتوں کے حقوق

جو ملا یا قاضی بغیر عدالتی سٹامپ کے نکاح پڑھاتا تو پانچ سو 500 روپیہ جرمانہ لیا جاتا۔ جو ملا یا قاضی والد کی اجازت کے بغیر نابالغ کا نکاح پڑھاتا۔ اس کو ایک سال قید اور پانچ سو 500 روپیہ جرمانہ کیا جاتا۔ خان یا ملک پابند تھے کہ وہ کم سے کم سو 100 روپیہ مہر دینگے اور پچاس 50 روپیہ سامان وغیرہ کیلئے جبکہ غریب پر کم سے کم مہر تیس روپیہ تھا۔ خاوند کو پابند کیا گیا کہ وہ مہر میں دینی والی جائیداد بیوی کی اجازت کے بغیر رہن یا فروخت نہیں کرسکتا ہے۔

اگر ایک بیمار عورت باپ کے گھر میں رہتی تو خاوند اسے خرچہ دینے کا پابند تھا۔ تیسری شادی کرنے والا شخص والی کے سامنے پیش ہوکر وجوہات بتاتا۔ اگر ایک لڑکی بوڑھے شخص کے ساتھ شادی کر کے خوش نہ رہتی تو وہ اپنے آپ کو آزاد کرواسکتی تھی۔

[2] والی سوات کو کسی افسر یا سپاہی کی شکایت پہنچتی تو وہ باقاعدہ اس کا محاسبہ کرتا تھا کوئی سپاہی مقروض ہوتا تو اضافی تنخواہ کاٹ کر قرض خواہاں کو دی جاتی۔ ایک دفعہ والی سوات کی موٹر ایک چوک میں تانگے کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ سپاہی تانگے والے کو ڈانٹنے لگا۔ مگر والی نے اسے منع کیا اور اپنے ڈرائیور کی غلطی تسلیم کرتے ہوئے پانچ روپیہ جرمانہ سپاہی کو ادا کیا۔

رشوت

دیر کی کئی عدالتوں میں انصاف تک رسائی رشوت کے بغیر ممکن نہ تھی۔ انصاف کو کابلی سکوں کے عوض خریدنے کے کئی واقعات مشہور ہیں۔ موثر جاسوسی نظام کی موجودگی میں رشوت کے واقعات کا مطلب خزانے کا حجم بڑھانا ہی ہوسکتا تھا۔

ایک آدمی اوچ قاضی کے پاس شکایت لے کر گیا کہ پڑوسی اس کا ادھار نہیں دے رہا۔ جب اس سے دریافت کیا گیا تو جواب میں ملزم نے قاضی کو دس روپیہ کا نوٹ دکھا کر بتایا۔ ''صاحب میں نے اس شخص کی دی ہوئی رقم واپس کردی ہے''۔ قاضی نے کمال اداکاری سے شکایت کنندہ کے عریضہ کو جھوٹ سے تعبیر کر کے ملزم کو بری کردیا۔ باہر نکلتے ہی ملزم نے مخالف فریق کو رقم واپس کرنے کی یقین دہانی کراتے ہوئے کہا کہ ''یار میں آپ کا قرض مانتا ہوں لیکن مجھے کچھ عرصے تک مہلت دے دو۔'' اس واقعہ سے رائج الوقت عدالتی نظام کی کج روی کا پتہ چلتا ہے۔

عدالتی سزائیں

سزائیں سخت اور ناقابل معافی ہوتی تھیں۔ اعتراف جرم کیلئے ملزم کو سخت اذیت سے گزارا جاتا۔ رباط میں ایک ہندو کی دکان لوٹی گئی تو شبہ میں صحبت نامی شخص کو گرفتار کیا گیا۔ راز اگلوانے کیلئے اسے اتنا پیٹا گیا کہ وہ قریباً اپاہج ہوگیا اور ریاست چھوڑنے پر مجبور ہوا۔

جندول خان (شہاب الدین خان) کی سزائیں نسبتاً زیادہ اذیت ناک ہوتیں۔ باڑوہ قلعہ کی کئی میٹر اونچی دیوار سے ملزم کو کئی گھنٹے لٹکائے رکھا جاتا۔ گوسم کے ایک چور کو لوگوں کی موجودگی میں منڈا قلعہ کے برج سے الٹا لٹکا کر گولیوں سے بھون ڈالا گیا۔[1]

دارمال میں بھٹئی جان نامی شخص بیگار اور عشر جمع کرنے پر مامور تھا۔ سستی کے مرتکب کو درخت کے ساتھ کس کر باندھا جاتا۔ بھٹئی جان چند قدم پیچھے ہٹ کر تیزی سے اس شخص کی طرف لپکتا اور اپنے بھاری بھرکم سر سے اس کے پیٹ کو ٹکر مارتا۔ اس خوف سے لوگ ادائیگی میں پھرتی کا مظاہرہ کرتے تاکہ اس عذاب سے پالا نہ پڑے۔

---

[1] اس عمل کو پختو میں ''چار ماری'' (چاند ماری) کہتے ہیں۔

سپاہیوں کا جبر

ایک تاثر یہ ہے کہ نواب اس قدر جابر نہ تھا لیکن اس کے کارندے اذیت پسند تھے۔ موثر جاسوسی نظام اور کارندوں کا ظلم وستم چہ معنی۔ نواب کو ایسے واقعات کا علم ضرور تھا مگر وہ چاہتا تھا کہ جیسے بھی ہو اس کے سپاہیوں کا رعب جما رہے۔ سپاہیوں پر آنکھیں نکالنا حکومت دشمنی کے مترادف سمجھا جاتا۔ ذیل کے واقعات سپاہیوں کی من مانی کو ظاہر کرتے ہیں۔

نواب کے آدمی موسم سرما میں سینکڑوں مال مویشی لے کر تیمر گرہ جاتے۔ مویشیوں کو کھیتوں میں چھوڑ دیا جاتا جو فصل کا ستیاناس کرتے۔ مگر زمینداروں کو زبان کھولنے کی ہمت نہ تھی۔ صبح چار بجے کے لگ بھگ گاؤں والوں کو حکم دیا جاتا کہ وہ شکار کھیلنے کیلئے پرندوں کے غول کو نواب کی شکارگاہ تک اڑا لائیں۔ تاکہ اسے شکار کھیلنے میں آسانی ہو۔ یہ قرعہ کسی بھی گاؤں کے نام نکل سکتا تھا۔

بھاری جرمانے

انتہائی غربت کے باوجود نواب منہ مانگی رقم جرمانے کی مد میں جبراً وصول کرتا۔ ایک دفعہ کوٹو نامی گاؤں کے مدرسہ کے مدرس فیض اللہ نے اپنی فصل سے نواب کا خچر بھگانے کیلئے پتھر مارا۔ خچر معمولی زخمی ہوا شکایت ملتے ہی ان پر چار سو روپیہ جرمانہ لگایا گیا۔ اس مدرسے کے طالبان چندہ جمع کرنے کی غرض سے گاؤں گاؤں میں جا کر یہ اشعار پڑھتے۔

په کربلا رژوی خزان گلونه   عرش د زانگو په مثال وهی ټالونه

اسی طرح سدو مولوی، بیاری بابا جی، مسافرے بابا اس زمانے کے مشہور علماء تھے۔ نواب کی ملازمت قبول نہ کر کے زیر عتاب آئے اور بھاری جرمانے ادا کئے۔ بیاری بابا جی کے پاس اتنی رقم کہاں تھی آخر کوٹو کے گل حاجی کو بیاری بابا جی کا پانچ سو روپیہ جرمانہ ادا کرنا پڑا۔

جرمانوں کی تفصیل

جرمانوں کی تفصیل

جرم	عہد عمر اخان 1880ء تا 1895ء	عہد شاہ جہان نواب 1924ء تا 1960ء
قتل	500 کابلی روپیہ	500
سر پھوڑنا	20	10
ہاتھ توڑنا	120	60
انگوٹھی توڑنا	80	40
پاؤں	100	50
دانت	100	50
آنکھ اگر بینائی ختم ہو	500	250
کان/زبان کاٹنا	500	250

نظام تعلیم

عمراخان پہلا حکمران تھا جس نے 1880ء میں مذہبی گھرانوں کی موروثی علمی جاگیرداری کو ختم کر کے علم کو عام لوگوں تک پھیلانا شروع کیا اور باقاعدہ مدرسے بنا کر فارسی نظام تعلیم کا آغاز کیا ۔عمراخان کا دھڑن تختہ ہوتے ہی دیر میں علم کی شمع بجھنے لگی۔نواب اول اور دوم نے بغاوتوں میں مشغول رہ کر علم وقلم کی بجائے تلوار کا سہارا لیا اور یوں عمراخان کے دور کے سرکاری مدرسے اپنی مدد آپ کے تحت چلتے رہے۔

نواب اورنگزیب کا اسلامیہ کالج کیلئے چندہ

دیر کی تاریخ کو دبیز پردوں سے نکالنے میں کئی اہم انکشافات ہوئے۔2002ء میں اسلامیہ کالج کے لائبریرین عبدالحمید صاحب کے توسط سے پروفیسر ڈاکٹر شکیل کی اسلامیہ کالج کی تاریخ پر کتاب کا پتہ چلا۔ [1] جس کا مفہوم کچھ یوں ہے۔

10 مئی 1911ء کو صوبہ سرحد کے کمشنر جارج روز کیپل نے اسلامیہ کالج کیلئے چندہ جمع کرنے کی خاطر صوبے سے سو بڑے خوانین کا اجلاس بلایا اور ان کی معاونت طلب کی ۔صوبے کے امراء اور جاگیرداروں نے کمشنر کی جھولی میں کل ساڑھے پانچ لاکھ کا چندہ ڈالا جس میں ایک لاکھ پندرہ ہزار نقدی کے علاوہ چار سو درخت نواب دیر اورنگزیب کی طرف سے عطیہ کئے گئے ۔میاں رحیم شاہ کاکاخیل نے ایک لاکھ اور کریم بخش سیٹھی نے پچاس ہزار نقدی پیش کی۔گویا نواب دیر کا چندہ نقدی اور ٹمبر کو ملا کر مجموعی چندے کا 1/4 حصہ بنتا ہے۔

نواب کی اس دریا دلی سے عوام بے خبر رہے ۔دوسری طرف اسلامیہ کالج انتظامیہ کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو، کہ کمشنر روز کیپل کے نام پر ہال، رحیم شاہ کے نام پر رحیم شاہ وارڈ (آر ایس وارڈ ہاسٹل) اور ترنگزئی حاجی صاحب کی خدمات کے صلے میں ایک ہاسٹل اور ایک سڑک ان کے نام پر قائم کی گئی۔لیکن نواب دیر کی خدمات کا کوئی اعتراف نہیں کیا گیا۔

اسلامیہ کالج کی انتظامیہ کو چاہیے کہ وہ آئندہ اسلامیہ کالج میں بننے والی عمارت کو نواب اورنگزیب کے نام

---

[1] صفحہ ۲۸۸

سے منسوب کرے۔اور متوقع منصوبے کے تحت مستقبل میں چارسدہ اور صوابی میں اسلامیہ کالج کی شاخیں کھولنے کی طرح دیر میں بھی نواب کی خدمات کے صلے میں اسلامیہ کالج کی شاخ کھولے۔

اپنے لوگوں کو جہالت کی چکی میں پیسا۔جبکہ تقریباً ڈھائی سوکلومیٹر دور بننے والے ایک تعلیمی ادارے کیلئے اتنا بھاری چندہ چہ معنی دارد۔اُس سال نواب اورنگزیب کو چھوٹے بھائی میاں گل جان نے اقتدار سے بے دخل کر کے نہاگدرہ میں پناہ لینے پر مجبور کیا تھا ہوسکتا ہے بھائی کے خلاف انگریزوں کی ہمدردی حاصل کرنے کیلئے نواب نے ایسا قدم اٹھایا ہو۔

نوابی دور کی تعلیم

نواب شاہ جہان نے اقتدار میں آ کر جدید تعلیم پر سخت پابندی لگائی۔موقف یہ تھا کہ فرنگی علوم ہمارے جوانوں کے اخلاق بگاڑتے ہیں۔اس زمانے میں فرنگی سے نفرت عام تھی لہذا کئی علماء نے نواب کا انگریزی تعلیم کی مخالفت میں ساتھ دیا۔البتہ دکھاوے کی خاطر عمراخانی دور کے طرز تعلیم کو جاری رکھا گیا۔1960ء تک اس نظام تعلیم نے کوئی ترقی نہ کی۔سیلیبس کئی دہائیوں تک شیخ سعدی کی ''گلستان اور بوستان'' تک محدود رہا۔[1] محمد اسلام اجملی لکھتے ہیں ''**نواب شاه جهان د زمانے د تقاضو هیشح خیال نه ساتلو او د اولس د باره تعلیمي او معاشرتي سهولتونو ورکولو ته تیار نه وو**''۔

1۔ نوے دیر صفحہ ۵۱

2۔ سید عبدالغفور قاسمی (سوانح عمری میاں گل عبدالودود بانی ریاست سوات)

حکمران سوات میاں گل عبدالودود اپنی سوانح عمری بیان کر کے کہتے ہیں کہ''1915ء میں پورے سوات میں مجھے ریاستی معاملات چلانے کیلئے فارسی خواندہ یعنی تعلیم یافتہ نہیں مل رہا تھا۔مجبوراً میں نے ذاتی نوکر حضرت علی کو تھانہ بھیجا جہاں سولہ ماہ میں تعلیم حاصل کر کے وہ میرا پرسنل سیکریٹری بنا''۔1926ء میں ریاست سوات میں پہلا سکول کھولا گیا۔1927ء میں بارہ پرائمری سکولوں کے بعد پہلا مڈل سکول کھولا گیا۔1940ء میں سوات میں انتالیس سکولوں پرائمری اور مڈل سکولوں کے علاوہ پہلا ہائی سکول قائم ہوا۔اس کے بعد جانشین عبدالحق نے 1952ء میں مینگورہ میں جہانزیب کالج قائم کیا۔پندرہ روپیہ ماہوار پر طالب علموں کو ہاسٹلوں میں کھانے اور رہائش کی سہولت میسر تھی۔جبکہ کپڑے کتابیں حتیٰ کہ گھی کے ڈبے مفت دیئے جاتے تھے۔

نواب شاہ جہان دیر میں مدرسہ تعمیر کیا نہ ہی مدرسین کیلئے خزانے سے تنخواہ کا اہتمام کیا بلکہ طالبان اناج کے عوض فارسی علوم حاصل کرتے رہے۔ عام لوگوں کی دینی دسترس نماز اور قل ھوتک محدود تھی۔ عورت تمام علوم سے محروم رکھی گئی۔ خوش قسمت گاؤں وہ ہوتا جہاں کوئی بوڑھی عورت ناظرہ خوانی تک قران پڑھتی اور پڑھاتی۔

رعایا کو جدید علوم سے بے بہرہ رکھا گیا مگر مذہبی علوم بھی حقیقی روح سے خالی تھے۔ یعنی مدرسہ نظام تعلیم سے جو طلباء فارغ ہوتے وہ فارسی زبان پر عبور پا کر نواب انتظامیہ کا حصہ بن کر ریاستی امور سرانجام دیتے اور اس قابل نہ تھے کہ قران وسنت کی روشنی میں انصاف کا مطالبہ کر سکیں۔

علمی فروغ کیلئے کوششیں

1930ء میں کانگرس کا بیج بونے خان عبدالغفار خان (المعروف بہ باچا خان) اخونزادہ محمد جان کی دعوت پر خال آئے اخونزادگان نے انھیں ریاست میں علمی فقدان سے آگاہ کیا۔ باچا خان کے ہاتھوں ایک سکول کی داغ بیل ڈالی گئی۔ مگر کچھ عرصہ بعد نواب کے کارندوں نے اسے آگ کی نذر کر کے علم کی یہ شمع بجھادی۔

جندول خان اسی باپ کا بیٹا تھا مگر تعلیم کے بارے میں اس کا رویہ اتنا سخت نہ تھا۔ جندول خان کی اجازت سے بادین استاد، کمنگرہ جان اور مانڑوگی استاد نے میاں کلی میں ایک سکول کھولا اور بچوں کیلئے سرکاری بس میں مفت سفر کی ہدایت کی۔ خبر پا کر نواب نے یہ مدرسہ مسمار کر دیا اور مدرسہ کے ان بانیوں جن میں جندول خان کے استاد بھی شامل تھے، کو سزائیں دیں۔

شہزادوں کی تعلیم

رعایا کیلئے جدید تعلیم کو اخلاقی زبوں حالی کا سبب سمجھنے والے نواب نے ولی عہد محمد شاہ خسرو کو ہندوستان کے ایک عیسائی ادارے بشپ نامی سکول میں داخل کروایا۔ جہاں انگریزوں کے علاوہ راجوں اور مہاراجوں کے بچے زیر تعلیم تھے۔ گھر پر بچوں کی تعلیم کیلئے بادین استاد موضع جندول ایف اے (شملہ) گل زمان خان موضع رباط ایف اے اسلامیہ کالج، محمد زمان ایف اے اسلامیہ کالج پشاور کی خدمات حاصل کی گئیں۔

خدایار عرف جنگو میاں موضع اسبنڑ نے 1934ء میں صوابی سے میٹرک کرنے کے بعد دہلی ائیر فورس میں ملازمت اختیار کی۔لیکن نواب کے کہنے پر استعفیٰ دے کر لوٹ آیا اور شہزادوں کو پڑھانے لگا''۔علاوہ اذیں خواص (وزیر،مشیر) کے بچے بھی باہر پڑھتے رہے۔نواب نے اس پر چشم پوشی اختیار کی۔اس زمانے کے تعلیم یافتہ آج اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔

طلباء کے مسائل

حاجی آباد کے انور استاد (مرحوم) کہتے تھے کہ ملاکنڈ کے گاؤں تھانہ میں پڑھنے کے دوران گھر سے روزمرہ استعمال کیلئے اناج بھیجا جاتا تو چکدرہ میں سپاہی ضبط کرتے۔نواب کے عزیز اخون خیل، امیر نواب خان کہتے ہیں کہ ریاستی دور میں انھیں پاک فوج میں پچیس روپیہ ماہانہ تنخواہ پر ملازمت کی پیشکش ہوئی لیکن ریاست نے انہیں اخلاقی سند (Character certificate) سے محروم رکھا ۔تاکہ ریاست کی فوج کی قلیل تنخواہوں کی قلعی نہ کھل جائے۔ڈاکٹر شعیب موضع بیبوڑ حال تیمر گرہ کہتے ہیں''1958ء میں ان کے دو تعلیمی سال اس وجہ سے ضائع ہوئے کہ انھیں ریاست سے ڈومیسائل نہیں مل رہا تھا۔

1961ء میں دیر کی تعلیمی شرح

اشرف درانی لکھتے ہیں[1] کہ 1961ء میں دیر کی آبادی 3,85183 نفوس پر مشتمل تھی۔ جن میں دو گریجویٹ،انیس ایف اے بمشول ایک زنانہ، چار سو گیارہ میٹرک بشمول تین زنانہ اور آٹھ سو اٹھاون مڈل پاس جس میں انتیس طالبات شامل تھیں۔یاد رہے اوچ کے اکرم خان 1922ء میں دیر سے اسلامیہ کالج کے پہلے گریجویٹ تھے۔

1998ء میں دیر کی تعلیمی شرح

دیر پائین شرح خواندگی 29.90 فیصد جس میں مردانہ 48.76 فیصد اور زنانہ 12.25 فیصد۔

دیر بالا شرح خواندگی (21.02 فیصد)۔مردانہ 36.02 فیصد اور زنانہ 6.01 فیصد۔

---

[1] ''دیر دا جوڑ'' صفحہ ۳۲

شعروادب

ریاست میں اگر چہ علمی سرگرمیوں اور صحافت پر پابندی تھی ۔شاعری کا جذبہ پھر بھی یہاں موجود تھا۔مولانا فضل محمود مخفی جن کی جائے پیدائش پڑانگ چارسدہ ہےاور مئی 1947ء میں وفات پا کر دیر میں بمقام مانڑوگی دفن ہوئے ،جدید پشتو نظم کے بانی تصور کئے جاتے ہیں تاہم بدقسمتی سے ان کی شاعری کا مسودہ ابھی تک نایاب ہے۔ خدائی خدمت گار تحریک کے سرگرم کارکن اور مرتے دم تک باچاخان کے دیرینہ رفیق رہے۔

ریاستی دور میں ظلم وستم کے خلاف جراتمندانہ شاعری زین العابدین المعروف بہ بٹئی جان نے کی جومسلم لیگ کی ریاست میں آمد پراس کے رکن بنے۔سیاسی اختلاف پرانہیں ریاست بدر کردیا گیا ۔ملک بدری کا واویلا کچھ یوں کرتے ہیں۔

اے د سرحد سانگی زه جرگه تاله راغلے یم   زه دغه شخصی نظام د دیر نه راشڑلے یم

نوابی دور میں زندگی کے دل کش نغمے تخلیق کئے گئے پر گیت لکھنے والے نظر اور سماعت سے اوجھل رہے ۔پھر بھی گویّوں اور ادبی ذوق رکھنے والے لوگوں کی وجہ سے یہ اشعار محفوظ رہے۔چند نمونے۔۔

او چینارو نوله ی وڑینه   سباسیل په دامان دے توره اوربله

اوشجادنی له کڈی وڑینه   زاڑی دبارون جینکی بارون ی وران کڑو

1953ء میں ایک بوڑھا کسان دریا میں بہتی ہوئی لکڑیاں پکڑتے ہوئے دریائے پنجکوڑہ کی لہروں کی نذر ہوگیا۔نواسیاں غم کو یوں بیان کرتی ہیں۔

مہ زہ بابا مہ زہ اوسیندری وڑینہ، دبابا کاڑغنم پاختہ شو، پہ یوڈڈہ کا گاشو۔مہ زہ بابا مہ زہ اوسیندری وڑینہ

1950ء میں ممتاز انقلابی شاعر اجمل خٹک دیر آئے ۔واپس جاتے ہوئے ایک جگہ دریا کے کنارے لو کے عالم میں ایک بھینس چرانے والے گجر کی حالت زار کو دیکھا تو مندرجہ ذیل اشعار کہے۔

میخے منم چه د نواب صاحب دی .دیے کی خبره کول توان د چادیے

ولے اے اے د انسانانو ربه ادغه غریب گجر انسان د چادیے

د نواب میخه دی نوابه گرزی .د خدائے انسان دی خدمتگار وی ورته

هغه پڑ سیگی دی د ده په وازدو .دے دی خدمت کی خوار و زار وی ورته

دده دخوار بدنه ټوله وینه .دے میخو اوچه کڑه سحر اور ماخام

دهغو ڈک غولند او ڈک تیونه .دده په شونڈو تر یو ساسکے حرام

میخے منم چه د نواب صاحب دی .دے کی خبره کول توان د چادے

ولے اے اے د انسانانو ربه !دغه غریب گجر انسان د چادے

''نوے دیر'' کے محقق اور ملاکنڈ کے ممتاز شاعر محمد اسلام اجملی دیر کے بارے میں کچھ یوں لکھتے ہیں۔

خکلی دیرته

اے د زمرو وطنه ،ستانه نثار شمه زه — ستا فولادی غرونه ،قربان او زار شمه زه

ته پخته مز که ئے ،دمسلمان ئی خاوره — دپاک وطن ټکڑه ئی ،تل ستا پکار شمه زه

اے د زمرو وطنه خکلو زلمو وطنه — چه په اسلام نازیگی ،هغو بشرو وطنه

کشمیر په تادے گواه ستا دمردئی نه خبر — اے دغازیانو خاورے خکلو غنچو ګلشنه

خکلی دیرته

خکلی زما دیرا غم که لرے د زهیره — راکه لاس دمینے د سوی عاشق پیره

یم لوګے په مینه سپیلنے ستا ددے خاورے — زه که دی پتنګ نم ،ته م شمع بے نظیره

اے دپاکستان خکلی ټوئے دویمه کشمیره — خکلی زما دیرا ،غم که لرے د زهیره

ذرائع آمدورفت

ریاست کی قدیم شاہراہ

ماہرین آثار قدیمہ کے مطابق راجہ اشوک کے دور میں پہلی مرتبہ دیر اور سوات میں سڑک بچھائی گئی جو پیدل قافلوں اور بیل گاڑیوں کے زیر استعمال تھی۔ 1895ء میں اس سڑک کو انگریزوں نے وسعت دی۔ ہر چھ ماہ بعد فرنگی فوجی خچروں پر اسلحہ اور فوجی ساز وسامان لاد کر اس سڑک سے ہو کر گلگت تک آتے جاتے تھے۔ نواب اورنگزیب کے عہد میں 1922ء کے لگ بھگ رباط تک سڑک پہنچ گئی تھی لیکن ان کی اپنی گاڑی نہ ہونے کی وجہ سے وہ پشاور سے چکدرہ گاڑی منگوا کر دہلی جایا کرتے تھے۔

نواب شاہ جہان کا عہد

1925ء میں نواب شاہ جہان نے مفت کارندے (بیگاریان) لگا کر سڑک کی توسیع کا آغاز کیا اور بالآخر 1927ء کا وہ دن آیا جب میاں بانڈہ (تیمر گرہ) کے استاد فضل الٰہی نے برطانوی گاڑی تیمر گرہ سے دیر خاص تک پہنچائی۔ اس افتتاحی سفر کا تماشہ دیکھنے کیلئے ہزاروں لوگ جمع تھے۔

ریاست کی واحد جرنیلی سڑک درسک تا دیر خاص اور تیمر گرہ سے باڑوہ (ثمر باغ) تک موجود تھی یعنی باقی علاقوں میں باقاعدہ سڑک کی سہولت نہیں تھی۔ چکدرہ تا دیر خاص سڑک بے حد تنگ تھی۔ کراس کرتے وقت ایک گاڑی کو سڑک سے اتار کر دوسری کو گزرنے دیا جاتا تھا۔ موسم برسات میں برساتی نالوں میں سیلاب آنے کی وجہ سے بس کئی گھنٹے دیر سے منزل مقصود پر پہنچتی کیونکہ شاہراہ پر کوئی پل یا کلوٹ نہ تھا۔

انگریز فوج کیلئے سفر میں مشکلات پیدا کرنا

نوشہرہ تا گلگت براستہ چترال انگریز ریاست دیر کو ایک روٹ کے طور پر استعمال کرتے۔ ان کا دیرینہ مطالبہ تھا کہ سڑکوں کی حالت کو بہتر بنایا جائے مگر نواب نے ہر ممکن کوشش کی کہ ریاست سے ان کے گزر کو مشکل بنایا جائے۔ اس کے خیال میں اگر انگریزوں کو آرام اور امن سے سفر کا موقع دیا جاتا تو وہ اگلی بار سڑک کی کشادگی کا اور پھر تارکول لگانے کا مطالبہ کرتے۔

ایک پاکستانی سیاح محمد افضل خان لکھتے ہیں [1] ۔''نواب نے گیارہ سال تک انگریز فوج کو سڑک کے حوالے سے مخمصے میں رکھا۔ 1936ء میں پہلی دفعہ انگریز فوج نے گاڑیوں میں سفر کیا مگر نواب کے من گھڑت اندیشوں کی وجہ سے بمبار طیاروں کی حفاظت میں وہ دیر سے ہوکر چترال گئے ۔دوسال بعد بھی بمبار جہازوں کی پروازوں کے سائے میں انگریز فوج نے لواری کو پار کیا۔بالآخر کثیر اخراجات کے پیش نظر انگریزوں نے پیدل سفر پر اکتفا کیا''۔

ڈاک بس سروس

ریاست میں باقاعدہ بس سروس کا آغاز 1932ء کے لگ بھگ ہوا۔حکمران نے بسیں خرید کر ٹرانسپورٹ کاروبار پر قبضہ جمایا۔ماندار یف (محمد عارف) جمالدار، فضل کریم، رحمت خان اور امین ماما کی بسیں تھیں مگر انھیں ریاست میں ٹرانسپورٹ کے کاروبار سے باز رکھا گیا جو ریاست کے باہر کاروبار کرنے پر مجبور ہوئے۔

پرانے ماڈل کی یہ خستہ حال بسیں ڈاک تقسیم کرنے کی وجہ سے ڈاک کے نام سے مشہور ہوئیں ۔ایک بس باڑوہ سے ورسک آکر شام کو واپس جاتی۔جبکہ قومی شاہراہ پر صبح سویرے دو بسیں مخالف سمت سے سفر شروع کرتیں۔دوپہر کو رباط کے آس پاس کراس کر کے غروب آفتاب کے بعد اپنی منزل پر پہنچتیں ۔یعنی دونوں بسیں سالہا سال پورے دن میں ایک طرف کا سفر کر پاتیں۔

بس کے فرش پر متوسط اور تختوں (نشست) پر وی آئی پی سواریاں بیٹھتیں۔چھت یعنی گیلری پر دونوں جانب سواریاں پاؤں لٹکائے بیٹھا کرتیں۔جب یہ جگہیں بھر جاتیں تو لوگ دونوں جانب جنگلا پکڑتے اور لٹک کر سفر کرتے۔رش کی وجہ سے ان بسوں میں عورتوں کیلئے سفر انتہائی دشوار تھا۔سواریوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی بس موڑ کاٹتی تو خطرناک حد تک جھول جاتی اور لوگ ایک دوسرے پر گرنے لگتے ۔چڑھائی میں سواریاں اتار کر بڑا پتھر اٹھائے کنڈکٹر پیچھے دوڑتا اور اللہ اللہ کر کے بس چڑھائی چڑھ جاتی۔

---

[1] ''چترال اور کافرستان'' صفحہ ۱۷

کچھوے کی چال

ریاست بھر کی سواریاں منزل مقصود پر پہنچنے کیلئے ڈاک بس کی منتظر رہتیں۔ کابلی سکے تھامے یہ لوگ گھنٹوں آس لگائے بیٹھے رہتے۔ غرغر کی آواز سن کر یہ لوگ سامان تھام کر اچھلتے اور سوار ہونے کی تگ ودو میں لگ جاتے۔ کھیت میں کام کرنے والا سفر کی خواہش ظاہر کرتا تو سارے کام نمٹا کر آتا اور اسی اثناء میں لوگ بس میں بیٹھے انتظار کی آزمائش سے گزرتے۔ بس دارالحکومت تک کا سفر تقریباً آٹھ گھنٹے اور پیدل آدمی یہی فاصلہ نو یا دس گھنٹے میں طے کرتا۔

طرفہ تماشہ یہ کہ گرمی کے دنوں میں شیڑ استاذ (معنی ہیں اجڈ اور گنوار) دوران سفر تالاش میں گاڑی رکوا کر گھر میں سو جاتا اور بیچاری سواریاں رستہ تکتیں۔ مگر وہ ستانے کے بعد دوبارہ سفر شروع کرتا۔ تیمر گرہ، رباط اور واڑی میں سے کسی مقام پر کھانے کیلئے گاڑی روک دی جاتی تھی۔ گاڑی کو کچی اور ناہموار سڑک پر چلا کر منزل مقصود تک پہنچانا کسی معجزے سے کم نہ تھا۔ مارے تھکاوٹ کے وہ بڑبڑاتا کئی نوکر چاپی کرتے اور وہ تیوریاں چڑھائے کسی سے بات نہ کرتا۔

پیسے بچانے کی خاطر بیشتر لوگ سامان کاندھے پر اٹھائے، شانے پر کلہاڑی یا بندوق سجائے قافلوں کی شکل میں سفر کرتے۔ تالاش کا ایک دکاندار کہتا ہے ''میری تیمر گرہ میں دکان تھی میں روزانہ بس کا انتظار کیئے بغیر پندرہ میل پیدل سفر کر کے تیمر گرہ جاتا اور سہ پہر کو دکان بند کر کے گھر لوٹتا''۔

شدید بارش میں بھی ڈرائیور بس کو دیر پہنچا کر ہی دم لیتا۔ چھت پر بیٹھے لوگ بھیگ جاتے تو انھیں اتار کر فرش پر بٹھایا جاتا اور فرش والوں کو اوپر چڑھایا جاتا۔ کنڈکٹر اس زمانے کا نامی گرامی ملک یا خان ہوتا۔ ڈرائیور اور کنڈکٹر کا ریاست میں بڑا نام تھا۔ رات کو جب کسان گاؤں کے حجرے میں جمع ہوتے تو وہ ڈرائیور اور کنڈکٹر کے باتیں سناتے۔ ایک قصہ بہت مشہور ہے۔

''گرمی کے دن تھے اور رمضان کا مہینہ۔ بس سواریوں کو لئے کامرانی پہاڑی سے تیمر گرہ کی جانب چڑھائی پر چڑھ رہی تھی۔ ایک بچہ رونے لگا شیڑ استاذ کو بتایا گیا کہ بچہ پیاسا ہے۔ اس نے کچھ آگے جا کر بس روک لی اور بچے کو قریب ہی واقع چشمہ پر لے گیا۔ واپس آیا تو ماں نے بچے سے پانی کے متعلق پوچھا۔ بچہ بولا مورے (ماں) میں نے پانی پی لیا اور ماما (ماموں) نے بھی۔ یہ سنتے ہی زور کا ایک قہقہہ

بلند ہوااور شیرزا استاذ نے سی ان سی کر کے بس آگے بڑھادی۔

بیرونی گاڑیوں اور سیاحوں پر پابندی

1960ء تک ریاست دیر مواصلاتی رابطوں کے لحاظ سے آس پاس کی ریاستوں سے کٹی رہی۔ سوات اور دیر کے مواصلاتی رابطے نہ ہونے کے برابر تھے جبکہ 1960ء تک ریاست دیر اور باجوڑ بھی ایک دوسرے سے بذریعہ سڑک منسلک نہ تھے۔ لواری پاس پر برفباری اور سڑک کی مخدوش حالت کی وجہ سے سال میں چند دن ہی زمینی رابطہ ممکن تھا۔

دیر میں سرکاری بسوں اور نواب کی ذاتی موٹروں کے علاوہ بیرونی گاڑیوں کا آزادانہ داخلہ ممنوع تھا حتی کہ انگریز بھی ریاست میں داخلے کی پیشگی اطلاع دیتے۔ جبکہ ریاست سوات کی سڑکوں پر ٹریفک رواں دواں رہتی۔ نوابی چھن جانے کے بعد لاہور میں نواب نے کہا

"د ریاست دیر مثال د یوے ناوے د شال پہ شان وو ما دا پہ غوز کیے ساتلے وو"۔ ریاست کی مثال ایک دلہن کی شال کی سی تھی جسے میں نے اخروٹ کی چھال میں چھپائے رکھا۔

کوئی اجنبی آتا تو چکدرہ پھاٹک پر ملیشہ والے پوچھ گچھ کئے بغیر جانے نہ دیتے۔ سوات سے مخاصمت اس قدر تھی کہ سوات کا کوئی مہمان آتا تو کسی کو اسے گھر میں ٹھہرانے کی جرات نہ ہوتی۔ جندول خان اس قدر سختی روا رکھتے کہ کوئی پردیسی ڈرائیور ریاست کے کسی شخص کی میت لیکر بھی آتا تو دلئے کنڈاؤ پر رکوا کر جندول خان کی اجازت طلب کی جاتی۔

ریاست سوات میں 1930 میں بادشاہ صاحب نے سیر و سیاحت پر توجہ دی۔ بحرین، کالام، مدین اور مرغزار کے سیاحتی مقامات کے نام تبدیل کئے گئے، ہوٹلوں کے فروغ کیلئے قرضے جاری کئے گئے، شجرکاری کو فروغ دیا گیا، 49 ریسٹ ہاؤس تعمیر کئے گئے جن میں مرغزار کا سپین محل (سفید محل) فن تعمیر کا ایک خوبصورت نمونہ ہے۔ والی کے جنم دن 5 جون اور یوم رسم تاجپوشی 12 دسمبر کے موقع پر ایک جشن ہوتا، پریڈ ہوتی اور میلہ لگتا۔ جس میں سرحد اور پنجاب کے سیاح شرکت کرتے تھے۔

1940ء میں برف باری لواری ٹاپ کی سڑک نا قابل استعمال ہونے کی وجہ سے مہتر چترال کی جیپ کو 50 کلومیٹر کندھوں پر لے جایا رہا ہے۔

محمد شاہ خان المعروف بہ حیا سیرئی خان کی شادی کے موقع پر مہمان ڈینز ہوٹل پشاور میں نواب کی گاڑی کے ساتھ

ریاست کا بیرونی دنیا سے رابطہ

دیر کا کوئی آدمی سمہ (ملاکنڈ کے اس پار یعنی ہشتنگر، مردان وغیرہ) جاتا تو وہ شان وشوکت سے اپنے سفر کا تذکرہ کرتا۔ لوگ اس پر رشک کرتے۔ بزرگوں کے بقول، ہم نے کبھی نہیں سنا تھا کہ اس دنیا میں امریکہ، برازیل یا اسٹریلیا وغیرہ ممالک بھی موجود ہیں۔ غربت اور رکاوٹوں کی وجہ سے لوگ کعبہ کی زیارت سے محروم تھے۔ 1926ء میں ٹانڈو مُلا نامی شخص کی وجہ شہرت ایک سو پچاس روپیہ خرچ کر کے تین ماہ کی مسافت طے کرنے کے بعد حج کی سعادت حاصل کرنا تھی۔

پنجکوڑہ کے آر پار ذرائع سفر

دریائے پنجکوڑہ پار کرنے کیلئے تیمر گرہ، چکیاتن اور صاحب آباد وغیرہ کے مقامات پر پل موجود تھے۔ باقی مقامات پر لوگ تیر کر دریا پار کرتے۔ خال میں جالہ کے ذریعے دریا عبور کیا جاتا تھا۔ جس کی اجرت اناج کی صورت میں شریف خان ماما وصول کرتا تھا [1] یہ سفر پر خطر تھا کیونکہ کسی بھی وقت جالہ الٹنے کا اندیشہ رہتا۔ یوں آر پار جانے کی مناسب سہولیت نہ ہونے کی وجہ سے ریاست کے لوگوں کو دریا نے تقسیم کر رکھا تھا۔

نظام مواصلات

1912ء میں جبن بجلی گھر سے پہلی دفعہ چکدرہ قلعہ کو بجلی دی گئی۔ 1935ء کے لگ بھگ نواب شاہجہان نے محل اور بنگلوں کو بجلی دینے کیلئے دیر خاص میں بجلی گھر تعمیر کروائے۔ شاہی محلات کے علاوہ چند گھرانوں کو نو آنے فی بلب روزانہ کے حساب سے بجلی میسر تھی۔ [2] 1897ء میں سدو کے مقام پر برطانوی فوجی چوکی کو ٹیلیفون کنکشن دیا گیا۔ 8 اکتوبر 1960ء تک دیر کی صرف تحصیلوں میں نو ٹیلیفون کنکشن تھے۔

1935ء میں نواب نے ریڈیو خریدا جس کے لئے لاہور سے انجینئر بلائے گئے۔ کئی تراکیب استعمال کرنے کے بعد اس کی نشریات سنی گئیں۔ رعایا کئی سال بعد تک بھی ریڈیو سے ناواقف رہیں۔ بعد میں تحصیلدار فضل غفور نے بھی ریڈیو خریدا اور جب اوچ میں لوگوں کے سامنے اسے آن کیا تو لوگ ورطہ حیرت میں پڑ گئے۔ یہ عجیب تماشہ دیکھنے لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔

---

[1] "جالہ" بیل کی کھال میں ہوا بھر کر اور اس پر تختے نصب کر کے بنایا جاتا۔

[2] یاد رہے کہ 1971ء میں تیمر گرہ اور 1976ء میں دیر خاص تک بجلی کی سہولت پہنچی۔

انتظام صحت

نواب شاہ جہان نے حکم جاری کیا کہ ریاست میں نہ تو شفاخانہ بنے گا اور نہ ہی انگریزی ادویات کی خرید وفروخت ہوگی۔ڈاکٹروں کو علاج معالجہ (پریکٹس) کی اجازت نہ تھی۔زگرور سید ایسے ہی ایک سینئر ڈاکٹر تھے جوایم بی بی ایس کرنے کے بعد پردیس میں نوکری کرنے پر مجبور تھے۔ریاست میں اگرچہ کئی موذی امراض اور وبائیں پھوٹتیں مگرا کیلے سدو حکیم دوآنے کے عوض ٹیکے لگانے کیلئے پوری ریاست کے دورے کرتا اکثر مریضوں کو طبیب، حکیم یا ڈاکٹر کی بجائے تعویذ گنڈوں، مزاروں اور دم چف کا سہارا تھا ۔شدید بیماری کی صورت میں بھی مریض کو ریاست سے باہر لے جانا ہر کسی کے بس میں نہ تھا۔ایک دفعہ میدان بانڈئی کا ایک خان بیمار ہوا۔اسے چارپائی پر ڈال کر ریاست سے باہر لے جایا جارہا تھا کہ تیمر گرہ کے قریب وفات پا گیا پر یہ بات ضرور مشہور ہوئی کہ بانڈئی کے خوانین اتنے امیر ہیں کہ اپنے مریض کا علاج پشاور میں کرواسکتے ہیں۔

ریاستی دَور میں عام بیماریاں ٹی بی (تبگئی)، دمہ (سالنڈے)، کینسر (کال وسری دانہ) ،اپنڈکس (شکندڑے وڑد)، چیچک (تنکئی) تھیں۔خاص علاقوں میں جڑی بوٹیوں کے ذریعے علاج کیا جاتا، گھریلو ٹوٹکے بھی آزمائے جاتے۔دانت نکالنے کا کام لوہار کا تھا۔بوڑھی عورتیں دایہ کے فرائض سرانجام دیتیں، بچے کا ختنہ گاؤں کا نائی (ڈم) کرتا۔ہڈی ٹوٹ جانے کی صورت میں ترکھان یا لوہار پیوندکاری کرتا۔ چیچک کی وباء پھیلنے سے کئی لوگ متاثر ہوجاتے۔متاثرہ شخص کو الگ مکان میں منتقل کیا جاتا اور وہاں سے کانٹوں کا باڑ گزارا جاتا۔گھر والے دروازے میں کھانا رکھ کر چلے جاتے۔مریض تنہائی کے عالم میں پڑا رہتا اور کوئی معجزہ ہی اسے بچاتا۔

ریاست سوات میں پہلا ہسپتال 1926ء میں بنا 1940ء میں سنٹرل ہسپتال بنایا گیا۔ریاست کے پاکستان میں ادغام کے وقت چار بڑے ہسپتال، تیس شفاخانے اور کئی ڈسپنسریاں قائم تھیں۔ٹی بی مریضوں میں کپتان شاہ روان یا امیر نواب کے ذریعے مفت دوائیاں تقسیم کی جاتی تھیں۔

حاجی آباد کے ملک حبیب اللہ جو سوزائد سال کی عمر میں حیات ہیں اپنے بیٹے، پوتے اور پڑپوتے کے ہمراہ (پرانے زمانے کی صحت مندی کی ایک زندہ مثال)

صحت مندی

ریاستی دور میں ہمارے آباؤ اجداد قدآور ،توانا اور صحتمند تھے ۔اس کی وجہ محنت ، جفاکشی اور خالص غذائیں جیسے گھی، دودھ اور مکھن کی کثرت تھی۔اس زمانے نہ پیچیدہ امراض تھے اور نہ دوائیوں کا کثرت سے استعمال ۔ دولت ،شہرت یا مادہ پرستی کا اتنا شوق تھا نہ معاشرے میں کامیابی کے پیچھے دوڑ۔یوں لوگ سادہ زندگی، سادہ مکان اور سادہ لباس پر مطمئن تھے۔

معاشرے میں سادگی اور اوسطاً ذرائع آمدن پر اطمینان ہونے سے گوناگوں مسائل نہ تھے۔اس زمانے کے لوگوں کی اوسطاً عمریں اسی تا پچاسی سال کے لگ بھگ ہوتی تھیں۔بالوں کے گرنے یا سفید ہونے کی بیماریاں بھی نہ ہونے کی برابر تھیں۔اگرچہ نواب نے صحت کے معاملے میں کوئی سہولت نہیں دی مگر حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے میں آج کی نسبت بیماریاں کم تھیں۔

اس زمانے کے بزرگ آج بھی توانا، قوی حافظے اور قدآور شخصیت کے مالک ہیں۔ایسے ہی ایک مثال موضع حاجی آباد کے الحاج ملک حبیب اللہ خان کی ہے۔گھر والوں کا دعوی ہے کہ ان کی عمر ایک سو بیس سال سے زائد ہے۔انھوں نے پچیس سال کی عمر میں شادی کی اور دس سال بے اولاد رہنے کے بعد دوسری شادی کی جس سے بیٹا علیم اللہ پیدا ہوا۔عاطف بن مقدس بن رابعہ (بیٹی) بنت علیم اللہ خان بن حبیب اللہ خان گویا حبیب اللہ کے پوتوں اور نواسوں کی بھی پوتے اور نواسے ہیں۔

دیر میں لکڑی کے بنے جوتے ''کھڑاوے'' کا استعمال نوے سال پہلے ختم ہوا جبکہ حبیب اللہ بابا کہتے ہیں کہ ''جوانی میں یہ جوتے میں نے استعمال کئے ہیں''۔بابا کی صحت مندی کا راز سخت محنت اور مشقت ہے۔بچپن میں بخارا اور ثمرقند تک خچروں پر تجارت کی۔1983ء تک توانا رہے۔دہی، دودھ، لسی، مکھن ان کی خاص غذا ہے۔بادام کھانے کے بھی شوقین ہیں۔

معیشت

1901ء میں ملاکنڈ ایجنسی کے پولیٹکل ایجنٹ ایم سی مہن اپنی کتاب [1] (Report on Dir ,swat and Bajaur Tribes) میں لکھتے ہیں۔ کہ 1899ء تا 1900ء دیر، سوات اور باجوڑ سے براستہ ملاکنڈ انڈیا کو 4798405 روپے کی اشیاء برآمد کی گئیں۔ جن میں سترہ لاکھ کا گھی سولہ لاکھ کے چاول، تین لاکھ کی دالیں، ساڑھے تین لاکھ کی گندم شامل ہے۔ علاوہ ازیں 7535423 روپے کا مال درآمد کیا گیا۔ تجارت کو فروغ دینے کیلئے انگریزوں نے 1901ء میں نوشہرہ سے درگئی تک ریلوے لائن بچھائی لیکن ہمارے حکمرانوں نے اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔

سال	انڈیا سے درآمدات	برآمدات	کل درآمدات و برآمدات
1897.98	38,32283	24,78935	62,11218
1898.99	42,63750	31,00717	73,64467
1899.1900	75,35423	47,98405	1,23 33828

عہد شاہ جہان

[2] ریاض الحسن لکھتے ہیں "نواب کا عقیدہ تھا کہ قوم کو جس قدر ذلیل و خوار رکھا جائے تو وہ اس قدر مطیع اور فرمانبردار رہتی ہے"۔ دولت کسی قوم میں شعور لانے اور ترقی پسند سوچ پیدا کرنے کا اہم محرک ہوتی ہے، وہ ایک طرف قوم کو تعلیم نہیں دینا چاہتا تھا تو دوسری طرف مواصلاتی نظام کو پیچیدہ بنا کر عوام کو دیر تک محدود رکھنا چاہتا تھا۔ اصل مقصد یہ تھا کہ قوم اقتصادی اور ذہنی طور پر پسماندہ رہے تا کہ اسے لمبے عرصے تک اپنے شکنجے میں رکھنا آسان ہو۔

---

[1] (Page 49) Report on Dir ,swat and Bajaur Tribes

[2] داستان دیر صفحہ ۶۲

بازاروں پر اجارہ داری

اقتدار میں آکر نواب نے ساری ریاست کے بازاروں کی زمینیں خریدیں اور قانون بنایا کہ نیا کاروبار شروع کرنے کیلئے اس کا اجازت نامہ لینا لازمی ہوگا۔ جابر حکمران کے سامنے سرمایہ دکھانا اور اجازت حاصل کرنا ہر کسی کے بس میں نہ تھا لہذا کاروبار مندی کا شکار رہا۔ ملاکنڈ ڈویژن کے بڑے شہر تیمر گرہ کے متعلق نواب کے سابقہ جمالدار کچکول ملک کہتے ہیں ''جہاں تک مجھے یاد ہے 1960ء تک تیمر گرہ بازار میں کل سترہ دکانیں تھیں، آج بھی مجھے ہر دکاندار کا نام یاد ہے، کریانہ، پانچ چپل (پنڑہ ساز)، کپڑوں کی دکانیں، ایک منڈی، آئیل پمپ اور دو ہوٹل کُل بازار تھا۔ اسی طرح دارالحکومت دیر خاص میں لگ بھگ سینتیس دکانیں تھیں۔[1]

مطلق العنانیت کا عالم

- ☆ تجارت اور جنگلات پر قبضہ۔
- ☆ ٹرانسپورٹ پر قبضہ
- ☆ تیل کا کاروبار قبضہ میں لیکر منڈا، دیر خاص اور تیمر گرہ میں پٹرول پمپ بنوائے۔
- ☆ ریاست کے ہوٹلوں کو ملکیت میں لے لیا۔
- ☆ ریاست میں جو کوئی جائیداد بیچتا تو اس کے خریدنے کا حقدار صرف حکمران ہوتا۔

ٹھیکیداری نظام

نواب نے بیشتر کاروبار پر قبضہ جما کر ٹھیکے اپنے حواریوں کو دے دیئے تاکہ سرمایہ کاری کو فروغ نہ ملے۔ ریاست میں انڈا خریدنے اور بیچنے کیلئے بھی علیحدہ تاجر ہوا کرتے تھے۔ ریاست سے باہر مرغی بھی فروخت ہوتی تو ریاست کو ٹیکس ادا کرنا پڑتا۔ قصائی ٹھیکہ حاصل کر کے گوشت بیچ سکتا تھا۔ وزیر کا کا نامی شخص ریاست کا واحد قصائی تھا۔ جو نواب کے کتوں اور شاہینوں کیلئے نوآنے اور عوام کو ڈیڑھ روپیہ فی سیر گوشت فروخت کرتا رہا۔

---

[1] (یاد رہے کہ اُس دور میں صرف مذکورہ بازار میں تین سو سے زائد دکانیں تھیں)

علاقہ جندول میاں کلے میں تاجر جو کہ بخارا، ثمرقند اور بدخشاں تک تجارت کرتے تھے، تحصیلدار طالب جان انھیں طرح طرح سے اذیت دیتا رہا اور ان سے دولت بسیار وصول کرتا رہا آخر کار یہ تاجر تنگ آ کر وطن چھوڑنے پر مجبور ہوئے''۔

جدید آسائشوں اور مصنوعات پر پابندی

ایک خفیہ ڈیل کے تحت دکانداروں کو پابند کیا گیا تھا کہ وہ جدید مصنوعات نہیں بیچیں گے۔ اس قانون کی رو سے ریاست میں کتابوں، سپورٹس سامان، ہارڈ ویئر، کراکری، سیمنٹ، سٹیل، سویٹس کی دکانیں نہ تھیں۔ ایک دکاندار ڈالڈا گھی لایا تھا تو تحصیلدار محمود جان نے اس کے پچیس ٹین گھی کو خاک میں ملا دیا۔ دکانداروں کو پابند کرنے کے علاوہ عوام میں سفید کپڑوں، سفید ٹوپی، پنجہ دار چپل، سواتی جوتی اور سواتی چادر استعمال کرنے کی حوصلہ شکنی کی گئی۔

حکمران کا خیال تھا کہ اگر رعایا کو فیشن اور بناؤ سنگھار کی اجازت دی گئی۔ تو تاجر مارکیٹ میں جدید مصنوعات لائینگے، خرید و فروخت بڑھے گی اور ریاستی اہلکار تنخواہ بڑھانے کا مطالبہ کرینگے نتیجتاً کرنسی کی ریل پیل بڑھے گی جو حکومت کے حق میں نہیں۔

کرنسی کی گردش کو روکنا

1924ء سے ریاستی فوجی اہلکاروں کی تنخواہ دو، تین اور چھ روپے مقرر تھی اور آئیں 1960 تک کوئی اضافہ نہ کیا گیا۔ سابقہ جمالدار سُر قاضی کہتے ہیں ''چونتیس سال جمالدار رہ کر بھی میرا کل اثاثہ چودہ سو کابلی سکے تھے۔

حکمران کا قول تھا'' کسی کے پاس ہزار روپیہ کابلی آجائے تو مجھے نیند نہیں آتی''۔ اور یہ ثابت کر کے دکھایا۔ ملازمین کیلئے الاؤنسز موجود نہ تھے۔ کوئی عضو ضائع ہو جانے پر وظیفہ کا اہتمام نہ تھا۔ دوسری جانب سوات میں پنشن کے علاوہ بازو، ٹانگ کٹنے یا آنکھ ضائع ہونے پر تین سو روپیہ ملتا۔

سوات میں قتل کے جرمانے کا 1/2 حصہ مقتول کے وارثین کو ملتا جبکہ دیر میں سارا جرمانہ یعنی

ا داستان دیر صفحہ ۶۹

پانچ سو روپیہ خزانے میں جاتا۔نواب نے قائداعظم ریلیف فنڈ کی مد میں دو لاکھ کا چندہ غریب رعایا سے جمع کیا۔الہ ڈھنڈ کے اکبر خان بابا کے بقول حکومت پاکستان سے سڑک کی مرمت کیلئے نواب کے درجنوں سپاہیوں کو اڑتالیس روپیہ ماہوار معاوضہ ملتا۔مگر آدھا حصہ نواب ہتھیا لیتا۔

میدان بانڈئی خوانین کے کھیتوں میں جاکر جاسوس خوشوں کو بھی گن لیتے اور پھر نواب کو پیداوار کے متعلق رپورٹ پیش کرتے۔اوچ کے ملک جلات خان نے فصل بیچ کر تیس ہزار روپیہ کمائے۔تو اسے دربار بلایا گیا۔خطرہ بھانپ کر وہ نہا گدرہ گیا اور ملک پام جان (مشر پائندہ خیل قوم) کو ساتھ لے گیا۔نواب اس شرط پر مان گیا کہ " خه تره زه دیے پریگدم خو دیے به تاله لس زره روپئی در کوی"۔"چچا میں اسے چھوڑ دیتا ہوں مگر اسے آپ کو دس ہزار روپیہ دینے ہونگے"۔

پائی پائی کی وصولی

نواب نے اپنی شاہانہ زندگی پر پانی کی طرح پیسہ بہایا۔وہ عوامی فلاحی بہبود پر پیسہ نہیں لگا رہا تھا اسلئے خزانے کی تجوریاں بھری رہتیں مگر اس کے باوجود غریب رعایا سے ٹیکس اور واجبات کی پائی پائی کی وصولی میں مستعدی اور سختی دکھائی۔

☆ چکدرہ چونگی پر ٹول ٹیکس آدا کئے بغیر مرغی بھی باہر نہ جانے دی جاتی۔

☆ ایک بلب کے عوض نو آنے روزانہ کا بل وصول کیا جاتا۔

☆ دریائے پنجکوڑہ پر واقع پل پار کرتے وقت دو آنے کا ٹیکس دینا پڑتا۔

☆ سدو حکیم دو آنے وصول کر کے ہی چیچک کا ٹیکہ لگاتا۔

والی غریبوں کی مدد کرنے میں بہت فراخدل تھا۔والی نے ایک یتیم خانہ بھی قائم کیا۔والی کا ڈرائیور شاہ جہان بابا کہتا ہے کہ جب میں اور والی صاحب سیر کو نکلتے تو میری نظر ناداروں اور غریبوں پر رہتی، کیونکہ مجھے والی کا حکم تھا کہ کسی نادار کو دیکھو تو گاڑی رک لیا کرو اور اسے صدقہ دے دیا کرو۔گورتئی، چار باغ اور کڑاکڑ کے مقامات میں جو معذور اور غریب ہوتے والی خود ان کے پاس جاکر انھیں خیرات دیتا تھا اور بعض کیلئے خزانے سے مستقل وظیفہ (برات) بھی مقرر کر رکھا تھا۔

ذرائع آمدن

نواب اوّل خان محمد شریف خان کا 1895ء میں انگریزوں کی طرف سے سالانہ دس ہزار روپیہ وظیفہ مقرر کیا گیا۔ 1912ء میں نواب اورنگزیب کے عہد میں یہ وظیفہ بڑھا کر پچاس ہزار روپیہ کر دیا گیا۔ 1925ء میں نواب شاہ جہان کے عہد میں یہ ایک لاکھ تک پہنچا۔ بعد میں وظیفے کی بڑھوتری کو خفیہ رکھا گیا۔ نواب شاہجہان انگریزوں سے ڈاک کی تقسیم کے بدلے بتیس ہزار سالانہ لیتا تھا۔

☆ اکبر خان نامی بزرگ (موضع الہ ڈھنڈ) 1953ء تا 1960 پاکستانی انجنیر کی حیثیت سے چکدرہ لواری سڑک کی مرمت وغیرہ کا انتظام سنبھالتا رہا۔ اس کا کہنا ہے کہ ''حکومت پاکستان نواب دیر کو لواری ٹاپ سے برف ہٹانے اور سڑک کی تعمیر و مرمت کیلئے چھ لاکھ روپیہ ادا کرتی رہی''۔ اتنی بڑی رقم صیغہ راز میں رہی۔

☆ جرمانوں کی مد میں خاصی رقم وصول کی جاتی جو باقاعدہ ریکارڈ کے تحت دیر خاص لے جا کر صوبیدار خزانہ کے پاس جمع کی جاتی۔

☆ ہر دکاندار چھ روپیہ ماہوار کرایہ نواب کو ادا کرتا۔

☆ بسوں کی آمدنی کے علاوہ دیر خاص، تیمر گرہ، منڈا اور چکدرہ تیل پمپوں کی پیداوار الگ تھی۔

☆ چکدرہ، ورسک، تیمر گرہ، رباط، داروڑہ، دیر، منڈا، شہر باغ میں نو ہوٹل تھے۔ ان ہوٹلوں کے ٹھیکیداروں سے ہزاروں روپے سالانہ ٹھیکہ وصول کیا جاتا۔

چونگی محصولات

ایرانی سیاح لکھتے ہیں کہ ''1951ء میں چکدرہ چونگی پر ٹیکس محصولات کا ٹھیکہ دو لاکھ تیس (230000) ہزار کابلی کے عوض عبدالحمید ٹھیکیدار کے پاس ہے''۔ یہ ٹھیکہ بعد میں چار لاکھ روپیہ تک بڑھا دیا گیا۔ اس کے علاوہ کئی جگہوں پر چھوٹی چونگیاں تھیں۔ خال کے بادشاہ محمد سیٹھ کے علاوہ اوچ کے عبدالحمید خان اور چکدرہ کے مجید اللہ خان چکدرہ چونگی کے ٹھیکیدار رہے۔

---

1 بسوئے کافرستان (محمود دانشور) صفحہ ۳۴

منڈیاں

دیر خاص، چکدرہ، تیمر گرہ، میاں کلی میں تجارتی منڈیاں بھی ٹھیکے پر دی گئی تھیں۔ تیمر گرہ میں یہ ٹھیکے ملک نظیر محمد کاکا (سکنہ دیاروں)، محمد شاہ خان ملک (خیمہ) اور ملک سید روز خان (انڈھیری) کے پاس مختلف زمانوں میں رہے۔ نواب ٹھیکوں کی مد میں بھاری رقم وصول کرتا۔ بدلے میں یہ ٹھیکیدار (کابل اور بدخشاں) کے تاجروں سے چونگی وصول کرتے جو خچروں پر تجارتی مال لئے یہاں ستانے کی غرض سے روک جاتے۔

عشر (اناج ٹیکس)

عشر ریاست کے خزانہ کی سب سے بڑی آمدنی تھی۔ فصل تیار ہونے پر کسان اس وقت تک فصل کھلیان (درمند) سے نہ اٹھاتا جب تک نواب کا سپاہی (ماصل) آکر اس کو وزن کر کے فصل کا دسواں علیحدہ نہ کرتا اور مہر (ٹاپہ) نہ لگاتا۔ فصل چوری کا جرمانہ قتل کے برابر پانچ سو روپیہ تھا۔ رباط میں اخروٹ کے ایک درخت پر دو روپیہ ٹیکس لیا جاتا یا رقم کے عوض اخروٹ لئے جاتے۔

قلنگ

تحصیلدار بیرونی مہمانوں کی تواضع کے بہانے لوگوں سے گھی، شہد اور مرغیاں جمع کرتے۔ منجائی، میدان، داروڑہ میں یہ قلنگ جمع کرنا چکی والے کی ذمہ داری تھی۔ عشیرئی درّہ کا ساتل خان سپاہیوں کو لئے پہاڑوں میں گجروں سے بھیڑ بکریاں جمع کرتا۔ ریوڑ کی شکل میں دربار تک لے جاتا۔ بھیڑ کی اون (وژغنی) بھی قلنگ کے طور پر لی جاتی۔

کوہستانی قبائل سے گھی کا قلنگ ریاست کی آمدنی کا بڑا ذریعہ تھا۔ ایک پاکستانی افسر کے پوچھنے پر نواب نے بتایا "زما ریاست کی دومرہ غوڑی پیدا کیگی چہ ځه به درته پرے ژرنده او گرذوم)۔ "میری ریاست میں اتنا گھی پیدا ہوتا ہے کہ اس پر چکی چلائی جاسکتی ہے۔

ہزاروں من گھی جمع کر کے مقامی دکانداروں کو دس روپیہ من بیچنے کے علاوہ برآمد بھی کیا جاتا۔

---

۱ داستان دیر صفحہ ۱۶۲

پن چکیاں (ژرندے)

خزانہ، تیمر گرہ، منجائی، میدان، داروڑہ اور دوسرے کئی مقامات پر نواب کی چکیاں تھیں جو اکثر جرمانوں کی صورت میں سرکاری تحویل میں لی گئی تھیں۔ پانچ چکیاں کوٹو اور کہنہ ڈھیر میں تھیں جو تخم ماما اور شمس الرحمٰن کے زیر انتظام چلتی تھیں۔ تخم کا کاروبار بھی ٹھیکیداروں کے پاس تھا۔ جو تخم بیچ کر حکومت کو سالانہ آدائیگی کرتے۔

شاہی باغات

ریاست میں موجود قلعوں کے پاس پھلوں کے باغات تھے۔ یہ باغات سالانہ ہزاروں روپیہ ٹھیکہ پر دیئے جاتے۔ ان کے علاوہ علاقے کے کسی خان یا ملک کے تصرف میں ایسا باغ نہ تھا جو وافر پیداوار کا حامل ہو۔

ٹیکس برائے زمین

زمین کی خرید و فروخت کیلئے مقامی تحصیلدار کی تصدیق ضروری تھی۔ زمین کی منتقلی پر خریدار اور فروخت کنندہ سے زمین کے تناسب سے ٹیکس وصول کیا جاتا۔ بھاری ٹیکسوں اور مناسب ریٹ نہ ہونے سے زمینوں کی قیمتیں کم تھیں۔ اس زمانے میں پراچگان مقامی صاحب جائیداد لوگوں سے گڑ، نمک اور چائے کی پتی کے بدلے زمینیں خریدتے۔

گاؤں کی اجارہ داری کا ٹھیکہ

ارياض الحسن لکھتے ہیں نواب گاؤں کے ملک کو اجارہ داری (مشری) کا عہدہ تین تا چار ہزار روپیہ کے عوض منتقل کرتا۔ ملک کو آٹھ یا دس سپاہی دیئے جاتے۔ ان سپاہیوں اور تحصیلدار کی پشت پناہی سے ملک گاؤں کے سیاہ و سفید کا مالک بن جاتا۔ ملک لوگوں کی زندگی اجیرن کرتا تو یہی عہدہ اس کے کسی رشتہ دار (تربور) کو بیچا جاتا۔ یاد رہے کہ ملاکنڈ علاقہ سفرے کا ٹھیکہ یار محمد خان اور کوھیرے گاؤں کا ٹھیکہ حکیم خان ملک نے پانچ پانچ ہزار کابلی سکوں کے عوض حاصل کیا تھا۔

---

1 داستان دیر صفحہ ۱۶۲

نوابی دور کے رائج الوقت سکے

قومی خزانے کا راز

ساٹھ کی دہائی میں ریاست سوات کا بجٹ دو کروڑ کے لگ بھگ تھا۔ بجٹ کا سالانہ اعلان کیا جاتا جبکہ دیر کے مالیاتی اثاثے صیغہ راز میں رہے۔ جب آٹھ اکتوبر کو ایک کالا ہیلی کاپٹر نواب کو لئے براول کی پہاڑیوں پر اڑان بھر رہا تھا، تو خزانہ کا حال کچھ اس طرح تھا۔

مرکزی خزانہ	(910645/10/3) کابلی سکے
جندول کا خزانہ	15000/0/0
حیاسیرئی کا خزانہ	25710/6/0
ذاتی تجوری	130786/4/6
سلوری سکے	34323/4/0
محل سے	7800/00/0
ایک اور سیف سے	36/94/9/0
کل	1082142/4/9

تحصیل خزانوں اور افسروں کی جیبوں میں موجود سکے اس کے علاوہ تھے۔ رقوم کے علاوہ محل کے مختلف حصوں سے Gold soverign(136) اور Rubies(54) بھی برآمد ہوئے۔

کرنسی

دیر میں افغانستان کے حکمرانوں امیر دوست محمد خان، امیر محمد خان، امیر شیر علی خان، امیر عبدالرحمان، امیر حبیب اللہ خان، امیر امان اللہ خان، امیر نادر شاہ اور ظاہر شاہ کے زمانے کے سکے چلتے رہے۔ ریاست دیر میں کابلی سکوں جبکہ سوات میں 1926ء سے انڈین اور 1947ء کے بعد پاکستانی کرنسی میں لین دین ہوتا رہا۔

کابلی کرنسی میں شش پلے، شاز ندا پلے اور قران (چار قران ایک روپیہ) سے لین دین ہوتا رہا۔ پھر پیسہ، ٹکہ، آدھ آنہ، آنہ، دوآنی، چار آنے (چونّی)، آٹھ آنے (آٹھنی) اور ایک روپیہ ان کابلی

سکوں کی جگہ استعمال ہونے لگے۔نوابی دور میں سات کابلی روپیہ پر ایک دنبہ اور چالیس روپیہ پر ایک تولہ سونا ملتا تھا۔ 8 اکتوبر 1960 کے بعد دیر میں کابلی سکوں کی جگہ پاکستانی کرنسی نے لے لی۔[1]

عوامی خرچ

حکمران نے قومی خزانہ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا سٹیٹ خزانہ، ذاتی آمدن۔عشر محصول ٹھیکے، جرمانے وغیرہ قومی خزانے میں جمع ہوتے تھے۔کوہستان کے جنگلات، گھی قلنگ، دکانوں کا کرایہ ،بسوں اور تیل کی آمدنی،، ذاتی جائیداد، فصل اور چکیوں وغیرہ کی آمدن نواب کے ذاتی خزانے میں جمع ہوتی تھی۔

قوم کے خیال میں نواب کے اخراجات ذاتی آمدن سے پورے ہوتے تھے۔یہ مغالطہ تھا کیونکہ اس نے فوجی تنخواہ کے علاوہ فلاحی یا قومی مفاد میں کوئی خرچ نہ کیا۔ہسپتال، سکول اور سڑکیں بنوائیں نہ ہی کوئی بیت المال قائم کیا۔بلکہ ہر طرح کی آمدن کو اپنے شاہانہ ٹھاٹ بھاٹ کی نذر کرتا رہا ۔حکمران کی تعریفوں کے پل باندھنے والے یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ نواب نے فلاح عامہ کیلئے ایک کابلی سکہ بھی صرف کیا ہو۔

نواب کی شاہ خرچی

محمد شاہ جہان کو انگریزوں کے زمانے کا امیر ترین نواب کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کیونکہ وہ اپنی ریاست کی آدھی سے زائد جائیداد کا مختار تھا۔بھاری ٹیکسوں کی مد میں وصول ہونے والی خطیر رقم کو ذاتی آسائشوں کیلئے استعمال کرتا تھا۔اس نے اپنے عیش وعشرت کیلئے تجوریاں کھول رکھی تھیں۔اس کی شاہ خرچیوں کے کچھ قصے بطور مثال پیش ہیں۔

دلاور جان مرحوم ولد رضا خان تحصیلدار انکشاف کرتے ہیں کہ'' نواب کے مصنوعی دانت سونے اور چاندی کے تھے۔جسے میں نے کئی دفعہ اپنے ہاتھوں سے دھو کر صاف کیا''۔نواب کے چشمے کا فریم اور سینے پر لٹکتی گول گھڑی بھی سونے کی بنی تھی۔بعض گھریلو برتنوں کے علاوہ زیر استعمال فرنیچر

---

[1] آجکل ایک کابلی چاندی کا سکہ اسی روپیہ پاکستانی کے عوض ملتا ہے۔

جسے کچھ عرصہ پہلے پنڈی حویلی منتقل کیا گیا، بھی چاندی کا بنا ہوا تھا۔

اپنے لئے آم ممبئی سے اور انگور کابل سے منگواتا۔ نواب کی برش اور مجون پر اس زمانے میں بیس ہزار کے لگ بھگ خرچہ آتا تھا۔ شکار کیلئے بندوق لندن سے خریدی۔ سینکڑوں کتوں، یورپی گھوڑوں اور بازوں پر اٹھنے والے اخراجات مغل اعظم کے اخراجات سے کم نہ تھے۔

درجنوں انگریزی کوٹ، جوتوں کے اعلیٰ جوڑے، کابلی چادروں کے تھان، شہزادیوں اور شہزادوں کیلئے کپڑے، جوتے، اور سونے کا ساز و مان مہنگے داموں دہلی کے بازاروں سے منگوایا جاتا۔

کئی عالی شان بنگلوں، ریسٹ ہاؤسز اور ذاتی محل کے علاوہ پناہ کوٹ میں شیش محل تعمیر کروایا۔ محلات تو کیا نوابوں کی قبروں پر قیمتی سنگ مرمر لگائے گئے ہیں۔

زیر استعمال کاریں

پاکستان کے گورنر جنرل قائداعظم کی ایک موٹر تھی۔ اسی طرح امیر اور خوشحال ریاست سوات کے والی نے بھی ایک مرسڈیز پر اکتفا کیا (یاد رہے کہ والی سوات نے حکومت پاکستان کیلئے جنگی جہاز خریدا تھا جس کا نام پاک فوجی جنگی بیڑے میں جہانزیب رکھا گیا تھا)۔ 1929ء کے بعد نواب دیر ریاست سے باہر نہیں گیا۔ وہ شکارگاہ تک اکثر گھوڑے پر جاتا تھا۔ وہ سال میں صرف ایک مرتبہ برفباری ہونے پر تیمر گرہ آتے ہوئے گاڑی میں لمبا سفر کرتا تھا مگر پھر بھی اس کے پاس جدید ماڈل کی مہنگی امریکن اور جرمن گاڑیاں تھیں۔

شاہی موٹروں کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔ ''کراسلر سبز رنگ، ڈرائیور عبدالمجید ملک موضع شوہ اسبنڑ، بیوک کالا رنگ ڈرائیور لالی شیرین ملک موضع اوچ، سٹوڈی بیکر ڈرائیور غلام نبی ملک طور منگ، شیورلیٹ ڈرائیور شبڑ استاذ، کیڈلاک جو نواب کے بیٹے حیاسیرئی خان کے زیر استعمال رہی اس کا شیڈ بٹن دبانے سے کھل جاتا تھا۔ لنکن نامی گاڑی نواب محمد شاہ خسرو کے زیر استعمال رہی۔ جانشینوں نے سوائے ایک گاڑی کے باقی گاڑیاں بیچ ڈالیں''۔

رعایا کی مفلسی

غربت وافلاس کے مارے عام لوگوں کی طرح بہت سارے خواص کی حالت بھی ناگفتہ بہ تھی ۔سیند (دریائے پنجکوڑہ کے میدانی علاقوں) کے نامی گرامی ملک لاہوراور بنگال جاکر بھیک مانگنے پر مجبور تھے۔خان اور ملک کے کپڑوں میں بھی پیوند لگے ہوتے تھے۔عام لوگوں کو ماچس خریدنے کی سکت نہ تھی شام کو آگ جلاکر اس کے اوپر گوبر رکھ دیا جاتا تھا۔صبح کو پھونک مار کر آگ جلائی جاتی۔اس ترکیب سے کئی دنوں تک آگ کو زندہ رکھا جاتا۔جس کے ہاں تیل والا چراغ جلتا وہ خوش بختوں میں شمار ہوتا۔

ریاست میں عموماً لوگوں کے پاس لباس کا ایک ہی جوڑا ہوتا تھا۔جب دھونے کی ضرورت پڑتی تو لوگ رات کو دریا پر جاکر چادر سے جسم ڈھانپ کر کپڑے دھولیتے۔رباط ڈنڈا میں شیر افضل کا کا ایک غریب اور مفلس لکڑہارا تھا جس کے پاس پہننے کیلئے کپڑے نہیں تھے صرف ایک چادر میسر تھی جسم ڈھانپنے کیلئے وہ چادر کو لچکدار ٹہنی سے باندھے رکھتا تھا۔پورے علاقے کا یہ حال تھا کہ کوئی اسے ایک جوڑا کپڑوں کا نہ دے سکا۔

دوام اقتدار کیلئے خرچ

نواب شاہ جہان نے قومی دولت کو جہاں اپنی آسائشوں اور عیش وعشرت پر خرچ کیا۔وہاں خزانے کی بڑی رقم اس نے اپنے آپ کو اقتدار میں رکھنے اور اقتدار کو دوام بخشنے پر صرف کی۔

شعبہ دفاع

فوج کو تنخواہ کی آدائیگی اور اسلحہ سازی خزانے کے اہم مصارف میں شامل تھی۔فوج کے کچھ حصے کو نقد تنخواہ دی جاتی۔بعض کو ساٹھ ڈڑی اناج دیا جاتا۔اور بعض سرکاری زمینوں پر کاشت کے بدلے ریاست کی نوکری کرتے تھے۔

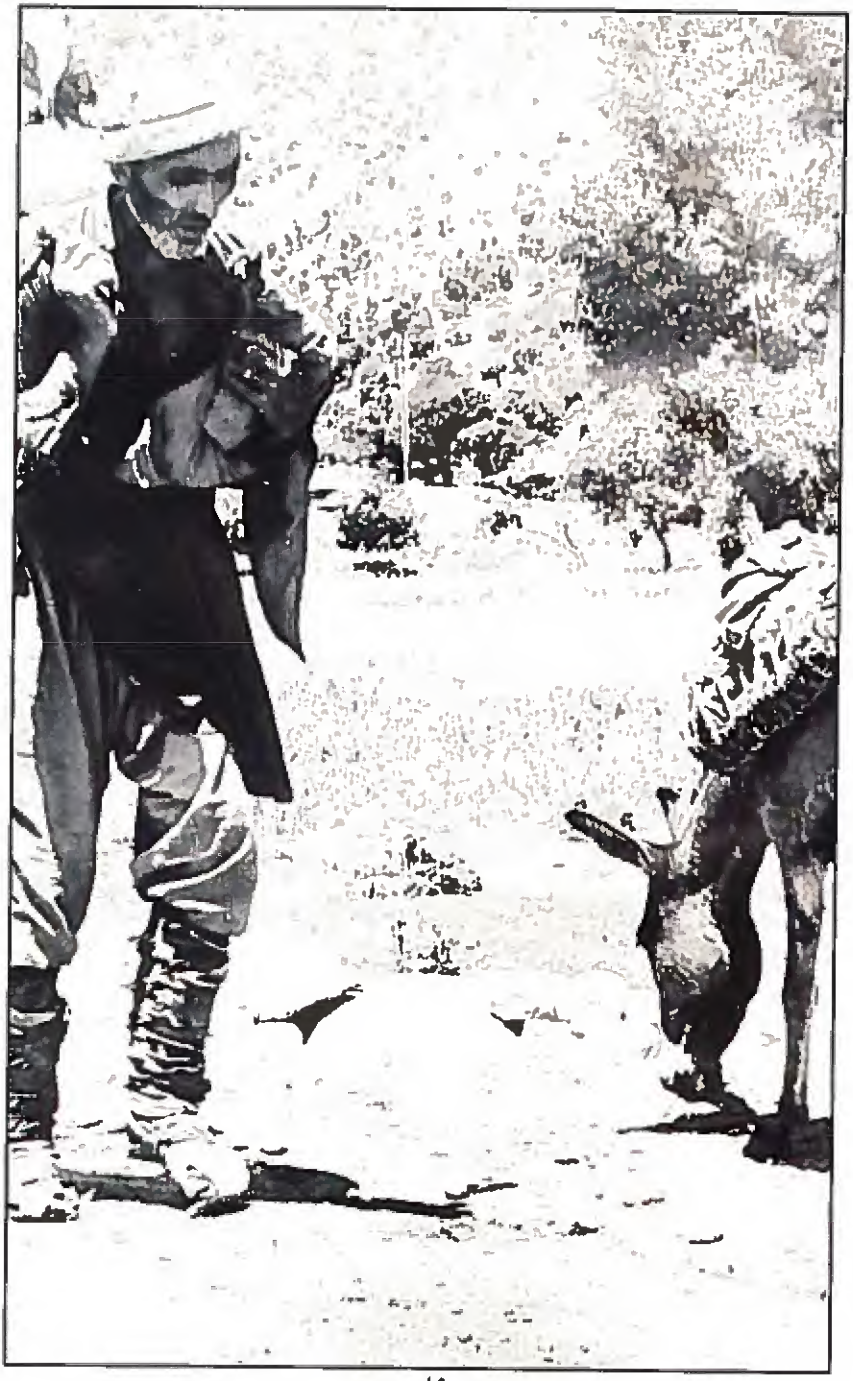

نواب دور کی مفلسی کی ایک مثال

پولیٹیکل ایجنٹ کو رشوت

حضرت صاحب (موضع طوطہ کان) انکشاف کرتے ہیں کہ ''فضل غفور تحصیلدار نے دوران گفتگو مجھے بتایا کہ وہ ادیزئی کے تحصیل خزانے سے قبائلی سرداروں کو وظیفہ ''برات'' کے علاوہ ملاکنڈ کے پولیٹیکل ایجنٹ اور ڈپٹی پولیٹیکل ایجنٹ کو مخصوص رقم دیتا تھا''۔

وائسرائے ہند، شاہ ایران، شاہ افغانستان سے تعلقات

اقتدار کو دوام بخشنے کیلئے نواب نے بین الاقوامی سطح پر تعلقات استوار کر رکھے تھے۔ دہلی، شاہ ایران، شاہ افغانستان، پاکستانی گورنر جنرل، گورنروں، فوجی جرنیلوں اور پولیٹیکل ایجنٹوں سے تعلقات پر بھاری رقم خرچ کی جاتی۔ اوچ کا ایوب جان نامی تاجر ہندوستان جا کر قیمتی تحائف لاتا۔ جسے بعد میں تحصیلدار فضل غفور کے توسط سے حکام اعلیٰ تک پہنچایا جاتا۔ اس کے علاوہ اعلیٰ نسل کے کتوں، گھوڑوں، اور معجون وغیرہ سے بھی خاطر تواضع کی جاتی۔

دعوت وضیافت اور برات

ریاست بھر سے عمائدین کو بلوا کر ان کی ضیافت کرنا نواب کی شاہانہ ٹھاٹ بھاٹ کا ایک بیّن ثبوت ہے۔ خوان میں دیسی گھی، چکور، مٹن اور پلاؤ پیش کیا جاتا۔ انہی ضیافتوں سے نواب نے ان لوگوں کو رام کیا اور خوان کے ذائقے نے ان لوگوں کو نواب کا مطیع بنالیا تھا۔ سلطان خیل اور پائندہ خیل عمائدین کو برات کے علاوہ بندوق، کتے، چغے اور اناج بھیجا جاتا تھا۔ نواب باجوڑ، ناواگئی، علاقہ اتمان خیل، الہ ڈھنڈ، بخیلہ، تھانہ اور مردان کے سرداروں اور خوانین کو بھی برات یعنی نقدی بھیجتا تھا۔

تعمیرات

نواب محمد شاہ جہان نے جہاں جنگلات کی کٹائی پر پابندی لگائی اور رعایا میں جدید طرز تعمیر کی حوصلہ شکنی کی۔ وہاں قلعہ نما اور دو منزلہ مکانات کی تعمیر سمیت مکانوں کے رنگ روغن اور کندہ کاری پر بھی پابندی لگائی۔ دارالحکومت میں محل کے آس پاس واقع پہاڑیوں پر تعمیر سے روکا گیا تا کہ محل عام گھروں سے اونچا دکھائی دے۔ یہی وجہ تھی کہ محل سے زیادہ بلندی پر کوئی مکان نہ تھا۔

ریحان کوٹ میں ایک شخص نے گھر کو چونے سے رنگ دیا، محل سے نکلتے وقت نواب کی نظر پڑی تو مالک مکان کو پچاس روپیہ جرمانہ کیا۔[1] اشرف درانی لکھتے ہیں۔ کہ گندیگار کے مقام پر ایک شخص کو اسلئے ریاست بدر کیا گیا کہ اس نے گھر کو سفید کرنے کی غلطی کی تھی۔ نوشیر خان ملک اور گل باز خان ملک جو بلامبٹ (چرگوڑئی) قوم اوسی خیل کی نمائندگی کرنے والے بااثر یوسفزئی ملک تھے، نے دو قلعے تعمیر کئے۔ ردعمل کے طور پر حکمران نے لشکر کشی کی اور دونوں قلعے مسمار کر دیئے۔

ساٹھ کی دہائی تک اگرچہ عوامی سطح پر جدید تعمیرات پر پابندی تھی مگر چند لوگ اس پابندی سے مستثنیٰ دکھائی دیتے ہیں۔ میدان بانڈئی کے خوانین کے گھر قلعہ نما تھے اور ان پر برج کھڑے دکھائی دیتے تھے۔ درہ براول جان بٹئی خانان کے علاوہ نہا گدرہ، عشیرئی درّہ، درّہ سلطان خیل کے سرداروں کو بھی چھوٹ حاصل تھی۔ دارالحکومت میں صاحبزادگان کے دربار کی رونق بھی بحال تھی۔ خال میں محمد زرین المعروف بہ کوٹ خونزادہ (بردالان) مظفر سید اخونزادہ (کوزدالان) اور عبدالجلیل اخونزادہ کے علاوہ بادشاہ محمد سیٹھ کے حجروں میں نقش اور کندہ کاری کے علاوہ کئی ایک میں ٹین چادر اور شیشہ استعمال کیا گیا تھا۔ بردالان کے علاوہ باقی حجرے اب بھی موجود ہیں۔

والی کے دور میں ریاست میں خوبصورت عمارتیں اور بنگلے تعمیر کئے گئے، ایک دفعہ ایک شخص نے خوبصورت بنگلہ بنایا تو والی نے خود جا کر اس کو انعام دیا۔ تعمیرات کے فروغ کیلئے میونسپل کمیٹی قائم کی گئی۔ والی بتھوڑ الیکر سرکاری عمارتوں کا خود معائنہ کرتا تھا۔ سرکاری سطح پر خوبصورت بنگلے، کالج، سکول اور ہسپتال بنائے گئے۔ جس میں سنٹرل ہسپتال، جہانزیب کالج، دو دو دیہ ہال، سفید محل مرغزار، اور درجنوں ریسٹ ہاؤسز اور ہوٹل شامل ہیں۔

[1] دیر سوات باجوڑ صفحہ ۳۷

شاہی اور سرکاری عمارات

دربار (Red Palace)

دیر خاص میں چٹانی سطح پر واقع دربار، نواب کی ذاتی رہائش گاہ، محل اور انتظامی امور چلانے کا مرکز تھا۔ آثار قدیمہ کے ماہرین کے مطابق یہ محل بدھ مت کے آثار پر تعمیر کیا گیا۔ سترہ صدی عیسوی تک یہاں کافرستان کے حکمرانوں کے رعبناک برج کھڑے تھے۔

شاہی خاندان میں خان ظفر خان (1804تا1814ء) پہلے حکمران تھے جو بیبیوڑ سے دیر خاص منتقل ہوئے اور یہاں ایک مضبوط فوجی قلعہ بنوایا۔ نواب اورنگزیب فن تعمیر کے دلدادہ تھے جنہوں نے کشمیر سے کاریگر بلوا کر جدید طرز پر محل تعمیر کرایا۔ انھوں نے دیر دربار، براول زڑہ بنگلہ، اخون الیاسؒ اور زوجہ کا مقبرہ اور ''خان شہید'' قبرستان کی تعمیر کی اور چبوترے بنوائے۔

محل میں آتشزدگی

مشہور روایت ہے کہ 1933ء میں نواب شاہ جہان نے ایک بزرگ کو بے عزت کر کے محل سے نکالا جیسے ہی وہ باہر نکلے دربار میں آگ لگ گئی اور آندھی چلنے لگی۔ محل کو شعلوں کی لپیٹ میں دیکھ کر سپاہیوں اور درباریوں کی دوڑیں لگ گئیں۔ مرد وزن اور چھوٹے بڑے سب لوٹے مٹکے لئے دریا کی طرف دوڑے۔ پانی لاکر آگ پر ڈالا جارہا تھا مگر شعلے تھے کہ اور بلند ہورہے تھے۔ نواب ایک طرف کھڑا ''میخ زین'' کو بچانے کیلئے پکار رہا تھا۔ شعلے ماند پڑ گئے تو دھوئیں کے بادل میں دربار کے بیشتر حصوں سمیت قیمتی سامان خاکستر ہوگیا تھا۔

از سر نو تعمیر کیلئے اینٹ کی بھٹیاں بنائی گئیں، چونا جوغانج کی کانوں سے نکالا گیا۔ عمارتی لکڑی کوہستان سے جبکہ شیشہ، ہارڈ ویئر اور سینیٹری کا سامان گران جان کے ہاتھوں ہندوستان سے منگوایا گیا۔ موجودہ عمارت میں اینٹوں اور چونے کا استعمال کیا گیا۔ ٹین کی چادروں کی چھت بنائی گئی اور چاروں طرف برج کھڑے کئے گئے۔ جنوب مشرق کے بالاخانے میں ایک دیدہ زیب بالکونی تعمیر کی گئی۔

دربار مستطیل شکل میں پھیلے ہوئے قلعے کے اندر واقع ہے جس کا کل رقبہ چالیس کنال ہے ۔چار کنال پر اسلحہ کارخانہ اور تین کنال پر اسلحہ گودام واقع تھا۔ گودام کے متصل نواب کی ذاتی گاڑیوں کے گیراج اور واشنگ سپاٹ ہیں۔ گیراج کے پچھواڑے بیواؤں کا دربار تھا۔[1]

شاہی محل

محل خاص دو حصوں پر مشتمل ہے، ایک زنانہ دوسرا مردانہ۔ دونوں حصے قریباً ایک ہی طرز پر بنائے گئے ہیں ۔ایک حصہ نواب کی ذاتی رہائش کیلئے مختص تھا۔ اس دو منزلہ حویلی کی پہلی منزل پر چار بڑے ہال، ایک ڈینگ روم، ایک ڈائینگ ہال، ایک گودام جبکہ دوسری منزل پر بھی کئی کمرے ہیں۔ گول ستونوں کے علاوہ بالکونیوں پر عمدہ نقش نگاری دیکھی جاسکتی ہے۔

محل کے صدر دروازے پر دو توپیں نصب ہیں بائیں جانب شہزادوں کا کمرہ اور نواب کا ذاتی دفتر ہے۔ ایک شاہی کچن، ایک جیل خانہ، مہمان خانہ اور اصطبل کے علاوہ قلعے کے گیٹ کے پاس دیر تحصیلدار گل زرین کا دو منزلہ دفتر بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

---

[1] سیدو شریف میں واقع سوات کے شاہی خاندان کا محل چودہ کنال پر واقع ہے جبکہ نواب شاہ جہان کا دیر محل چالیس کنال اور راولپنڈی میں واقع محمد شاہ خسرو کا بنگلہ اٹھارہ کنال کے رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔

سرکاری ریسٹ ہاؤسز اور بنگلے

تعمیرات کے شائق حکمران نے کئی بنگلے اور ریسٹ ہاؤس تعمیر کئے۔ یہ تعمیرات نہ صرف جدید طرز کی ہیں بلکہ ان کی تزئین وآرائش کا سامان بھی قابل دید تھا۔ ہر ریسٹ ہاؤس میں خانساماں اور نوکر لذیذ کھانوں سے مہمانوں کی خاطر تواضع کرتے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ جندول میں کوئی ریسٹ ہاؤس نہیں بنایا گیا۔

دیر ریسٹ ہاؤس

دربار کے نیچے بازار کے کنارے وسیع رقبے پر یہ بڑا ریسٹ ہاؤس انگریزوں کے زمانے میں تعمیر کیا گیا تھا۔ پانچ بڑے کمروں، کئی ہال، غسل خانوں اور ڈرائنگ روم پر مشتمل یہ ایک بڑا ریسٹ ہاؤس ہے۔ جس کے وسط میں دیو ہیکل چنار کے درخت اور پھولوں کی کیاریاں ہیں۔ حکومت کے خاتمے پر شاہی خاندان نے اسے ''دیر ہوٹل'' میں تبدیل کر دیا۔[1]

پناہ کوٹ ریسٹ ہاؤس

خوبصورت سیاحتی مقام پناہ کوٹ میں واقع اس ریسٹ ہاؤس میں پاکستان کے دو گورنر جنرل خواجہ نظام الدین اور گورنر جنرل سکندر مرزا، وزیر اعظم ذولفقار علی بھٹو، پاکستانی گورنرز اور کئی پولیٹکل ایجنٹ قیام کر چکے ہیں۔ یہ نوابی دور کا آخری اور جدید بنگلہ تھا جس میں شیش محل بھی بنوایا گیا تھا۔ اس ریسٹ ہاؤس میں کئی کمرے اور ڈائننگ ہال ہے۔[2]

براول بنگلہ اور ریسٹ ہاؤس

براول قلعہ کے نزدیک (زڑہ بنگلہ) نام سے مشہور یہ بنگلہ چاڑہ نواب نے بنوایا تھا۔ نواب شاہ

---

[1] یہ بعد میں پرنس سلیم میموریل ہسپتال اور اب دوبارہ ہوٹل بنا دیا گیا ہے۔

[2] لواری کے دامن میں سرسبز وشاداب مقام پر واقع یہ ریسٹ ہاؤس آج ضلع دیر بالا کے ڈی سی او کی رہائش گاہ ہے۔

جہان کی جوانی کے دن یہاں گزرے۔ اقتدار میں آ کر اس نے اس بنگلے کی تزئین و آرائش کی۔ برادل بانڈئی قلعہ کے اندر واقع ریسٹ ہاؤس 1940ء کے لگ بھگ میجر گل ملا خان کی نگرانی میں بنوایا گیا تھا۔ اس ریسٹ ہاؤس میں پانچ کمرے، غسل خانے، ڈائننگ ہال اور وسط میں خوبصورت چمن ہے۔

تیمر گرہ ریسٹ ہاؤس

یہ ریسٹ ہاؤس نئے قلعے (نوے قلعہ) کے اندر بنایا گیا۔ موسم سرما عروج کو پہنچتا تو نواب شکاری پرندوں، کتوں اور گھوڑوں کے ساتھ یہاں دو ماہ تک قیام کرتا۔ یہ ریسٹ ہاؤس ایک وسیع رقبے پر واقع ہے۔ اس زمانے کی یہ عمارت آج بھی دیر کی جدید عمارتوں سے حسین اور دلکش ہے۔

چکدرہ بنگلہ وریسٹ ہاؤس

زڑہ بنگلہ کے نام سے مشہور چکدرہ بنگلہ 1931ء میں نواب نے ذاتی رہائش کے لئے بنوایا۔ گلابی رنگ کے اس بنگلے میں نچلی اور بالائی منزل پر کئی کمرے ہیں۔ اس کے کچھ فاصلے پر چکدرہ ریسٹ ہاؤس واقع ہے۔ جو چھ کمروں اور ایک میٹنگ روم پر مشتمل ہے۔

حیاسیرئی اور منڈا کے بنگلے

نواب شاہ جہان سلطنت کو تین حصوں میں تقسیم کر کے وادی دیر اور کوہستان ولی عہد محمد شاہ خسرو، وادی میدان محمد شاہ خان اور وادی جندول شہاب الدین خان کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔ اس منصوبے کے تحت نواب نے حیاسیرئی اور جندول کے مقامات پر دو بنگلے تعمیر کرانے کا فیصلہ کیا۔

ماہر کاریگر بلوا کر سینکڑوں لوگوں کو کام پر لگا دیا گیا۔ منڈا اور حیاسیرئی کے بنگلوں میں فرق یہ تھا کہ منڈا بنگلہ کے باہر ایک گول عمارت (اسمبلی ہال) ہے اور حیاسیرئی بنگلہ سے متصل ایک دربار ہے دونوں بنگلوں میں ایک جانب دو منزلہ مہمان خانے ہیں۔ منڈا اور حیاسیرئی کے بنگلے حساس علاقوں میں واقع ہونے کی بناء پر قلعوں کے طرز پر بنائے گئے۔

حیاسیرئی بنگلہ

حیاسیرئی بنگلہ وادی میدان کے سرسبز و شاداب علاقے حیاسیرئی کے وسط میں واقع ہے۔ بنگلے

کے چاروں طرف پھلوں کے باغات ہیں۔ منڈا بنگلہ مربع نما جبکہ یہ بنگلہ مستطیل شکل میں بنا ہوا ہے۔ رقبے کے لحاظ سے بھی یہ بنگلہ شہاب الدین خان کے بنگلے سے بڑا ہے۔

حیا سیرئی بنگلہ میں بیرونی جانب قریباً تیس کمروں پر مشتمل دربار اور مہمان خانہ ہے جبکہ پچھلی جانب درجنوں کمروں پر مشتمل ذاتی محل اور زنان خانہ واقع ہے۔ اس بنگلے میں حیا سیرئی خان کی بیوہ اور بچے رہتے ہیں۔ حیا سیرئی بنگلہ اچھی حالت میں ہے کیونکہ یہ ابھی تک شاہی خاندان کے زیر تسلط ہے۔

منڈا بنگلہ

زرد رنگ کا منڈا بنگلہ ایک پرانے تاریخی قلعے کے وسط میں بنایا گیا۔ مست خیل حکمرانوں کے زوال کی نشانی منڈا کا یہ قلعہ نو بڑے برجوں پر مشتمل ہے۔ قریباً ساٹھ فٹ اونچے ان برجوں نے قلعے کی شان و شوکت کے علاوہ سینکڑوں میٹر لمبی دیواروں کو مضبوط سہارا دیا ہے۔ تعمیر کے وقت منڈا میں خشت بھٹی بنائی گئی۔ چونا ماہنی، تعمیراتی لکڑی مسکینی پہاڑیوں سے اور باقی سامان دہلی سے منگوایا گیا۔ بنگلے میں ایک لاکھ دوسو کے لگ بھگ بوری سیمنٹ استعمال ہوا۔ ایک بوری کی قیمت دو روپیہ کابلی تھی۔

کئی منزلہ مربع نما بنگلے کے دو چھوٹے اور دو بڑے دروازے ہیں۔ بنگلے کے چاروں طرف ہر سمت میں پہلی منزل پر بائیس کمرے اور ہال ہیں۔ دوسری منزل پر چودہ کمرے اور ہال ہیں۔ بنگلے کے باہر جنوبی طرف دونوں منزلوں پر درجن سے زائد حجرے ہیں جو کہ بنگلے کا سامنے والا حصہ ہیں۔ بڑے حجم والے کمرے تین حصوں پر مشتمل ہیں ایک بڑا ہال، ایک کمرہ اور ایک غسل خانہ۔ چار زمین دوز تہہ خانوں سمیت، منڈا بنگلے میں کل اسی کمرے بنتے ہیں۔

نقش و نگار

بنگلہ میں عمدہ کندہ کاری، گلسازی اور نقش نگاری کے نمونوں کے علاوہ مصنوعی گھوڑا، شیر اور پنکھا بھی دیکھنے کے لائق ہیں۔ قلعے کے وسط میں بڑا حوض ہے۔ جب بنگلہ تعمیر ہوا تو حوض میں واقع فوارہ بجلی کی مدد سے کئی میٹر تک پانی اچھالتا اور نیلے رنگ کا یہ خوش منظر تالاب بنگلے کی خوبصورتی میں اضافہ کرتا۔ کئی سال کی شبانہ روز محنت کے بعد بنگلہ تیار کر کے خوب سجایا گیا اور شہاب الدین خان قلعہ باڑوہ سے یہیں منتقل ہوا۔ شومئی قسمت دیکھئے کہ اگلی صبح پاک فوج نے بنگلے کو گھیرے میں لے لیا اور شہاب الدین خاں کا

محل میں رہنے کا خواب ادھورا رہ گیا۔اس کے گرفتار ہوتے ہی نواب کے موقع پرست افسروں نے بنگلے کے ساز وسامان پر ہلہ بول دیا۔1960ء تا1978ء تک یہ بنگلہ سرکاری ہسپتال رہا۔دو سال تک یہ قومی تحصیل دفتر رہا اور 1980ء سے اب تک اس میں افغان مہاجرین کا ایک کیمپ ہے۔

فوجی قلعے

ریاست دیر پر قریباً ساڑھے تین سو سال حکمرانی میں نواب شاہ جہان کے دور میں سب سے زیادہ قلعے تعمیر ہوئے۔سینکڑوں لوگوں کو جمع کر کے قریبی دریا یا پہاڑی تک ایک لمبی قطار بنائی جاتی۔پتھر اٹھا کر ایک شخص دوسرے کو اور دوسرا تیسرے پکڑواتا،تا آنکہ مقام تعمیر تک پہنچ جاتا۔اکثر قلعوں کی بیرونی دیواروں میں دریا کے گول مول پتھر دیکھے جاسکتے ہیں۔

مستطیل اور مربع نما قلعوں کی دیواریں دس سے لیکر پندرہ میٹر تک بلند، بنیادیں بارہ تا پندرہ فٹ گہری اور موٹائی چار تا چھ فٹ ہوتی تھی جبکہ قلعہ کے چاروں کونوں پر کئی میٹر اونچے برج (مانزئی) بنائے جاتے۔ان قلعوں کے نام اور مقام درجہ ذیل ہیں۔

کامبٹ قلعہ، عارف قلعہ، ڈاک قلعہ، باڑوہ قلعہ، منڈا قلعہ، مسکینی قلعہ، سنگ پارہ قلعہ، سنگیڑ قلعہ (مسکینی اور سنگ پارہ کے درمیان، معیار (نوی قلعہ)، طور قلعہ، سنزو قلعہ، ڈوپ قلعہ، مٹہ قلعہ، صدبر کلے قلعہ، کس کوٹو قلعہ، تورہ ڈھیرئی (غونڈئی)، کوٹکے قلعہ، جلالہ قلعہ، سرلڑہ قلعہ، شاہی قلعہ، گمبیر قلعہ، شلتلو قلعہ۔قلعہ بلامبٹ، تیمر گرہ (نوے قلعہ)، کھڈ قلعہ، شجادئی قلعہ، سلوزئی کفر درّہ، لعل قلعہ، شداس قلعہ، مانیال قلعہ، حیاسیرئی قلعہ، گندیگار قلعہ، بیبیوڑ قلعہ، شرینگل قلعہ، چکیاتن قلعہ، براول بانڈئی، دیر خاص مرکزی قلعہ، اوچ قلعہ، کتیاڑی قلعہ، شوہ قلعہ، راموڑہ قلعہ، باڈوان قلعہ، اسبنڑ خاص قلعہ اور چکدرہ قلعہ۔

دیکھا جائے تو سلطان خیل اور پائندہ خیل کی حدود میں قلعوں کی تعمیر پر خاص توجہ نہیں دی گئی۔ اس کی بجائے ریاست میں سب سے زیادہ قلعے ترکلانی اقوام کی حدود جندول میں تعمیر کئے گئے۔قلعوں کے اندر سپاہی گشت کرتے اور گھوڑے اصطبل میں دم ہلاتے نظر آتے۔رعایا کے دلوں میں ان قلعوں کا ایک دبدبہ تھا۔بلند برجوں میں رات کو بیٹھا پہریدار دوسرے کو تیز آواز سے پکارتا (بیدار شہ هلکه بیدار شه) بیدار رہو جاؤ بیدار ہو جاؤ۔

بلامبٹ قلعہ کا ایک منظر دریا پنجکوڑہ بھی نمایاں ہے۔

منڈہ قلعے کا بیرونی دیوار

منڈہ قلعے کا برج

گرفتاری کے بعد ان قلعوں کو زیادہ تر پولیس چوکیوں میں تبدیل کیا گیا۔ یوں حکمران کو زوال آتے ہی سب کچھ زوال پذیر ہوتا چلا یا گیا اور مذکورہ بالا قلعے کھنڈرات میں بدلنے لگے۔

میاں گل جان بنگلہ

نوابان دیر کا سب سے پرانا تاریخی اور گمنام بنگلہ میاں گل جان بنگلہ (زڑہ بنگلہ) کے نام سے جندول خان کے بنگلے کے پاس منڈا میں واقع ہے۔ 1905ء میں بنائے گئے اس بنگلے کے سو سال پورے ہو چکے ہیں۔ دیواروں کی مضبوطی کے لئے گھارے مٹی میں چونا، نمک، روئی اور انڈے بھی استعمال کئے گئے۔ اس کی پائیداری پر آج بھی لوگ حیران ہیں۔ 1975 میں تیسری منزل میں دراڑ آئی جسے گرا دیا گیا اور باقی کی دو منزلیں اب بھی سلامت ہیں۔

نور محل کے تبرکات

اوچ بازار میں واقع ایک مسجد میں نور محل کے نام سے تبرکات محفوظ ہیں۔ انھیں اوچ سادادگان کے جداوّل حضرت محمد نسیم صاحب عرف بابا صاحب اپنے پیر حضرت مرزا مظہر علی جان جاناں صاحب (جو ایک بڑے عالم اور جہانگیر بادشاہ کے بہنوئی بھی تھے) کی وصیت کے مطابق اونٹ پر لاد کر یہاں لائے تھے۔ ان تبرکات میں غلاف کعبہ، پانچ عدد غیر مطبوعہ کتب، حضورؐ کے موئے مبارک، حضرت علی کا عمامہ اور حسن و حسین کے لنگ شریف شامل ہیں۔ یہ تبرکات ملکی سطح پر شہرت رکھتے ہیں اور کئی مرتبہ قومی چینل پر ان کی تشہیر کی گئی ہے۔

میاں کلے بازار

منڈا کے سنگ میں باجوڑ جاتے ہوئے میاں کلے واقع ہے جو صدیوں سے سوداگرو کلے کے نام سے مشہور تھا۔ 1690ء میں میاں ساقی بابا (جندول میاں گان کے مورث اعلیٰ) آباد ہوئے تو اس نسبت سے یہ میاں کلے مشہور ہوا۔ صدیوں پرانی اس منڈی کا تذکرہ بابر نے بھی کیا۔ قدیم قبرستان کو دیکھنے سے ایسا لگتا ہے کہ یہ علاقہ طوفان نوح کی لپیٹ میں آیا تھا۔ قبرستان میں میاں ساقی بابا کے تین سو سالہ مزار کے علاوہ وہ پتھر بھی موجود ہے جس پر کھڑے ہو کر وہ جندول والوں کو وعظ دیا کرتے تھے۔ چار سو سال قبل سوداگرو کلے ثمرقند اور بخارا کی طرح ایک منڈی تھی جہاں چمڑہ سازی اور صابن سازی کے

کارخانوں کے علاوہ سینکڑوں ہنرمند (درزی، موچی) صنعتی کاریگری میں مشغول رہتے۔

پرانی مساجد

دیر کی سب سے تاریخی مسجد میاں کلے میں ''لوئی بابا جماعت'' کے نام سے مشہور ہے۔ عمراخان کے دور اقتدار میں اس کی تعمیر شروع کی گئی اور پشاور کے مستریوں نے 1897ء میں اسے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ انہی کاریگروں کے دست ہنر کے طفیل تیمرگرہ میں ''باباجی جماعت'' کی عمارت 1904ء میں مکمل ہوئی۔

ان مساجد کو دیکھ کر جہاں روحانی تسکین حاصل ہوتی ہے وہاں ہنرمندوں کی صناعی، مٹی کے درودیوار اور اس پر لگی لکڑی پر نقش کشائی، ہلکے سے اندھیرے کا احساس، عجیب سی خاموشی، چراغ دان اور چٹائی کی جگہ شہتیر کے تنکے (بروزہ) دیکھنے سے آدمی کی حالت بدل جاتی ہے۔ ایک اور تاریخی مسجد تھل کوہستان میں واقع ہے۔ حسین وادی کمراٹ کی دلفریب فضا اس مسجد کی خوشبو سے اور بھی معطر ہو جاتی ہے۔ مسجد کے دیوہیکل ستون اس زمانے کے کاریگروں کی ہمت اور طاقت کے ترجمان ہیں۔

انگریزی باقیات

1895ء میں دیر پر قبضہ جما کر انگریزوں نے 1897ء میں چکدرہ قلعہ اور سامنے واقع ایک پہاڑی پر آنجہانی برطانوی وزیراعظم ونسٹن چرچل کے نام سے منسوب ایک پکٹ تعمیر کیا۔ چرچل کی نواسی اور برٹش آرمی چیف سمیت وزیراعظم پاکستان بے نظیر بھٹو اس مقام کا دورہ کر چکے ہیں۔ 1902ء میں چکدرہ کے قریب دریائے سوات پر لکڑی اور لوہے کی امیزش سے پل تعمیر کیا گیا جو 1984ء تک زیر استعمال رہا۔ 1933ء میں انگریزوں نے بمقام بلامبٹ دریائے پنجکوڑہ پر پل بنایا۔ جو 1973ء کے سیلاب کی نذر ہو گیا۔ ایک دشوار گزار اور پرخطر علاقہ ہونے کے سبب انگریز یہاں پر کچھ زیادہ کاریگری نہ دکھا سکے۔

مہمان خانے

منڈہ بنگلے کا بیرونی منظر

منڈہ بنگلہ

منڈہ بنگلے کا ہال

دربار کا اندرونی مہمان خانہ

حیاسیرائی محل کا صدر دروازہ

مہمانان خانے کی بالکونیاں

بنگلے کا بیرونی نظارہ

پناہ کوٹ ریسٹ ہاؤس

جندول خان کا بنگلہ ثمر باغ جو اب نہیں رہا

تیمر گرہ ریسٹ ہاؤس

براول ریسٹ ہاؤس

دیر ریسٹ ہاؤس حال دیر ہوٹل

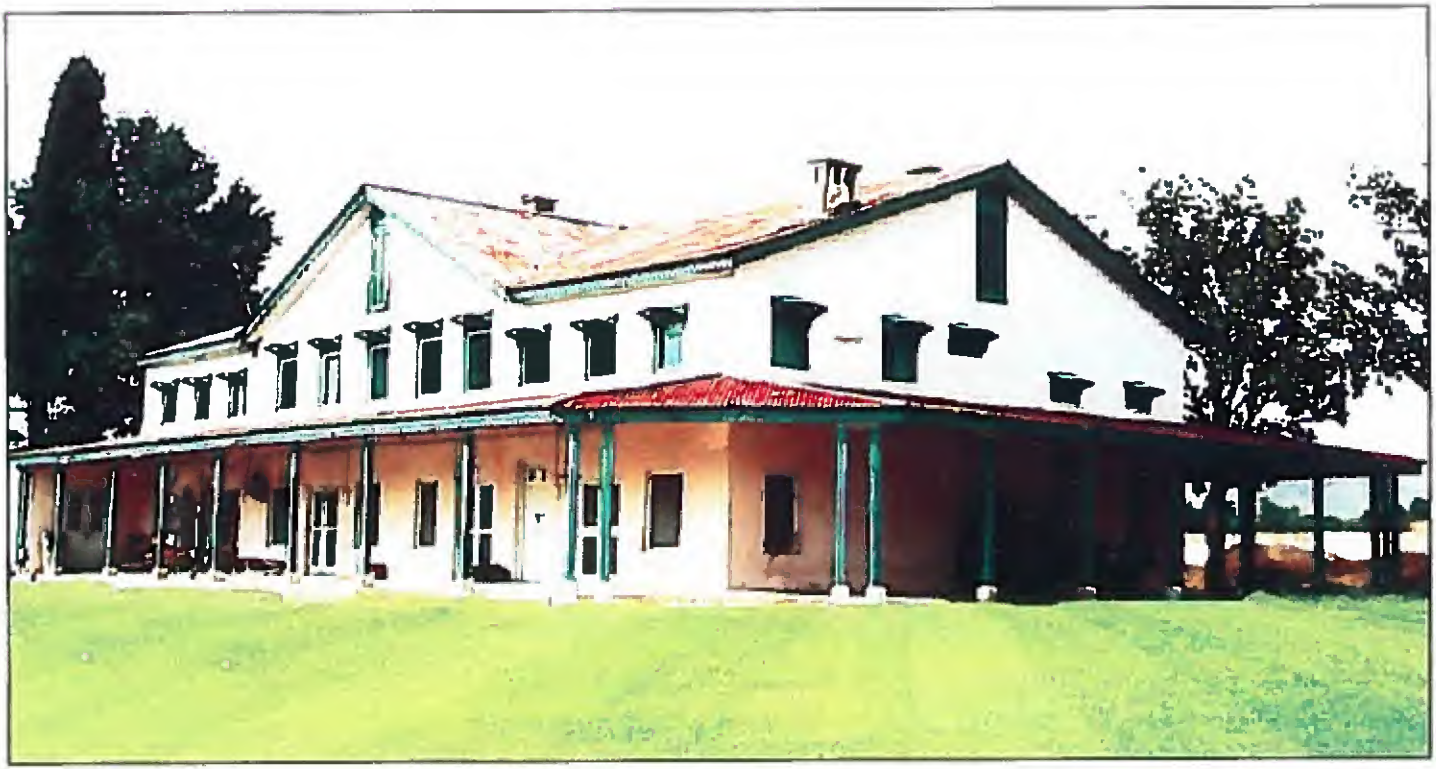

چکدرہ ریسٹ ہاؤس

تیمر گرہ کے باباجی مسجد کے مختلف مناظر جو لکڑی کی کاریگری کا ایک بہترین نمونہ ہے۔

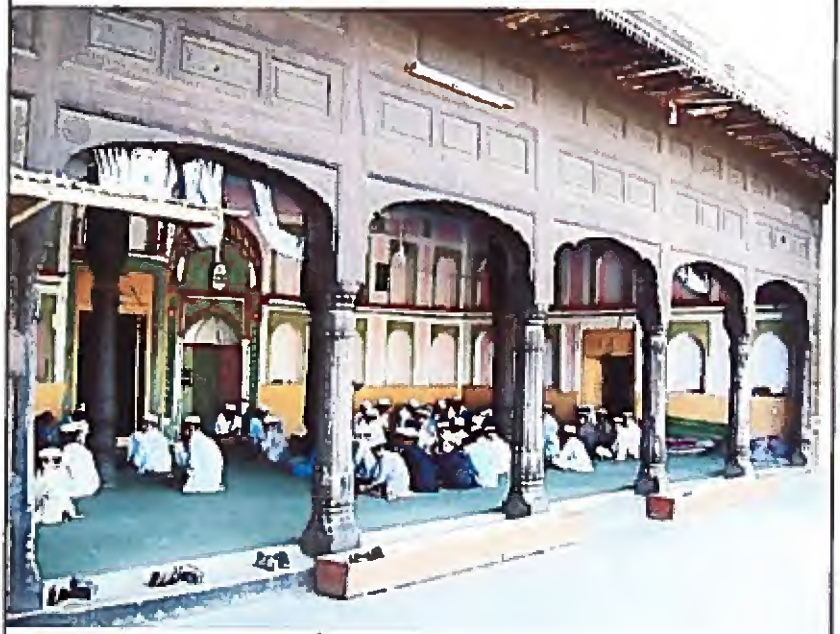

1896ء میں بنی میاں کلے کا تاریخ لوئی بابا مسجد

بابا جی مسجد میں 1904ء میں بنی کندہ کاری کا شاہکار نمونہ

بابا جی مسجد کے ستون

1933ء میں بنی ہوئی مسجد جو شاہی محل کے قریب ہے۔

جنگلات

خان ظفر خان کوہستانی جنگلات پر قابض ہونے والے پہلے پائندہ خیل حکمران تھے 1890ء میں عمر اخان مست خیل دیر پر قبضہ کر کے کوہستانی جنگلات کو تجارتی غرض سے استعمال میں لائے۔ بیگار یان کے ذریعے دیو ہیکل درخت (گرگے) کاٹ کر کھینچتے کھینچتے دریا کے کنارے لائے جاتے اور پھر طغیانی کے وقت دریا میں ڈال کر تیراک (لامبوزن) پیچھے لگا دیئے جاتے جو انہیں نوشہرہ تک بہا کر لے جاتے جہاں چار تا دس روپیہ فی درخت کے حساب سے فروخت کیا جاتا۔

نواب محمد شاہ جہان کا عہد

جب نواب شاہجہان اقتدار میں آیا تو خزانہ خالی پڑا تھا اسلئے اس نے ابتدائی سالوں میں کوہستانی جنگلات ٹھیکے پر دیئے۔ خزانہ بھرنے لگا تو جنگلات کی کٹائی اور ریاست سے باہر اس کی فروخت پر سخت پابندی عائد کی گئی۔ رعایا کے خیال میں یہ پابندی تحفظ جنگلات کیلئے تھی مگر حقیقت یہ تھی کہ بھرے خزانے کے ہوتے ہوئے جنگلات کی کٹائی کی ضرورت نہ تھی اور نواب کے ذاتی اور فوجی اخراجات عشر ،قلنگ اور انگریزی وظیفے سے پوری ہوتے تھے۔ دوسری طرف اگر کٹائی جاری رہتی تو کئی کاروبار جیسے ٹمبر مارکیٹ، فرنیچر انڈسٹری اور تعمیرات فروغ پاتے جو کسی طرح بھی حکمران کو منظور نہ تھا۔

ناغہ سسٹم

مقامی سطح پر لکڑیاں کاٹنے کی پابندی کو ''ناغہ'' کہتے۔ جب ایک نقارچی اعلان کرتا تو سب گاؤں والے کلہاڑیاں لئے جنگل پر ٹوٹ پڑتے۔ اس دن ہر کوئی زور سے کٹائی کرتا اور جمع کر کے اس کا ڈھیر لگاتا جسے ''دلئی'' کہا جاتا۔ یہ پورے موسم کیلئے ذخیرہ ہوتا۔ اس کے ساتھ گوبر جلا کر لوگ کھانے پکانے کا انتظام کرتے۔ اس کے بعد لکڑیاں کاٹنے پر دس روپیہ جرمانہ کیا جاتا۔ نواب کو خبر ملی کہ دارالحکومت کے بعض گھروں میں سلیپر موجود ہیں۔ سپاہی بھیج کر نہ صرف سلیپر برآمد کر لئے بلکہ پچاس روپیہ جرمانہ بھی لگایا گیا۔

پنجکوڑہ کے سیلابی ریلے میں جو درخت بہہ کر آتے حکمران اس پر بھی اپنا حق جتاتا۔ایک دن جندول خان اپنی ٹرک نما گاڑی ''گٹو'' میں جا رہا تھا۔پنجکوڑہ میں طغیانی تھی۔ بمقام واڑی ایک تیراک کو دیکھا جس نے جان جوکھوں میں ڈال کر درخت (گرگہ) کو پکڑ رکھا ہے۔

جندول خان نے گاڑی روکی اور اپنے آدمی بھیج کر اسے درخت حوالہ کرنے کا حکم دیا۔معمولی سی تکرار پر نوجوان کو زدکوب کر کے گاڑی میں ڈالا گیا اور دیر میں قید کر دیا گیا۔قبیلہ پائندہ خیل کو پتہ چلا تو غاوث ملک کی قیادت میں ایک جرگہ تشکیل دے کر اس کی رہائی کیلئے درخواست دی اور اسے رہا کروایا۔

شجر کاری مہم، باغات لگانے اور پودوں کی نشوونما کی کوئی نرسری نہ ہونے سے ریاست کے طول وعرض سبزہ اور فطرتی حسن سے مالا مال نہ ہو سکے۔1960ء کے بعد حکومت پاکستان کی دلچسپی کے باعث شجر کاری مہم کا آغاز کیا گیا۔محمد شاہ خسرو کے عہد میں تقریباً بارہ لاکھ پودوں کی مفت تقسیم کے علاوہ شاہراہوں کے آس پاس شجر کاری کی گئی۔

جنگلی جانوروں اور پرندوں کی بہتات

نواب کے دور میں جنگلات کی کٹائی پر پابندی سے قدرتی مناظر اور جنگلی جانور کافی حد تک محفوظ رہے۔گیدڑ، ہرن، شیر اور چیتے کوہستان کے جنگلات میں دستیاب تھے چکور کے تحفظ کی خاطر اس قدر کڑی سزا تھی کہ لوگ باہمی مخاصمت کا بدلہ لینے کیلئے چکور کو مار کر مخالف فریق کے دروازے میں پھینک دیتے تاکہ اسے سزا ہو جائے۔ پابندی کا مثبت اثر یہ ہوا کہ ریاست کے طول وعرض میں پرندوں کے جھنڈ اڑتے دکھائی دینے لگے جن میں چکور کے علاوہ کبوتر، بلبل، بطخ اور بٹیر قابل ذکر ہیں۔

زراعت

1523ء میں یوسفزئی اور اتحادی قبائل بمقام کاٹلنگ جمع ہوئے تاکہ پشاور تا لواری، باجوڑ، بونیر، دیر اور سوات مفتوحہ علاقوں کی تقسیم کر سکیں۔ اس تقسیم میں شیخ ملی سردار (مزار قمبر سوات) نے اہم کردار ادا کیا اسلئے یہ نظام شیخ ملی بابا کے نام سے منسوب ہے۔ بڑے قبائل کے مابین تقسیم کے ساتھ قبیلے کے اندر زمینوں کی تقسیم یعنی ''ویش'' کا نظام بھی رائج کیا گیا۔ اس کا مقصد ہر قبیلے کو بارانی اور نجر زمینوں سے مساوی مستفید کرنا تھا۔[1]

ریاست دیر میں شیخ ملی ویش کی رو سے ایک قبیلہ پانچ سال یا سات سال ایک گاؤں میں رہتا یہ معیاد پوری ہونے پر قبیلہ دوسرے گاؤں چلا جاتا اور اس گاؤں کے لوگ یہاں چلے آتے۔ جیسے کہ خونگی کے حسن خیل قبیلہ کے لوگ تیمر گرہ جا کر آباد ہوتے اور مقامی قبیلہ ابراہیم خیل مقررہ معیاد تک خونگی کے کھیتوں میں کاشت کرتے۔ نئے گاؤں میں منتقل ہونے والوں کے درمیان کھیت کھلیانوں کی تقسیم قرعہ (خسڑے) کے ذریعے کی جاتی

محمد اسلام اجملی لکھتے ہیں کہ قریباً چار صدیوں تک رائج یہ عجیب روایت نواب محمد شاہ جہان نے ریاست دیر میں اور 1929ء میں میاں گل عبدالودود نے سوات میں منسوخ کیا۔ سوات کی تقسیم کا مرحلہ قریباً چار سال میں مکمل ہوا اور قبائل جا کر اپنی حدود میں مستقل طور پر آباد ہو گئے۔

کھیتی باڑی

ریاستی دور میں موسم بہار میں پھول اور پودے لگائے جاتے۔ آبادی زیادہ نہ تھی مگر اکثر لوگوں کا ذریعہ معاش کھیتی باڑی سے وابستہ تھا۔ مکئی، چاول، باجرہ، گنا، دالیں، جو (ورشے) اور لوبیا اہم فصلیں تھیں۔ نوابی دور میں مکئی کی روٹی کھائی جاتی مگر انقلاب کے بعد گندم کا استعمال عام ہونے لگا۔ سبزیوں

---

[1] تفصیلات کیلئے دیکھئے ''گمنام ریاست حصہ اول''

[2] نوے دیر صفحہ ۸۲

میں پالک، شفتل، ٹماٹر، پیاز، کھیرا، شلجم، مولی اور سرسوں بوئی جاتی۔ میووں میں اخروٹ، ٹانگو، بادام الوچہ، خوبانی، گورگوری، کورے، شہتوت، انجیر، لوکاٹ، شفتالو، انگور، تربوز اور مالٹے اہم پیداوار تھی۔

دیسی گھی اور مال مویشیوں کی فراوانی

1961ء میں ریاست دیر تقریباً تین لاکھ اسی ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ ہر گھرانہ زراعت سے وابستہ تھا، دودھ اور سبزی کی کوئی باقاعدہ دکان نہ تھی۔ لگ بھگ پچیس ہزار گھرانوں کے ہر گھرانے میں بھیڑ، بکریاں، بیل اور گائے پالی جاتی تھیں۔ فرض کریں ہر گھرانہ اوسطاً بیس دڑی سالانہ گھی نکالتا، تو اس حساب سے گویا ریاست میں سالانہ پچاس ہزار من گھی پیدا ہوتا تھا۔

نظر بند ہونے پر نواب نے کہا ''میں لاہور ضرور آیا ہوں لیکن عزت، غیرت اور برکت بھی اپنے ساتھ لایا ہوں''۔ اس جملے کا عملی ثبوت ریاست کے لوگوں کی روزمرہ استعمال کی اشیاء سبزی، گوشت، انڈوں اور شہد وغیرہ میں خود کفالت تھی۔

نواب کی برکت کا دعویٰ اپنی جگہ صحیح مگر حقیقت میں اس برکت کی وجہ رعایا کی بھرپور محنت اور سب گھر والوں کا کھیتی باڑی میں لگن سے کام کرنا تھا۔ ریاست کی طرف سے مراعات اور سہولیات نہ ہونے کی وجہ سے سارے انتظامات اپنی مدد آپ کے تحت کئے جاتے۔

اسی طرح آبپاشی کے وقت نواب کی زمین کو اول سیراب کرنا پڑتا۔ دریائے پنجکوڑہ سے فصل سیراب کرنے یا چکی چلانے کیلئے نالہ (چینل) نکالتے وقت پیشگی اجازت ضروری تھی۔ جب تیمر گرہ کے کچکول ملک اور امیر زادہ ملک نے اپنے لئے چکیاں بنانے کی درخواست کی۔ تو انھیں چکیاں بنانے کی اجازت اس شرط پر دی گئی کہ وہ حکمران کیلئے بھی چکیاں بنائیں۔

نواب کے سپاہی کسانوں سے کھاد چھین کر سرکاری زمینوں میں لے جاتے۔ عشر وصولی میں سختی کی جاتی۔ فصلوں اور پیداوار کی آزادانہ خرید و فروخت نہ تھی۔ کسان پیداوار کو کھیت ہی میں اونے پونے داموں بیچ دیتے۔ ریاست میں نہ کوئی نرسری تھی، نہ عمدہ بیج اور نہ جراثیم کش دوائیوں کا بندوبست گنے چنے ٹھیکیدار ہی من پسند بھاؤ پر تخم فروخت کرتے۔

نظام آبپاشی

زمینیں سیراب کرنے کا انحصار قدرتی ذرائع، بارانی نالوں اور چشموں پر تھا۔ چشموں کے پانی کو ذخیرہ کر کے چھوٹا سا بند بنایا جاتا۔ جسے باری آنے پر استعمال کیا جاتا۔ پانی کم اور فصلوں کا رقبہ زیادہ ہونے کی وجہ سے باہمی چپقلش معمول تھا۔

تالاش اور ادینزئی میں نہری نظام نہ ہونے سے یہ علاقے بنجر اور ویران تھے۔ یہاں جگہ جگہ تالاب (ڈنڈے) بنائے جاتے جس میں بارش کا پانی جمع کر کے آبپاشی کے علاوہ جانوروں کو بھی پلایا جاتا۔ روڑی ڈنڈہ اور ادم ڈھیرئی ڈنڈہ مشہور تالاب تھے۔

دریائے پنجکوڑہ

پنجکوڑہ کی وجہ تسمیہ پانچ ندیوں کی نسبت سے ہے۔ اہم منبعے مشرقی دیر کے پہاڑوں میں واقع سیدگئی جھیل (ڈنڈہ) اور ہندوکش کے سلسلے میں واقع کوہستانی گلیشیئرز ہیں۔ برفیلے پہاڑوں کے نیلگوں پانی سے تین ندیاں، براول، لواری اور کوہستان بنتی ہیں۔ چکیاتن کے مقام پر ان کے سنگم سے دریائے پنجکوڑہ جنم لیتا ہے۔

عشیرئی درّہ، کارودرّہ، درّہ اخگرام، سلطان خیل درّہ، نہاگ درّہ، طورمنگ درّہ کی ندیاں (خوڑ) اس سے مل کر ایک بڑے دریا کا روپ دیتی ہیں۔ دیر پائین میں بمقام اشاڑی گٹ نالہ میدان اور بمقام خزانہ نالہ جندول ''رود'' بھی دریائے پنجکوڑہ کا حصہ بنتے ہیں۔

ترئی کے مقام پر تنگ پہاڑی سلسلوں میں سے نکل کر دریائے پنجکوڑہ بمقام ''درشئی'' دریائے سوات سے جاملتا ہے۔ نوشہرہ میں آکر دریائے کابل کے ساتھ مل کر اٹک تک سفر کر کے دریائے سندھ میں اپنا حصہ ڈالتا ہے۔ اپنے منبع کوہستانی گلیشیئرز سے نکل کر دریائے پنجکوڑہ ڈھائی ہزار کلومیٹر کا فاصلے طے کر کے بحیرہ عرب میں جا گرتا ہے۔

جاگیرسازی

موروثی زمینیں

شاہی خاندان کی پدری جائیداد علاقہ کوہان (نہاگ درّہ) ہے۔ 1640ء میں اخون الیاس گدی نشین ہوکر لوگوں کو علم وفیض دینے لگے تو لوگ شکران نعمت کے طور پر مال مویشیوں کے علاوہ زمینیں تفویض کرنے لگے۔ جو مقامی زبان میں ''سیرئی'' کہلاتی ہے۔ جائیداد بخشش کا سلسلہ نواب محمد شریف خان کے دور تک جاری رہا۔

شاہ جہانی جاگیر

سیری جائیداد کے علاوہ حکمران خاندان نے فتوحات، جرمانوں اور نقدی کی صورت میں کافی زمینیں بنائیں جو زمانے کے ساتھ ساتھ حکمرانوں کی اولاد میں تقسیم ہوتی رہیں۔ نواب شاہ جہان کے عہد میں جائیداد سازی عروج پر پہنچی اور ریاست کی زمینوں کو ہتھیا کر سرکار کے نام کرالیا گیا جس سے خان ازم کو دھچکا لگا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ چارسدہ، باجوڑ اور دوسرے علاقوں کی نسبت دیر میں خوانین کا زور کم ہے۔

[1] ریاض الحسن لکھتے ہیں کہ نواب کے بغیر کسی دوسرے فرد کو ریاستی جائیداد خریدنے کا حق نہ تھا کیونکہ نواب کا قانون تھا کہ اس کی اجازت کے بغیر کوئی جائیداد کی خرید وفروخت نہیں کر سکے گا۔ اگر کوئی شخص جائیداد فروخت نہ کرتا تو اسے کوئی بہانہ ڈھونڈ کر ملک بدر کیا جاتا۔ مجبوراً جو زمین حکمران کو فروخت کی جاتی تو وہ اس کی آدھی قیمت ادا کرتا۔ 1/4 سرکاری لنگی میں لی

---

[1] (داستان دیر صفحہ 89)

ریاست سوات کے حکمرانوں کو بھی کافی جائیداد سیری میں ملی تھی، 1970ء میں لینڈ رفارم ایکٹ کے مطابق سوات شاہی خاندان کے پاس چھیانوے ہزار ایکڑ یعنی قریباً اٹھ لاکھ کنال جائیداد تھی جو کہ اب پچیس ہزار ایکڑ تک رہ گئی ہے۔ ڈاکٹر سلطان روم لکھتے ہیں کہ۔ صفحہ ۲۵۸

One can easily be deprived of his property by the ruler or his favorites through the specific mechanism will known in the state.

جاتی اور باقی جو رقم فروخت کنندہ کو ملتی وہ نواب اہل کار اس شخص سے ہتھیانے کی کوشش کرتے۔ یعنی زمین کی قیمت ایک ہزار ہوتی تو لنگی اور افسران کے کمیشن کے بعد اس شخص کو چار سو روپیہ ملتے تھے۔

جائیداد کے حصول کا ایک حربہ یہ تھا کہ تحصیلدار، صوبیدار اور دوسرے اہلکار جعلی گواہ بنا کر ان سے انگوٹھے، دستخط یا جعلی رسید لکھوا کر جائیداد اپنے قبضے میں کر لیتا تھا۔ میراث پر قتل کی صورت میں بے اولاد مقتول کی زمین سرکاری تسلط میں لی جاتی۔ چکدرہ تا دیر، جندول اور میدان تک کی کارآمد زمینیں (بازار وغیرہ) نواب نے معاوضتاً اپنالی تھیں۔

فوج اور جرمانوں کے ضمن میں جائیداد سازی

فوج اور قلعہ سازی کے بہانے جائیداد پر قبضہ کرنا ایک بڑا حربہ تھا۔ نواب کو کہیں اچھے محل وقوع والی زمین نظر آتی تو فوجی قلعے کا بہانہ بنا کر مقامی لوگوں سے جائیداد طلب کی جاتی۔ جب ایک خان یا ملک زمین سرکار کے نام کراتا تو اردگرد کی زمینیں مختلف حیلوں حربوں (شفعہ، معاوضہ وغیرہ) سے مقامی لوگوں کو بھگا کر آس پاس کی زمینوں کو ہتھیا لیا جاتا۔ دیکھا جائے تو جہاں نوابی قلعے بنائے گئے تھے وہاں دور پہاڑوں تک جائیدادیں سرکاری تحویل میں لے لی گئی تھیں۔

جب دو بااثر خاندانوں میں زمین پر تنازعہ کھڑا ہو کر شدت اختیار کر لیتا اور فریقین میں کسی سے جرم سرزد ہو جاتا۔ تو ان کو عدالت میں گھسیٹ کر بھاری جرمانے لگائے جاتے۔ ادائیگی نہ ہونے کی صورت میں ان کی زمینیں ضبط کر لی جاتیں۔

کوہستانی جنگلات

تاریخ شاہد ہے کہ ملے بابا کی جائیداد شمال میں داروڑہ ''خان کس'' نامی مقام تک پھیلی ہوئی تھی۔ سترہویں صدی میں کوہستانی جنگلات پر خان ظفر خان نے کوہستانی کافروں سے قبضہ میں لے کر سلطان خیل اور پائندہ خیل قبائل کے تصرف میں دے دیئے۔ کئی دہائیوں تک کوہستانی جنگلات ان قبائل کے پاس رہے۔ دشوار گزار سفر، سرحدی تنازعات اور دوسرے مسائل کی وجہ سے قبائل ان جنگلات سے خاطر خواہ فائدہ نہ اٹھا سکے۔

بزرگ صحیح تاریخ بتانے سے قاصر ہیں مگر خیال کیا جاتا ہے کہ اقتدار کے ابتدائی سالوں میں

نواب نے سلطان خیل اور پائندہ خیل قبیلوں سے ایک معاہدہ کیا۔اس کی رو سے طے پایا کہ کوہستانی جنگلات نواب خاندان کے حوالے کرنے کے عوض ان قبائل کو دیر کے مہمان خانے میں مفت خوراک اور رہائش فراہم کی جاتی رہی گی۔

نواب شاہ جہان نے جب 1924ء تا 1928ء دیر میں شیخ ملی ویش نظام کوختم کر کے قبائل کو مستقل آباد کیا۔تو ملیزئی برید" خان کس دارودڑہ" سے آگے کوہستانی قبائل کی جائیداد اپنے خاندان اور اخون خیل قبیلے کے نام کردی ۔یہی وجہ تھی کہ دارودڑہ سے لواری تک دارالحکومت اور کوہستانی جنگلات سمیت کھیت کھلیانوں اور ندی کناروں کی انچ انچ زمین کا دعویدار نواب تھا۔البتہ گندیگار میاں گان اور دیر صاجزادگان کو اس جائیداد پر تصرف کا حق دیا گیا۔

ترکلانی قبیلے کی جائیداد

1895ء میں انگریزوں نے کشمیر اور دوسری ریاستوں کی طرح جندول کو عمرا خان سے قبضہ کر کے نواب دیر خان محمد شریف خان کو اسی ہزار روپیہ کے عوض فروخت کیا۔مست خیل قوم نے دیر حکمرانوں کے ملکیت سے انکار کیا۔ترکلانی قبیلے کی جائیداد جو براول درہ، جندول اور میدان میں واقع ہے ،پر قبضہ کرنے کیلئے ہمیشہ دیر حکمرانوں نے جنگیں لڑیں۔

نواب شاہ جہان نے اقتدار میں آکر جندول اور براول میں کافی جائیدادیں بنائیں اور کئی مست خیل خوانین کو کابل ہجرت کرنے پر مجبور کردیا۔بعد میں نواب کے بیٹے شہاب الدین خان نے جندول میں اپنی حکمرانی کے دوران سینکڑوں جرب جائیداد اپنے نام کرالی۔نواب اور بیٹے کی گرفتاری کے بعد ترکلانی قبیلے نے اپنی جائیدادیں واپس قبضہ میں لے لیں یا حکمران خاندان سے خریدلیں۔

اخون خیل جائیداد

اخون الیاس بابا کی اولاد (اخون خیل) لاجبوک،اباکنڈ ،اپچ کلے، بیبیوڑ، دیر، سمکوٹ شمردین،املوک نار، مانڈلیش اور آس پاس کے علاقوں میں آباد ہے۔اخون الیاس کے دور سے لیکر نواب اورنگزیب کے دور تک ان میں شاہی جائیداد کی تقسیم ہوتی رہی مگر نواب شاہ جہان کے دور میں یہ سلسلہ رک گیا۔اخون خیل کے بزرگ اباکنڈ خانان دعوی کرتے ہیں کہ نواب نے ان کے دس دیہات ہتھیالئے

تھے۔شاید یہی وجہ ہے کہ شاہی وابستگی کے باوجود اخون خیل سیاسی، تعلیمی اور معاشی لحاظ سے اتنا نام نہیں رکھتے ۔اس کے برعکس نواب کے تحصیلداران، صوبیداران اور جمالداران، اخون خیل کی نسبت زیادہ جائیداد اور ثروت کے مالک ہیں۔

نوابِ اوّل خان محمد شریف خان کی اولاد

نواب اول کے چار بیٹے تھے۔نواب اورنگزیب، داروڑہ خان، سنگر خان اور میاں گل جان خان۔ دو بیٹوں سنگر خان اور میاں گل جان کی اولاد میدان کاٹ پائی اور تیسرے صاحبزادے داروڑہ خان کی اولاد چکدرہ مانوگی میں رہائش پذیر ہے۔جنہیں حکومت پاکستان سے تین سو روپیہ فی کس سالانہ وظیفہ ملتا رہا جو کہ اب برائے نام باقی ہے۔

نور محمد (پسر داروڑہ خان) کا کہنا ہے ''میرے والد میرے دادا خان محمد شریف خان سے زندگی بھر گلہ مند رہے۔کیونکہ انھوں نے جائیداد کی صحیح تقسیم نہیں کی۔میرے چچا نواب اورنگزیب نے اپنے بھائیوں کو کسی حد تک جائیداد میں حصہ دیا جسے بعد میں محمد شاہ جہان نے میرے چچاؤں سے قبضہ میں لے لیا۔میرا موجودہ گھر میری والدہ (اوچ خان کی بیٹی) کی مہر جائیداد ہے۔میں اگرچہ نوابزادہ ہوں لیکن میرے پاس شاہی وراثت میں سے کچھ بھی نہیں، بیٹے خلیج میں محنت مزدوری کر کے روزی کماتے ہیں یہی حال باقی نوابزادوں کا بھی ہے''۔

بھائی عالمزیب زیب خان سے جائیداد قبضہ کرنا

1918ء میں جندول عبدالتین خان سے واپس قبضہ میں لیا گیا۔جائیداد کی تقسیم کرتے ہوئے نواب اورنگزیب نے جندول میں بہادری دکھانے پر بیٹے عالمزیب خان کو منڈا قلعہ سمیت کافی جائیداد دی۔1929ء میں نواب شاہ جہان نے بھائی سے جندول قبضہ کر کے اسے منڈا قلعہ سمیت ریاست کی پدری جائیداد سے محروم کر دیا۔

1940ء میں جب نواب نے محسوس کیا کہ انگریز اور دیر کے عوام اس کے بھائی کی حالت زار دیکھ رہے ہیں تو اس نے بھائی کیلئے دس ہزار روپیہ پر گورنمنٹ انڈیا سے مردان میں گرداس نامی ایک گاؤں خریدا۔اور معاہدہ کی رو سے عالمزیب خان کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے دیر کی پدری جائیداد سے محروم کر دیا

گیا۔یادرہے کہ یہ گاؤں گرداس نامی ہندو جواری سے انڈیا سرکار نے قبضہ میں لیا تھا۔

سوتیلے بھائی تیمر خان کی جائیداد

1918ء میں نواب اورنگزیب نے بیٹے عالمزیب خان کی طرح پانچ سالہ بیٹے بخت جہانزیب المعروف بہ تیمر خان کو جائیداد میں حصہ دیتے ہوئے دوشخیلہ، برنگولا اور شگوس کے علاقے دے دیئے۔نواب شاہ جہان نے بعد میں تیمر خان کو ماں کی مہر جائیداد دے کر باقی شاہی وراثت سے محروم کر دیا۔اگر تیمر خان مہتر چترال شجاع الملک کے بھانجے نہ ہوتے تو شاید انھیں یہ جائیداد بھی نہ ملتی۔

محمد نواز خان کو جائیداد سے محروم کرنا

محمد نواز خان نواب محمد شاہ جہان کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔اسے والد نے جائیداد سے محروم کر کے ریاست بدر کر دیا تھا، یوں یہ شہزادہ پرائے دیس میں عام آدمی کی سی زندگی بسر کرنے پر مجبور تھا۔مردان میں نوابزادہ محمد نواز خان کا ایک گھر ہے جو ان کے بیٹوں نے خلیج میں محنت مزدوری کر کے بنایا ہے۔

رعایا اور حکمران کی جائیداد

نواب اورنگزیب کے دور میں شاہی خاندان کی اتنی جائیداد نہ تھی نہ خاندان کے دوسرے حکمرانوں نے جائیداد سازی کا اتنا شوق رکھا۔مگر نواب شاہ جہان نے اقتدار کے اول روز سے جاگیر سازی کو شغل بنایا اور جب اقتدار سے محروم ہوا تو اس وقت تک ریاست کی بیشتر جائیداد یا تو سرکار کے نام تھی یا نواب کے۔

کوہستانی قبائل کی جائیداد (دارالحکومت تا لواری جنگلات سمیت) جو ریاست کا 1/3 حصہ بنتی ہے کا نواب اور اس کے رشتے دار دعویدار تھے۔ریاست کی ساری بازاروں کی جائیداد نواب کی ذاتی ہونے کے علاوہ چالیس قلعوں کے گرد نواح میں ہزاروں جریب زمین بھی سرکار یا حکمران کی ملکیت میں تھی گویا ریاست کی کم وبیش آدھی جائیداد نواب یا سرکار کے قبضے میں تھی۔

جب نواب گرفتار ہوا تو ہیلی کاپٹر سے پرچیاں گرائی گئیں ان میں پیغام آزادی تھا۔جسے پڑھ کر لوگوں نے اپنی جائیدادیں واپس لینے کی تگ ودو شروع کی۔سینکڑوں لوگوں نے عدالت سے رجوع کر کے شاہی خاندان کے خلاف دعوے دائر کئے۔یوں کافی لوگوں کو اپنا حق واپس مل گیا۔آج شاہی خاندان کی جائیداد یا تو افسروں اور وفاداروں کے پاس ہے یا انھوں نے لوگوں پر کم قیمت پر بیچ دیا ہے۔

ریاستی دور میں رعایا کی بود و باش

ریاستی دور کی زندگی

ریاستی دور سے مراد 1969ء سے پہلے کا زمانہ ہے جب ضلع دیر ایک ریاست ہوا کرتی تھی اس دور کو نوابی زمانے کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ آج اور ریاستی دور کی زندگی میں کافی فرق ہے۔ ریاستی دور میں دیر کے لوگ نہایت ہی قدامت پسند تھے اور کٹر پختونوں کی طرح جی رہے تھے۔ پختونوں کی تہذیب اگرچہ ہزاروں سال پرانی ہے مگر دیر میں پختون ثقافت پانچ سو سال سے پرورش پا رہی تھی ریاستی دور میں لوگوں کا رہن سہن، روایات اور رسم رواج آج کی نسبت کافی مختلف تھا۔ گزشتہ چالیس سالوں میں زندگی میں کیا تبدیلی آئی، ہمارے آباؤ اجداد کے تہذیب و تمدن میں کیا فرق آیا۔ یہ اندازہ درجہ ذیل سطور پڑھ کر ہی لگایا جا سکتا ہے۔

معاشرتی نظام

انقلاب سے پہلے دو قسم کے طبقے با اثر اور خوشحال رہے ایک خان اور ملک جو صاحب جائیداد ہوتے تھے۔ دوسرے مذہبی گھرانے جیسے میاں، ساوادہ، سادات وغیرہ ان لوگوں کو خان اور ملک کے آباؤ اجداد سے سیرئی کے طور پر جائیداد ملی تھی۔ جس کی وجہ سے یہ مذہبی اثر و رسوخ کے علاوہ معاشی طور پر بھی مضبوط تھے۔

تیسرے درجے میں ہنرمند، کاریگر اور کسان وغیرہ لوگ تھے جو ان امیروں کی جائیداد پر کسانی زندگی گزارنے، خدمت اور بیگار کرنے پر مجبور تھے۔ معاشی اعتبار سے ان طبقوں میں بڑا فرق پایا جاتا تھا۔ خان اور ملک بعض اوقات ایسے لوگوں کا بہت استحصال کرتے تھے۔ ان سے دعوتوں اور رشتوں ناتوں میں دوری رکھی جاتی۔ یوں نچلے طبقے کے ان لوگوں کی تقدیر بدلنے کی کوئی امید نہ تھی۔

ہنر اور پیشے

نوابی دور میں زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے ہنرمندوں کے نام اور کام کچھ یوں تھے۔

خان صاحب۔ یہ گاؤں کی جائیداد کا مالک ہوتا۔ اس کا اثر و رسوخ اور برادری زیادہ ہوتی۔

ملک صاحب۔ یہ خان کی برادری سے ہوتا۔ اس کی جائیداد اور اثر و رسوخ خان کے نسبت کم ہوتا۔

میاں صاحب۔ یہ خان اور ملک کے بعد معاشی اور مذہبی اثر و رسوخ رکھنے والا ہوتا۔

مولوی صاحب۔اس کی بھی بڑی عزت ہوتی۔یہ گاؤں میں پختونوں کی جائیداد پر آباد اور مذہبی امور نمٹاتا جیسے نماز پڑھانا، نکاح پڑھانا، بچے کی پیدائش پر کان میں آذان دینا۔

ترکھان (ترکانڑ) مکانوں کی تعمیر کے علاوہ ہل اور جوا بناتا تھا۔

درزی یہ لوگوں کیلئے کپڑے سیتا تھا۔

گڈریا (شپونکے) یہ اپنے جانوروں کو پہاڑوں میں چراتا تھا۔

غوبہ یہ گڈریا گاؤں کے مجموعی ریوڑ کو پہاڑوں میں چرانے لے جاتا تھا شام کو لوٹ کر اس کو بدلے میں گھر والے ایک روٹی دیتے تھے۔

لڑبہ یہ گاؤں کے مسجد کیلئے جنگل سے لکڑیاں لاتا بدلے میں ماہانہ ایک وڑی اناج ملتی تھی۔

جولاہا (جولاگان) یہ لوگ اون سے کمبل، لمسے اور لوئی وغیرہ تیار کرتے تھے۔

کلال (کمہار) یہ رباط، اوچ اور ملاکنڈ میں آباد اپنے گھروں میں مٹی سے نفیس برتن تیار کرتے تھے۔

موچی (چمیار) یہ کھسے (پنڑے) اور چپل بنا کر پرانے جوتے بھی مرمت کرتا تھا۔

پراچہ یہ خان اور ملک کے گدھوں اور خچروں پر گوبر وغیرہ کھیتوں تک لے جاتا تھا۔

شاہ خیل یہ چھج بناتا جس سے اناج ہوا میں اچھال کر صاف کیا جاتا تھا۔

نداف (ڈانڈاسی) یہ لحاف کھول کر روئی کو دھونک کر دوبارہ استعمال کے قابل بناتا تھا۔

بٹھیارا (بٹمار) یہ دانے بھون کر بچوں کی جھولیوں میں ڈالتا اور ان سے اپنے حصے کے دانے وصول کرتا تھا۔

تیلی یہ سرسوں سے تیل نکالتا تھا۔

لوہار (اینگر ماما) یہ کسانوں کے آوزار تیز کرتا۔اس کی دکان گھر کے پچواڑے میں ہوتی۔اس کی دکان پر گاؤں کے کسان جمع ہوتے اور خوب گپ شپ لگاتے۔لوہار کو خدمات کے عوض اناج دیا جاتا یوں لوہار کے گھر میں اناج کی کثرت ہوتی۔

چکی والا (ژرندہ گڑے) چکی اکثر ندی کے کنارے یا دریا کے پاس بنائی جاتی۔یہاں کسان مکئی، جو

اور گندم وغیرہ پیسنے کیلئے لاتے اور چکی والا اپنا مخصوص حصہ وصول کرتا۔

حجام (ڈم یا نائی)

یہ لوگوں کی حجامت اور بال بنانے کے علاوہ بچے کا ختنہ بھی کرتا تھا۔ یہ شادی اور ختنے پر ڈھول بجا کر گاؤں والوں کو لطف اندوز کرتا تھا۔ اسی طرح شادی کے موقع پر گاؤں گاؤں جا کر شادی کی دعوت دینا بھی اس کی ذمہ داری تھی۔

تجارت

نوابی دور میں زندگی کے مختلف شعبوں میں پسماندگی تھی۔ تجارت، صنعت وحرفت، جدید مصنوعات اور پررونق بازاروں کا نام ونشان تک نہ تھا۔ لوگوں کے پاس نقدی کی کمی تھی اسلئے بیشتر ضروریات زندگی کی اشیاء جنس کے بدلے جنس کے زریعے حاصل کی جاتیں۔ اس زمانے کے بازار کی حالت کچھ یوں ہوتی۔ ''صبح سویرے ایک دکان کے سامنے ٹین کے نیچے آگ جلائی جاتی۔ لوگ چمڑے کی بوری میں گھی، اون، مرغیاں یا انڈے لاکر دکاندار کو دیئے جاتے اور بدلے میں نمک، ماچس، گڑ اور چائے کی پتی وغیرہ لے جاتے''۔

کھیتی باڑی

ریاستی دور میں معیشت کا دارومدار لوگوں کی کھیتی باڑی سے وابستگی پر تھا۔ سو فیصد گھرانوں کا کھیتی باڑی سے وابستگی کا بڑا ثبوت ریاست میں پھلوں، دودھ یا سبزی کی دکان کا نہ ہونا ہے۔ لوگ زیادہ وقت کھیتوں میں کام کرنے یا لکڑیاں کاٹنے میں صرف کرتے۔ رات کو جلدی سوتے اور صبح مرغ کی آذان کے ساتھ ہی جاگ جاتے۔

دادی ماں پوتے پوتیوں کو لئے چراگاہ کی طرف نکلتی اور بزرگ صحن میں چارپائی پر لیٹ کر کھیتوں کا نظارہ کرتے یا بچوں کو کھیل کود میں مصروف رکھتے۔ کیونکہ انکی مائیں مویشیوں کو چارہ ڈالنے یا لسی (شولے) تیار کرنے میں مصروف رہتیں۔

اس دور کی غذائیں خالص ہوتی تھیں لوگ چشموں کا تازہ پانی پیتے اور چائے کی پتی مہنگی ہونے کی وجہ صرف امراء استعمال کرتے تھے۔ صبح کا ناشتہ عموماً چاول لسی (اُگرہ) سے کیا جاتا۔ دوپہر کا

سالن سبزی ٹماٹر کڑی (لاونڑ) یا دال سبزی مکس سالن (پتی) ہوتا تھا۔ گندم کی بجائے جو (ورښے) یا مکئی (جوار) کی روٹی کھائی جاتی تھی۔ جاڑے میں آٹے سے حلوہ تیار کیا جاتا جسے ''لیٹئی'' کہتے ہیں جس میں دیسی گھی کا بکثرت استعمال کیا جاتا۔

اشر

یہ بڑا افسوسناک امر ہے کہ آجکل پختون بعض قابل فخر روایات کو بھلائے جا رہے ہیں۔ خاص کر شیخ ملی دفتر کی بعض روایات کو ماضی کا حصہ دیکھ کر پختونوں کو خون کے انسو رونا چاہیے۔ 1523ء میں شیخ ملی جرگہ میں پختون سرداروں نے زندگی کو پرامن اور آسان بنانے کیلئے کچھ اصول وضع کئے ان اصولوں پر چلتے ہوئے پختون ولی قابل فخر تھی اور کئی قومیں پختونوں کی زندگی پر رشک کرتیں۔

پختونوں کی ان روایات میں ''اشر'' باہمی الفت، ہمدردی کی عمدہ مثال ہے۔

اس زمانے سارا زرعی کام ہاتھوں سے اور بڑا مشکل ہوتا۔ جس گھر میں کم مرد ہوتے ان کیلئے زرعی کام کاج آسان بنانے کیلئے اشر کا نظام وجود میں لایا گیا۔ اشر کی روایت سے گاؤں کے مشر کی پکار پر ہر گھر سے ایک ایک بندہ نکلتا، اتفاق سے سب گاؤں والے ملکر نمبر وار فصل کاٹتے، مکان تعمیر کرتے، مجرم اور قاتل کو سزا دے کر ان کا گھر جلاتے، شادی کے موقع پر سارا کام کاج گاؤں کے جوان کرتے۔ کوئی فوت ہو جاتا تو تجہیز و تکفین کا کام گاؤں کے لوگ سرانجام دیتے اور سوگوار خاندان صرف تعزیت کرنے والوں سے ملتا۔

ایک کسان اس زمانے کے اشر کا حال یوں بیان کرتا ہے۔ ''جب مکئی کی فصل کٹتی تو کچھ عرصہ بعد بھٹے سے دانے جدا کرنے کیلئے صبح سویرے گاؤں والے چار پائیاں لاتے۔ پیداوار کی مقدار کے مطابق بارہ تا سولہ چارپیاں دائرے میں ایک دوسرے سے باندھی جاتیں۔ زمیندار کی ساری فصل (وگی) ڈال کر، درجنوں کسان ڈنڈے لیکر میدان میں کود پڑتے۔ اور خوب جوش اور ولولے سے بھٹوں سے دانے جدا کرتے۔

اسی طرح دھان کی فصل کاٹ کر کسان پیداوار کو میدان (درمند) میں جمع کرتا۔ گاؤں کے کسانوں سے بیل جمع کر کے کسان صبح کی تاریکی میں پندرہ بیس بیل لئے اپنی فصل پر گھماتا رہتا۔ یوں کئی گھنٹے مسلسل یہ بیل گھوم گھوم کر اناج اور بھوسے کو جدا کرتے۔ دوپہر کو کسان کے پاس باقی کسان آکر فصل

گھر تک پہنچانے اور بھوسے کا انبار (ٹوپ) بنانے میں ساتھ دیتے۔ اس زمانے میں زرعی کام کاج بڑا کٹھن اور مشکل تھا مگر اتفاق اور مل جل کر کام کرنے سے سب کچھ آسان ہو جاتا۔

چھوٹا سا گھر

ریاستی دور میں سارے مکان گارے سے بنائے جاتے تھے۔ خان اور ملک کا مکان کئی کمروں جبکہ عام کسان کا مکان ایک بڑے کمرے پر مشتمل ہوتا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس ایک کمرے میں پورا کنبہ رہائش رکھتا۔ ''اشر'' پختون معاشرے کی ایک قابل فخر ثقافت ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر بلا معاوضہ کام کرنے کو ''اشر'' کہا جاتا تھا۔ جب نئے مکان کی ضرورت پیش آتی تو نائی (ڈم) کے نقارے کی آواز پر گاؤں کے لوگ جمع ہو جاتے۔ ذوق وشوق سے کام کرتے اور شام تک پتھر، غوڑا سکی، سلیپر اور گارے سے گھر تیار ہو جاتا۔

روایتی مکان میں ایک کونے میں مال مویشی کی جگہ (غوجل) ہوتی۔ ساتھ ہی آگ جلانے کی جگہ ''انغرے اور ''چرگئی'' ہوتا۔ بعض پہاڑی مکان دومنزلہ بنائے جاتے جن میں نچلی منزل پر مویشی رکھے جاتے۔ کونے میں اناج رکھنے کیلئے مٹی سے خمبہ ''کندو'' بنائے جاتے تھے۔ برآمدے میں صندوق، گھڑوں اور مٹکوں کے علاوہ بچے کا جھولا (زانگو) بھی گھر کا ایک اہم جز ہوتا۔

مکان کے مرکزی دورازے سے داخل ہوتے ہی دائیں جانب شہد کی مکھیوں کا چھتہ ہوتا، ایک طرف روٹی پکانے کا تندور اور دوسری طرف مرغیوں کا ڈربہ ہوتا تھا۔ جس کے سامنے کتا باندھنے کی جگہ ہوتی۔ پہاڑی گھروں میں سامنے دیوار نہ ہوتی یوں کھیت کھلیان اور خوبصورت نظارے نظر آتے۔ مکان کے باہر چوپال (سپر یا منا) ہوتا جن کے نیچے مویشی باندھے جاتے۔ جب گرمی کا موسم آتا تو اس چوپال سے انگور کے گچھے لٹکتے نظر آتے۔ موسمی لحاظ سے ان مکانات کی خصوصیت یہ تھی کہ گرمیوں میں سرد اور سردیوں میں گرم ہوتے تھے۔ دیر بالا کے پہاڑی درّوں، نہاگ درّہ، عشیرئی درّہ اور کوہستان میں اب بھی یہ خوبصورت مکانات دیکھے جاسکتے ہیں۔

ریاستی دور کی عورت

اس دور کی عورت کی زندگی محنت اور لگن سے عبارت تھی۔ آج کی عورت کی نسبت اسے آرام کا کم وقت ملتا۔ وہ بندوق چلانا جانتی تھی اور باہمی تنازعات میں مردوں کی ہم رکابی کرتی تھی۔ فجر کی اذان سے پہلے جاگ کر تھان (غوجل) سے مال مویشی کا گوبر صاف کر کے ٹوکری میں بھر کر کھیتوں میں لے جاتی یا ان کے اپلے (سپیاکے) بناتی۔

واپسی پر مویشیوں کو چارہ ڈال کر گائے بکریوں کا دودھ دوہتی۔ بہو یا بیٹی زیادہ تر لسی چاول (اُگرہ) سے ناشتہ تیار کر کے، پالتو کتے اور مرغیوں کو پنجرے سے آزاد کرتی۔ مرد کھیتوں کی راہ لیتے تو گھر کے برتنوں کو سلیقے سے رکھنے اور جھاڑو دینے کے بعد بالوں میں کنگھی کر کے لٹ (کم سئی) بناتی۔ اگلا مرحلہ گندم اور مکئی پیسنے کا ہوتا۔ چکی (میچن) پر گندم پیستی یا جو (وربشی) کو اوکھلی (بغرئی) میں ڈال کر موسلے سے کوٹتی۔ آٹا گوندھ کر جھولے کی طرف لپکتی، بچے کو دودھ پلانے اور اسے سلانے کے بعد گھڑا لیکر پن گھٹ (گدر) سے پانی بھرنے جاتی۔

کھیتوں میں سے ساگ (سابہ) سبزی یا آنگن سے کدو توری کاٹ کر پکانے کیلئے ہانڈی (کٹوی) چڑھاتی۔ تندور گرم کرنے کیلئے گھر کے نزدیک ذخیرے (دلئی) سے لکڑیاں لا کر روٹی پکاتی۔ جیسے ہی ساگ شوربہ پکتا۔ نند یا دیورانی مٹکے میں مدھانی (مندانڑو) چلا کر دہی سے لسی اور مکھن تیار کرتی۔ جب کھانا تیار ہوتا تو سر پر گھڑے میں لسی، ہاتھ میں روٹی اور سالن لئے وہ کھیتوں میں لے جاتی۔

کھیتوں سے لوٹ کر سہ پہر کو عورت پھر پانی بھرنے کے لئے نکلتی تو جتھانی یا نند درانتی لے کر پہاڑی سے لکڑی اور گھاس پھوس لاتی۔ شام ہونے پر اگرچہ عورت کا بدن کام سے چور چور ہوتا۔ مگر سورج ڈھلتے ہی جب مرد ہل لادے بیل لوٹاتے تو عورت خندہ پیشانی سے سنبھالتی اور بیلوں کو باندھتی۔ شام ہوتے ہی تندور سے دھوئیں کی گھٹائیں بلند ہوتیں۔ بعض عورتیں چولھے میں پھونک مار مار کر سالن تیار کرنے میں مصروف ہوتیں۔

اتنی مصروفیات کے باوجود اس دور کی عورت چراغ کی روشنی میں بیٹھ کر دستکاری کرتی تھی۔ عورت دستکاری میں بہت ماہر ہوتی تھی۔ ٹوپی، ناڑے، پنکھے اور کپڑوں کی سلائی وہ اپنے میکے پر سیکھتی

جس کی بدولت اسے سسرال میں بہت عزت ملتی تھی۔ماں کی کوشش رہتی کہ دست کاری کے علاوہ بیٹی کو اس قابل بنائے کہ سسرال میں مشکل کام کاج کو بھی سنبھال سکے۔اس زمانے میں خوبصورتی کی بجائے لڑکی کی گھرداری میں مہارت کو ترجیح دی جاتی تھیں۔اور رشتے ایسی لڑکیوں کیلئے زیادہ آتے تھے جو دستکاری اور گھریلوں کام کاج میں ماہر ہوتی تھیں۔

جرگہ

جرگہ پختون مشران کی کونسل ہوتا ہے۔نوابی دور میں دیر میں جرگہ سسٹم کی بہت اہمیت تھی۔ گاؤں میں جب کوئی دشمنی،اغوا یا جائیداد کا مسئلہ پیدا ہوتا تو اس کیلئے قبیلوں کی نمائندگی کرنے والے مشران پر مشتمل جرگہ تشکیل دیا جاتا۔جرگہ دانشور اور ذہین بزرگوں پر مشتمل ہوتا۔خالی زمین پر چادریں بچھا کر یہ عمائدین پیچیدہ تنازعات کا فوری حل نکالتے۔

مہمان نوازی

نوابی دور میں مہمان نوازی اپنی مثال آپ تھی۔شادی یا دوسری دعوتوں میں مہمان کئی کئی دن ٹھہرتے۔اگر کوئی شخص دشمن سے بچنے کیلئے کسی گھر میں گھس جاتا تو گھر والے مورچہ زن ہو کر اجنبی کیلئے اپنی جان تک دینے پر تیار ہو جاتے۔

گاؤں میں ایک مشترکہ حجرہ ہوتا۔اس حجرے کی رکھوالی کوٹوال کرتا،یہ شخص مہمانوں کی خاطر تواضع اور بستر وغیرہ کا بندوبست کرتا۔شام کو لوگ کھیتوں سے لوٹ کر حجرہ میں جھانک کر دیکھتے۔جب وہ مہمان کو پاتے تو گھر جا کر لسی،گھی یا ساگ لا کر مہمان کو پیش کرنے میں سبقت لے جانے کی کوشش کرتے۔سردی میں حجرے میں آگ جلائی جاتی۔رات کو کسان،کلال،اینگر،شپونکے،ترکھان وغیرہ یہاں جمع ہو کر مختلف موضوعات پر گپ شپ لگاتے۔بزرگ گھروں کی راہ لیتے اور جوان ستار منگے کی موسیقی سے رات گئے تک لطف اندوز ہوتے،یہی وہ محفلیں تھیں جو تھکے ہارے محنت کشوں کو ایک نئی روح اور طاقت عطا کرتی تھیں۔

شادی

اس زمانے میں لڑکی اوسطاً چودہ اور لڑکا سولہ تا اٹھارہ سال کی عمر میں شادی کے بندھن میں بندھ جاتا تھا۔ رشتے میں جوڑے کی رضامندی معلوم کرنا تو درکنار انھیں اطلاع تک نہیں دی جاتی تھی ۔منگنی کے بعد لڑکی منگیتر اور اس کے تمام گھر والوں سے خوب پردہ کرتی تھی۔ اس زمانے میں اخلاق، ہنر مندی اور گھر داری ہی انتخاب کی شرائط تھیں۔ یہ سمجھئے کہ سیرت کو صورت پر فوقیت دی جاتی۔ کمال اور حیرانی کی بات یہ تھی کہ یہ شادیاں بے حد کامیاب رہتیں۔ اسلئے کسی لڑکی کا گھر پر کنواری بیٹھے رہنے کا تصور ہی نہیں تھا۔

شادی کے دن کا تعین ''عیدہ'' کہلاتا۔ گاؤں کا حجام دولہا کے گھر والوں کی طرف سے رشتہ داروں کو شادی کی دعوت دیتا تھا۔ شادی میں نزدیک رشتہ دار چند دن پہلے ہی پہنچ جاتے۔ شادی کے اخراجات آج کی نسبت کافی کم تھے۔ سارا خرچہ دولہے کے گھر والوں کے سر ہوتا۔ بارات کے پہنچنے سے پہلے دلہن کے گھر والوں کو نقدی اور خورد و نوش کی اشیاء فراہم کی جاتیں۔

گویا شادی کا بوجھ دلہن والوں پر کم ہوتا، اس زمانے کا جہیز بہت کم ہوتا تھا۔ جہیز میں ایک چارپائی، ایک لمسے، لحاف، لوٹا، پنکھا (بوزے) اور لکڑی کا چھوٹا بکس ہوتا جسے دلہن پرس کے طور پر استعمال کرتی۔ لڑکے کے گھر والے ایک ٹوکری میں سرخ جوڑا، آئینہ، کنگھی اور میز پوش لاتے جس کی باراتیوں کے سامنے سرعام نمائش کی جاتی۔

ڈھول سرنا بجانا

اس زمانے میں ڈھول سرنا (سرنے نغارے) ہر شادی میں بجایا جاتا تھا۔ ڈھول سرنا والے مورثی طور پر یہ فن جانتے تھے۔ ایک یا دو جوڑے رقاصائیں (ڈمے)، سازندے، سرنا چی ماما، ایک طبلہ نواز (دوپڑی مار) شادی میں دھوم دھام کا باعث ہوتے۔ ان کو دیکھنے کیلئے دور دور سے لوگ پیدل سفر کر کے آتے تھے۔

تماشبین نوجوان دانتوں کو دنداسہ سے صاف کئے، سر پر تیل لگائے، مونچھوں کو تر کئے سر پر ترچھی ٹوپی سجائے مزے سے سر ہلاتے تھے۔ گلوکار کے کسی ٹپے پر جوش میں آکر بعض لڑکے ناچنا شروع

کرتے اور کچھ بندوق اٹھا کر ہوائی فائرنگ کرتے۔ بچے خالی کارتوس ''توتے'' پکڑنے کیلئے دھکم پیل میں مصروف رہتے تا کہ بعد میں ان سے کھیلیں۔

بارات

فاصلہ خواہ کتنا بھی دور ہوتا بارات کو پیدل ہی جانا پڑتا۔ دو تین سو مہمانوں پر مشتمل بارات سے ڈھول سرنا والے آگے ہوتے۔ دلہن کے گھر کے نزدیک پہنچ کر دولہا کے دوست اور رشتہ دار جوان ناچنا شروع کر دیتے۔ خوب موج مستی کر کے جب بارات لڑکی کے گھر داخل ہوتی تو باراتیوں کی خوب خاطر تواضع کی جاتی۔ ڈھول باجوں کا تماشہ باہر میدان میں ہوتا اور لڑکیاں اندر بھنگڑا ڈالتیں۔ کئی عورتیں روایتی دف اور نقارہ (تمبل نغارہ) کے ساتھ گیت گاتیں۔

اس زمانے کے چند مشہور لوک گیت

میا گنی سیند پہ چپو دے	اوبیڑئی بند ولاڑی دینہ
ا و زہ پناولاڑہ یمہ	ھلکہ بلئی مہ نڑہ وہ ویشتے می نہ شے
اوجینکئی اوبو لہ زینہ	دبنگلے د سر ھلکہ گولئی پہ وار کہ

لڑکی کا گھر قریب ہی کیوں نہ ہوتا باراتی رات ضرور گزارتے۔ اگلے روز بارات کی واپس پر عورتیں برقعے ڈھونڈنے لگتیں تو دلہن رونے لگتی، سہیلیاں اسے دلاسہ دیتیں۔ جو لڑکی زیادہ روتی اسے با اخلاق، باحیاء اور عزت دار سمجھا جاتا۔ دلہن کو ڈولی میں ڈالنا ایک مشکل کام تھا۔ بھائی، چچا اور ماموں کچھ دلاسہ دلا کر اور کچھ زور کا استعمال کر کے دلہن کو ڈولی میں بٹھاتے۔ ساتھ چھوٹا بچہ بھی بٹھایا جاتا۔ ڈولی کو چار مرد کندھوں پر اٹھا کر چل پڑتے، تھک جانے پر دوسرے مرد، ان کی جگہ ڈولی کو اٹھا لیتے۔ اس طرح ڈولی کو کئی میل تک پیدل لے جانا پڑتا۔

دیر میں ایک دلچسپ روایت یہ بھی تھی کہ جب باراتی ڈولی لیکر گاؤں سے رخصت ہوتے تو لڑکے پتھروں سے جھولیاں بھر کر ان کا راستہ روکتے۔ جب تک باراتی انھیں نقدی وغیرہ نہ دیتے یہ اڑے رہتے یوں بارات والے پتھروں کی بارش کے خوف سے انھیں کچھ نہ کچھ دے کر راستہ صاف کراتے

یہ روایت قریباً ساٹھ ستر سال پہلے جاری وساری تھی۔

ایک دوسرا رواج یہ تھا کہ جب دلہن کا بناؤ سنگھار کیا جاتا تو اس دوران باراتی گھر سے قریباً سو ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر چھوٹا آئینہ رکھ کر اسے نشانہ لگاتے۔ کئی نشانہ باز یہاں اپنی مہارت آزماتے اور جب تک آئینے کو گولی سے اڑا نہیں دیا جاتا تھا تب تک بارات رکی رہتی۔ یہ رواج قریباً بیس سال قبل ختم ہو گیا ہے۔

آئینہ پر نشانہ ٹھیک بیٹھتا تو سیٹھیاں اور تالیاں بجائی جاتی، ڈھول سرنا والے ایک بار پھر موسیقی کا بازار گرم کرتے اور بارات کی روانگی شروع ہو جاتی۔ یہ بارات پیدل چلتے چلتے ڈھول سرنا کے ساز میں دلہا کے گھر کے پاس پہنچتی تو دادی ماں خشک پھلوں کی ٹوکری لئے چھت پر انتظار میں ہوتی۔ جیسے ہی باراتی چوکھٹ پر قدم رکھتے اوپر سے خشک میوے مونگ پھلی، اخروٹ، چلغوزے اور بادام پھینکے جاتے۔ خشک پھلوں کی بارش تلے بچے، اخروٹ اور بادام جمع کرنے کی تگ و دو میں لگ جاتے۔ اور اس طرح ایک شور وغوغا کا سماں بندھ جاتا تھا۔

خوشی کی ان محفلوں اور قہقہوں سے بہت دور دولہا بیچارہ کہیں جنگل میں چھپا رہتا۔ ایک تو شرم کے مارے وہ سامنے نہیں آتا تھا اور دوسرے دوست اور ساتھی اس کے تعاقب میں رہتے۔ جیسے ہی دولہا ان کے ہتھے چڑھ جاتا تو چند ہی لمحوں میں اس کے کپڑے تار تار نظر آتے۔ شادی پر آئے ہوئے مہمانوں کی گوشت، چاول اور پلاؤ سے ضیافت کی جاتی۔ اسی طرح یہ شادی ایک ہفتے تک جاری رہتی خالاؤں، بہنوں اور پھوپیوں وغیرہ کے علاوہ دور کی رشتہ دار بھی وہاں ٹھہرتیں۔ رواج کے مطابق گاؤں والے باری باری صبح شام ان مہمانوں کو دعوت کھلاتے۔

بچے کی پیدائش

ریاستی دور میں لڑکی کی نسبت لڑکے کو ترجیح دی جاتی۔ بچے کی پیدائش کے موقع پر گاؤں کی عمر رسیدہ اور بزرگ عورت دائی کے طور پر خدمت انجام دیتی۔ نومولود کی خبر پاتے ہی بچے کا والد بندوق اٹھاتا اور بالکونی پر کھڑے ہو کر فائرنگ کرتا۔ گاؤں کے بچے رشتے داروں کے پیچھے دوڑتے پھرتے تاکہ انھیں یہ خوشخبری سنا کر نقدی وصول کریں جسے ''زیرے'' کہا جاتا۔

پوتے کی خبر پا کر دادا خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔لاٹھی اٹھا کر وہ گاؤں کے مولوی کے پاس پہنچتا تاکہ بچے کے کان میں آذان دے۔ساتویں دن بچے کا نام رکھا جاتا۔بچے کا عقیقہ (سرخرے) کیا جاتا۔اسلامی ناموں کی بجائے روایتی نام رکھے جاتے۔جیسے فجنی ،لالی ،کاکی ،غٹ خان ،ور کوٹے خان ،ولی ،کچ خان اور نظر بد سے بچنے کیلئے درختوں اور پودوں کے نام بھی رکھے جاتے جیسے ،انزر گل ،خونہ گل ،تازہ گل ،لو گے ،چینار وغیرہ۔

انتقال

بزرگ لمبی عمر پاتے،شوگر،سرطان،دل کے امراض کی بجائے زیادہ عمر ہی فانی دنیا سے کوچ کا سبب بنتی۔بہت سے بزرگ اوسط اسی سال سے زائد زندگی جیتے اور بعض بزرگ جب زیادہ ضیف العمر ہو جاتے تو جان کنی کی حالت میں آسانی کیلئے کالی چادر (تور سادر) کا ختم ہوتا۔ضعیف العمر بزرگوں کا آخر عمر میں بہت خیال رکھا جاتا اور انھیں حد سے زیادہ پیار ملتا۔

کسی کے فوت ہونے پر گاؤں کا ایک آدمی اونچی بالکونی پر کھڑے ہو کر گاؤں والوں کو خبردار کرتا۔جسے سن کر کھیتوں میں کام کرنے والے کام چھوڑ کر میت کے کفن دفن میں سبقت لے جانے کی کوشش کرتے۔اس زمانے میں رشتہ دار میت پر بہت بین کرتے۔دوسری رسومات کے علاوہ اسقاط بھی اس زمانے کا ایک رواج تھا۔میت کو قبر میں رکھ کر اوپر تختے اور مٹی ڈالنے کے بعد چاروں طرف لکڑی کے تختے بھی لگائے جاتے تاکہ برف اور بارش کی صورت میں قبر سلامت رہے۔

اس دن بیل ذبح کر کے رشتہ داروں کو کھلایا جاتا۔مسلسل تین شام میت کے نام پر مسجد کو حلوہ بھیجا جاتا۔جمعہ آنے پر بڑی خیرات کا بندوبست کیا جاتا۔چہلم پر خیرات ہوتی جس میں دور کے رشتہ دار بھی آتے جس کو "سلو ختمہ" کہا جاتا۔سال بعد خیرات "تلین" اور بعض لوگ سالہا سال خیرات کرتے اس زمانے کی اولاد زندگی میں بڑوں کی عزت کرتی،بہت سا پیار دیتی۔بزرگ وفات پاتے تو زندگی بھر دعاؤں میں یاد رکھتی۔قبرستان جا کر حاضری دیتی اور قبروں کی مرمت کرتی۔

کھیل کود

رسم حرب العید (سنگ باری)

آج سے ستر اسی سال پہلے دیر اور سوات میں ایک عجیب کھیل مروج تھا۔ جسے نواب شاہ جہان نے دیر اور بادشاہ صاحب نے سوات میں ختم کیا۔ یہ کھیل دو قبیلوں کے مابین کھیلا جاتا۔ ہوتا یوں کہ عید کے روز گاؤں کے لوگ ایک مقام پر جمع ہو جاتے۔ دوسرے گاؤں کے لوگ ندی کے اس پار قریباً دو سو گز کے فاصلے پر سامنے آتے۔ ہر کھلاڑی کے پاس گھپانی (مرچوغنہ، مچوغندہ) ہوتی۔ گاؤں کا ایک بزرگ نعرہ لگاتا جسے سنتے ہی دونوں طرف سے سنگ باری شروع ہو جاتی۔ یہ کھیل کئی گھنٹے جاری رہتا۔ پتھروں کی بارش میں جو کھلاڑی زخمی ہو جاتا یا مر جاتا تو اسے ''توئے'' سمجھا جاتا مطلب نہ دشمنی اور نہ خون بہا۔ اس کھیل میں ہر سال بہت سے کھلاڑی زخمی ہو جاتے یا جان بھی گنوا دیتے۔

نہاگدرہ کا ایک گاؤں ٹینٹئی اس کھیل کیلئے کافی مشہور تھا۔ عجیب بات تو یہ ہے کہ کھیل کے دن گاؤں کی لڑکیاں دف (ټمبل) بجا کر کھلاڑیوں کو جوش اور ولولہ دلاتیں۔ اس زمانے میں کھلاڑیوں کو داد دینے کیلئے دوشیزائیں یہ لوک گیت گاتی تھیں۔

ټینټئی لا لاړ شه جنګ پرې اوکړه   چه راته جوړ نه کړې د جونو پیغورونه

(ٹین ٹئی کے میدان میں جا کر جنگ لڑو ایسا نہ ہو کہ گاؤں کی جواں دوشیزائیں مجھے طعنہ نہ دیں)۔

سخے

دیر کے عوام کا قدیم ترین کھیل ''سخے'' تھا۔ سخے کا مطلب ہے گائے کا بچہ۔ گاؤں کے میدان میں کھیلے جانے والے اس دلچسپ کھیل میں نوجوانوں کے علاوہ چاق و چوبند عمر رسیدہ لوگ بھی حصہ لیتے۔ اس کھیل میں طاقت اور پھرتی کا مظاہرہ ہوتا اور تندرست اور پہلوان کھلاڑی پوائنٹس حاصل کرنے پر خوب داد وصول کرتے۔

کھیل کے میدان کے وسط میں ایک لکیر کھینچی جاتی دونوں طرف سے چھ چھ کھلاڑی شرکت کرتے۔ ہار جیت کا انحصار مٹی کے ٹیلے پر ہوتا جو ''ډوبه سئی'' کہلاتا (یہ ٹاس ہارنے والی ٹیم کے طرف

بنایا جاتا)۔ ٹیم میں ایک کھلاڑی خاص اس ٹیلے کی حفاظت پر مامور رہتا جو کہ سخے (بچھڑا) کہلاتا جبکہ مخالف ٹیم میں ایک کھلاڑی اس ٹیلے کو گرانے کی کوشش کرتا جو سخی (بچھیا) کہلاتا۔

کھیل کی شروعات سیٹیوں اور تالیوں سے ہوتی۔ سارے کھلاڑی ایک ایک پاؤں اٹھائے رکھتے کیونکہ پاؤں کا چھوٹ جانا یا زمین سے لگنا ایک فاول تھا۔ دونوں ٹیموں کے کھلاڑی چھلانگیں لگاتے آگے بڑھتے ہر کھلاڑی مخالف سے گتھم گتھا ہو کر پنجہ آزمائی کے ذریعے گرانے کی کوشش میں لگا رہتا۔ اس دھکم پیل میں سخی کھلاڑی ڈوپہ سئی گرانے کیلئے دوڑ پڑتا، ادھر نگہبان سخے کھلاڑی پاؤں جما کر سینہ تھان کر ڈوپہ سئی کے پاس کھڑا رہتا۔ جیسے ہی سخی آگے بڑھتا تو سخے سامنے آکر اس سے الجھ پڑتا تا کہ ڈوپہ سئی گرانے سے پہلے سخی کو گرا سکے یا اس کا پاؤں زمین سے چھو جائے۔

پوائنٹس

جب سخی، سخے کی بھرپور مزاحمت میں ٹیلہ گرانے میں کامیاب ہو جاتا تو اسی طرح کھیل کا ایک راؤنڈ ختم ہو جاتا اور سخی کی ٹیم ایک پوائنٹ حاصل کرتا اور اگر سخے ٹیلہ گرانے سے پہلے سخی گرانے میں کامیاب ہو جاتا تو پھر پوائنٹس اس ٹیم کو مل جاتا۔ اس کھیل میں پانچ راؤنڈ ہوتے پہلے راؤنڈ کے خاتمے پر مخالف ٹیم سے جیتنے والی ٹیم کیلئے رشتہ مانگا جاتا جو ''تپوس'' کہلاتا۔ دوسرا راونڈ جیتنے پر اس ٹیم کے پوائنٹس کو ''منگنی'' کا نام دیا جاتا۔ اسی طرح ہر راؤنڈ کے جیتنے پر شادی کی رسومات پوری کی جاتیں۔

پانچ راؤنڈ ختم کر کے دونوں ٹیمیں اپنی اپنی طرف جا کر کھڑی ہو جاتیں۔ ہلسی مذاق میں جیتنے والی ٹیم کے کھلاڑی ہاتھوں میں ہاتھ دے کر ایک دائرہ بناتے جو ''ڈولئی'' کہلاتا۔ یہ ٹیم ہارنے والی ٹیم میں جا کر ایک کھلاڑی کو دلہن بنانے کیلئے چن لیتے۔ کھلاڑی کو ہاتھوں میں یعنی ڈولئی میں لئے جیت والے اپنے میدان میں لاتے۔ اس پر سارا میدان تالیوں سے گونج اٹھتا، سیٹیاں بجتیں اور بوڑھے بھی جواں دلی سے کھیل کا مزہ دوبالا کر دیتے۔ یہ کھیل ختم ہونے پر دلہن کھلاڑی کا مذاق اڑایا جاتا اور لوگ اس سے لطف اندوز ہوتے۔

شب قدر اور عید کے کھیل

شب قدر سے ایک دن پہلے لڑکیاں تار والے کپڑے سے گیند بنا کر ہی لیتیں پھر اسے تیل میں رکھا جاتا اس گیند کو "غونڈو سکے" کہا جاتا۔ شام ہوتے ہی اس کو آگ لگائی جاتی۔ لڑکیاں بچے اور جوان اس کھیل میں گیند کو پورے زور سے آسمان کی طرف اچھالتے۔ اس کھیل میں جہاں بچوں کے کپڑے اور بال جلنے کا خطرہ رہتا وہاں اس گیند کو چرانے جب دوسرے گاؤں سے شرارتی لڑکے آتے تو نوبت لڑائی جھگڑے تک پہنچ جاتی۔

بچوں کے کھیل

نوابی دور میں بچوں کا ایک الگ ہی انداز اور رنگ ڈھنگ تھا۔ اس زمانے میں گاؤں کے میدان میں بچے جمع ہو کر کھیل کھیلتے۔ کھیل میں بڑا جوش و خروش دکھائی دیتا۔ شام کے وقت بچے گاؤں کے میدان میں جمع ہو کر ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ دیتے اور کہتے۔ داژرنده ماتوم ،سپاهی ته با آواز کوم . بعض بچے کودتے چھلانگیں لگاتے نعرے لگاتے "نـانـا نـه کیگی نخره ترے نه جوڑیگی .شاپن پنه کے پن پنه کے غاژه ده منگی ،ټوپئی د پرنگی.

اکـوبـگـو سـر سینـد گـوغـوا می لاژه پـه تـرپـگـو، اباسین بیژنی بیژنی پکی ناسته دورخـانـئـی،دورخـانـئـی خوری راوزه په لستونژی کی دی سه دی .خواگه دی که تراخه دی .عالی شرنگی ڈبه لنی ۔

جب صبح سورج کی کرن پھوٹتی تو وادی مال مویشیوں کو لیکر چراگاہ کی راہ لیتی اور پہاڑی کے دامن میں بوڑھیوں سے گپ شپ لگانے کے ساتھ پلو میں گھاس پوس اور جڑی بوٹیاں جمع کرتی۔ پوتے ہم جولیوں سے اخروٹ کے دانوں پر ٹنگل نامی کھیل کھیلتے یا غلیل سے پرندے شکار کرتے۔ اور بچیاں روایتی کھیل "میرگائی" یا "سینگو" کھیلتی تھیں۔

فصل کی کٹائی کے کھیل

تالاش اور ادینزئی کے علاقوں میں جب کسان فصل کاٹ لیتے تو جوان اور بزرگ فصل کے میدانوں میں جمع ہوتے۔ نشانہ بازی، گولہ پھینکنے، ٹنگل، ستے، ڈبلئ جیسے کھیلوں کا ایک میلہ سا لگ جاتا۔

سب سے دلچسپ رسہ کشی ہوتی۔عمر رسیدہ کسان گھاس (پلالہ) سے ساٹھ گز لمبی موٹی رسی بنتے ،گاؤں کے لوگ دو حصوں میں بٹ جاتے۔نہ رشتے کی تمیز اور نہ عمر کی حد، بلکہ باپ بیٹا ایک طرف تو دادا اور چچا دوسری جانب سے زور آزمائی پر اتر آتے۔

جب سارے کھلاڑی پوزیشن سنبھال لیتے تو ایک کسان کی آواز پر مخالف سمتوں میں رسی کھینچنے کا عمل شروع ہو جاتا۔ڈھول سرنا کے ساز میں کھلاڑی خوب زور لگاتے۔جب رسہ ایک طرف ایک خاص حد تک کھینچ لیا جاتا تو اسے اس طرف کے کھلاڑیوں کی جیت تصور کیا جاتا۔اور جیتنے والے تماشائیوں سے خوب داد حاصل کرتے۔یہ دن کافی پر رونق ہوتے اور تھکے ہارے کسان خوب مسرور ہوتے۔

انقلاب کے آٹھ سال بعد بھی دیر و جی گوروں کے جدید کھیلوں سے نا اشنا رہے۔1968ء میں بمقام چکدرہ جدید کھیل متعارف کرانے کیلئے کھیلوں کا ایک میلہ منعقد کیا گیا۔1977ء کے لگ بھگ اکبر خان نے تیمر گرہ میں کرکٹ کا کھیل متعارف کرایا۔

لباس، جوتے اور زیورات

عام آدمی ایک یا دو جوڑے لباس رکھتا، رنگ اڑ جانے پر زیتون کا رنگ دیا جاتا یہ کپڑے ''الم دراز، لٹہ اور مارکین'' کہلاتے تھے۔قمیص چھوٹی، شلوار کھلی اور لمبی، پائنچے بارہ تا چودہ انچ، آستین سادہ اور کالر بڑے ہوتے تھے۔عورتوں کے لباس میں قمیص ڈھیلی ڈھالی اور لمبی جبکہ بوڑھی عورتوں کی آستینیں اتنی چوڑی ہوتیں کہ ایک چھوٹے بچے کو ان میں جھولا جھلایا جا سکتا تھا۔کپڑوں میں پیوند کو عار نہیں سمجھا جاتا تھا۔(کپڑوں میں دوسرے کپڑے کا ٹکڑا لگانا پیوند کہلاتا تھا)۔

ٹوپی پہننا نواب کی طرف سے لازمی قرار دیا گیا تھا۔چاڑا نواب کے دور میں بزرگ روایتی پگڑی (پٹکے) باندھتے تھے۔لیکن شاہ جہان کے دور میں کپڑے کی کمی کی وجہ سے یہ ناپید ہوتی گئی۔عورتیں بڑی ہنرمندی سے ٹوپیاں تیار کرتیں۔تیلہ دار ٹوپی بہت مشہور تھی۔خال سفید ٹوپی اور دستکاری کیلئے مشہور تھا۔چترالی پکول کا استعمال بھی عام رہا۔بچے کے لئے روایتی ٹوپی بڑی سلیقہ مندی سے تیار ہوتی جس پر کشیدہ کاری کے علاوہ تعویذ لٹکائے جاتے۔

دیر کا قدیم ترین جوتا ''کھڑاوے'' تھا۔اس کا تلوا لکڑی کا ہوتا اور بالائی حصے پر کسان بڑی

مہارت سے رسی بن کر اس کو سینڈل کی شکل دیتے۔ پنجہ دار چپل اور کھسے صرف امراء استعمال کرتے تھے۔ عام لوگ اور کسان اپنے لئے گھاس سے چپل بناتے جو ''دُروزہ'' چپل کہلاتی۔

ڈیڑھ سو سال پہلے کوہستان اور پہاڑی درّوں کے لوگ شکاری جانوروں کے چمڑے کا لباس پہنتے تھے۔ کوہستانی لوگ پکول کے ساتھ چترالی چغے استعمال کرتے تھے جو کہ آج کل بھی عام ہیں۔ سردی اور برفباری کے موسم میں پاؤں کو گرم رکھنے کیلئے گھٹنوں تک گرم کپڑا لپیٹ دیا جاتا۔ جسے ''پٹادے'' کہا جاتا تھا۔

زیورات چاندی کے استعمال ہوتے۔ البتہ بعض دولت مندوں کے ہاں سونے کے کنگن بھی استعمال کئے جاتے۔ سونا چالیس روپیہ کابلی فی تولہ تھا۔ چاندی کے یہ زیورات جسم کے مختلف حصوں پر سجائے جاتے۔ ناک کا زیور'' چارگل'' پاؤں کا زیور'' پان زیب'' ہاتھ کا زیور'' کڑے'' جبکہ بوڑھی عورتوں کے سینے پر لٹکتا ہوا وزنی زیور'' اوگئ'' کہلاتا۔ چاندی کے یہ زیورات دو سو سال قبل پوری پختون قوم استعمال کرتی تھیں۔ مگر آج کل صرف چترال کے کیلاش قبائل ہی انھیں استعمال کرتے ہیں۔

پشتو ضرب الامثال اور کہاوتیں

دیر میں یوسفزئی اور اتحادی قبائل پانچ سو سال سے آباد ہیں۔ درویشوں، عقلمندوں اور دانشوروں نے بعض اقوال کہے ہیں جو شاید صدیوں تک دہرائے جائیں۔ جیسے

خوږ د گل آباد راوت او خره ی د راموڅے یوڑه .دمیرات ملیزنی دیارلس زامن وی .سرپٹو او کباپ .گندیگار او میخے .دا سه د میاں کلی خیرات خو نه دے چه په لخا لاسو ی خورے.

نوابی دور میں ریڈیو کا استعمال انتہائی کم تھا اسلئے رات کو لوگ سوتے وقت قصے سناتے۔ جب لوگ کھیتوں سے آ کر روٹی سے فارغ ہوجاتے، بارش ہوتی یا برف باری ہوتی، چرگئی میں آگ جلتی، ستون پر دیا جلتا، نیم اندھیرے میں بیل یا گائے دم ہلاتی اور دادی بچوں کو قصے سناتی۔ اس دور میں'' نیکے بدے''،'' نیم کونے درور''،'' گذہ بیزہ'' اور'' قصہ دمحبوبے'' مشہور قصے تھے۔ جن کو سنتے سنتے بچے نیند کی وادی میں چلے جاتے۔

رات کو جب بچے روتے تو انھیں چپ کرانے کیلئے بچے کی پہلی انگلی پکڑی جاتی اور کہا جاتا ،داوائی رازئی چه زو، دوسری انگلی جرته زو ،غلا له زو، خدائے چه دمے ، پانچویں انگلی پر پہنچ کر کہا جاتا،پٹ به شو ، پھر بچے کے کلائی پر انگلیاں رکھ کر کہتی ''زی زی زی'' گلے تک پہنچ کر بچے کے گلے یا بغل میں گدگدی کی جاتی یوں بچہ خوب ہنستا اور بڑی اماں اسے چوم کر آنسو پونچھ ڈالتی۔

دنوں اور مہینوں کے نام

دنوں اور مہینوں کے نام پشتو کے ہوتے تھے، جیسے ہفتہ (خالی) اتوار (اتبار) پیر (گل) منگل (سہ شنبہ) بدھ (چار شنبہ) جمعرات (زیارت یا پانچ شنبہ) جمعہ۔

اور مہینوں کے نام کچھ ایسے تھے۔ حسیان (محرم)، سپرے میاشت (صفر)۔ وڑومبئی خور (ربیع الاول)۔ دویمہ خور (ربیع الثانی)۔ دریمہ خور (جمادی الاول)۔ وروستئی خور (جمادی الثانی)، زبرگہ (رجب)، برات (شعبان)، روژہ (رمضان)، واڑہ آختر (شوال)، میانہ (ذوالقعدہ)، لوئی اختر (ذوالحجہ)۔

علم اور مذہب

علم کم تھا مگر اس پر عمل زیادہ تھا۔ خوف خدا زیادہ تھا، لوگ گناہوں کے متعلق حساس تھے۔ دین میں فرقے نہ تھے۔ دینی علم چند ملا اور قاضی گھرانوں کے پاس تھا اور باقی لوگ نماز، ایک آدھ سورہ اور دعائیں یاد رکھتے عورتیں بمشکل نماز سیکھتیں۔ مدرسوں میں ابتدائی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ علم نہ سیکھنے کی ایک وجہ غربت تھی اور دوسری زرعی کاموں میں بے پناہ مصروفیت۔ بڑوں کی عزت کی جاتی، عورتوں میں شرم وحیاء کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ جھوٹ، منافقت، بے حیائی، زنا، جوا، نشہ، مادہ پرستی، فیشن پرستی اور پیچیدہ رسومات نہ تھیں۔ مساجد کافی فاصلے پر ہوتیں اس زمانے میں میاں کلی، منڈا، تیمر گرہ، کوٹو، خال، تالاش جیسے علاقوں میں نماز جمعہ پڑھی جاتی اور باقی علاقوں لوگوں کو یہاں جمع ہونا پڑتا۔ ماہ رمضان میں ختم کا اہتمام بھی خاص مساجد میں ہوتا کیونکہ حافظ قران کم تھے۔ اہالیان تیمر گرہ کو آج بھی یاد ہے کہ بابا جی مسجد (کوز کلے) میں جندول اور میدان سے لوگ ختم قران کیلئے آتے، دو ہفتے ان کا یہاں قیام ہوتا۔ سات دن بیٹھ کر اور سات دن میں کھڑے ہو کر ختم قرآن ختم کیا جاتا۔ ان لوگوں کیلئے مقامی لوگ دنبے ذبح کرتے اور ان کی خوب مدارت کی جاتی۔

بزرگان دین

پختون مذہبی بزرگوں کی بہت عزت کرتے ہیں۔ پرانے زمانے میں جب کوئی بزرگ یا ولی وفات پاتا تو لوگ اس کے مزار پر جا کر دعائیں مانگتے، ساتھ اپنے مریضوں کو بابا کے مزاروں پر لایا جاتا ،مختلف بزرگ مختلف امراض کیلئے مشہور تھے۔ان بزرگوں کے مزاروں پر بزرگوں اور بچوں کو کندھوں پر بٹھا کر لایا جاتا۔مشہور بزرگان دین کے مزار درجہ ذیل ہیں۔

میذوب بابا چکدرہ، بوڈابابا (اوچ)، اخون بابا(اسبنڑ) ،دونکاچے بابا اسبنڑ،شاگرام بابا ڈھیرئی اسبنڑ جس کا سالانہ عرس ہوتا ہے۔سید جلال بخاری صاحب جنگو اسبنڑ،سید جلال بخاری اوچ ،سید جلال بخاری شوہ اسبنڑ،سید جلال بخاری کیتاڑی اسبنڑ،سید جلال بخاری زیارت تالاش،ملابدوبابا تالاش، غازی بابا ارنگ برنگ،تیمر گرہ صاحب عرف باباجی صاحب،جلو بابا تیمر گرہ،تور بابا شیخانو نزد تیمر گرہ،تور بابا کوٹو،میاں بابا (میاں بانڈہ تیمر گرہ)،ظوال بابا(مہاجر کیمپ)،نیکہ بابا المعروف میاں بابادانوہ،سیار بابا ،میاں بابا گانجلہ رباط،زخوبابا رباط، ملا بابا رباط آسیگی درّہ ،بنڑ بابا خال،بیارئی باباجی،خونانو بابا اوڈیگرام ،اخون الیاس (اخون بابا لاجبوک)،اکا بابا (میدان)،لاڑے بابا مانیال ،کامبٹ صاحب (کامبٹ براول)،،قطوڑ بابا (قطوڑزئی)، پالام بابا مینہ سر عشیرئی باٹل،کشمیری بابا الماس عشیرئی،سنڈاکی بابانہا گدرہ،وڑوکی بابا بیبوڑ،لوئی بابا بیبوڑ،ریحان کوٹ صاحب دیر،لوئی بابا میاں کلے

الغرض دیر میں ایسا گاؤں نہیں جہاں کسی بزرگ کا مزار نہ ہو۔ ریاستی دور میں قبرستانوں کا احترام کیا جاتا،قبرستان سے گزرنے والے یہاں دعائیں مانگتے ،مزاروں پر حاضری دیتے وقت لوگ جوتے اتار لیتے ، یہاں درخت کاٹنا گناہ سمجھا جاتا ہر قبرستان جنگل (بنڑ) کہلاتا ،مزاروں پر امیر لوگ زرق برق چادریں بچھاتے ۔زائرین نقدی، بندوق ،زیوارت اور انڈے بھی چھوڑ جاتے جسے مزار کے مجاور یا دوسرے لوگ اٹھا لیتے ۔مزاروں پر پڑے پتھر اپنے بیماری دور کرنے کیلئے جسم پر پھیرے جاتے ۔عید کے دن ان مزاروں پر میلے لگتے لڑکیاں جا کر یہاں جھولے جھولتیں۔آج بھی یہ روایت چند ایک مقامات پر دیکھی جاسکتی ہے۔انقلاب کے بعد لوگوں کے عقائد بدل گئے لوگوں نے مزاروں پر حاضری چھوڑ دی۔اب یہ مزار ویران پڑے ہیں بلکہ بیشتر مزار جسے ڈھونڈنے کے لئے کھود ڈالے گئے ہیں۔

پختون ثقافت کے زوال پر دیرتا لاش کا ایک شاعر فضل حکیم عندلیب کچھ یوں رونا روتے ہیں۔

دلتہ سہ پاتی دی

نن چہ د یو کورہ لوگے د تنور پورتہ نہ شو
ماوے کہ خلق ددے کلی نہ پہ کڈہ تلی

دبر کنڈاو پہ تو ر گڑنگ تورہ باجو ناستہ وہ
خو دپختوا پہ شان پہ خلہ کئی سندرہ نہ وہ

پہ ھر پٹی کی مالکونڈئی اور کاریزی ولاڑی
د سرو غانٹولو قطارونہ پہ نظر نہ راتلل

د سرو منگو ماتو کودنڑو راتہ زکہ ژڑل
چہ یہ پہ خواکی دگودر پہ سینہ اور بلیدو

نہ درمندونو کی رشے وے نہ دلئی خکاریدے
نہ پہ ڈبہ باندی پیتاوے تہ د خلقو ٹولگی

شڑے حجری دپختوانے دور ارمان کولو
ہرگے تہ زوڑند وو یوگٹ کے بے تارونو رباب

نہ می د توت سوری تہ کٹ نہ می چیلم اولیدو
نہ کروندی وی نہ لوونہ پہ اشرو کیدل

نہ د قلبے تکڑہ غرایان شتہ د دھقان پہ کور کئی
نہ ھغہ ایوہ شتہ نہ جغ او نہ خاخئی چرتہ کے

نہ دچرگئی پہ غاڑہ بیا کوڑمہ راغونڈہ شولہ
نہ پہ خانک کے شتہ لیئی او دغوڑو ڈنڈونہ

نہ د رباب او منگی غرب شتہ نہ ژڑا د ستار
نہ د غرسہ جانان شپیلئی زماتر غوگو شولہ

نہ چلغوزی شتہ د نخترونہ پڑگی د سیڑو
نہ می شپونکے اولید نہ ھغہ رمی پہ غرہ کے

نہ پہ ودونو کے د سرو لاسو اتنڑی کیگی
نہ می د غم وخت کے ساندی تر غوگونو شولے

نہ اخترو کے سیلونہ او ٹالونہ شتہ دے
نہ دیوالگو باندی د گوتو اور مئی گلونہ

نہ پہ شپلونو باندی شتہ د لولکو سیلونہ
نہ پہ نکریزو سرہ لاسونہ ،نہ خالونہ پہ مخ

نہ می اوگنی نہ می چارگل نہ می پیزوان اولیدو
نہ د کخی خلہ کی ٹپہ شتہ نہ جواب د ٹپے

نہ اوس پہ ژرندہ دانو تہ خلق شپے رونڑوی
نہ تریو لاڑونڈ شتہ نہ پیتی او نہ کٹوی د شوملو

نہ د میچونو تاویدلو آوازونہ شتہ دے
نہ نیمہ شپہ کے اوبہ خورے د سپوگمنی پہ رنڑا

نہ پہ کوٹو کے لہ دانو نہ ڈک کندوان اوخمیے
نہ نظر ماتی لہ لوگے شول سپیلنی او نمیر

نہ می جرگے شتہ نہ ھغہ شملہ ور پختونہ
نہ ھغہ یار شتہ چہ د یار پہ سر ئی سر ورکونو

ماعندلیب لہ خپل زڑگی د مشورہ راکڑلہ
نامڑدہ زہ ددے وطنہ دلتہ سہ پاتے د ی

بھوسے کا ٹوپ (بوساڑہ)

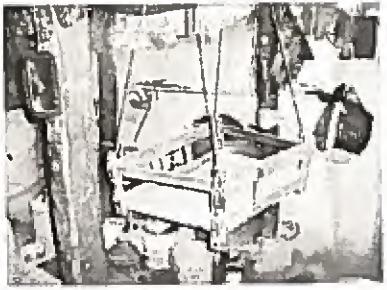

پچاس سالہ پرانہ ایک پنگھوڑا

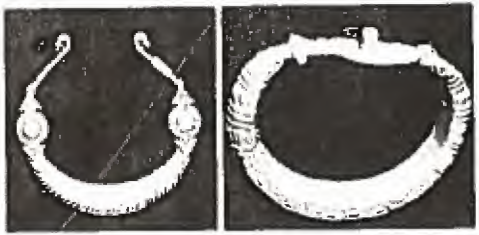

چاندی کے زیورات اوگی اور پانزیب

مٹی کا خمبہ (کندو)

شہنائی اور نقارہ

لکڑی کے بنے کھڑاوے جوتے

ملاکنڈ پائین کا ایک کسان غلام اپنی زرعی اوزار کے ہمراہ

ایک خاتون چکی پیس رہی ہے۔

پختون ثقافت کو زوال

نواب شاہ جہان کے طرز حکومت کا ایک فائدہ ریاست میں آباد پختونوں کے پانچ سو سالہ ثقافتی ورثہ کی حفاظت تھا۔ نوابی کے خاتمے پر دیر میں ثقافتی تغیرات وقوع پذیر ہوتے گئے۔ اور قلیل عرصے میں خلیج کی دولت، مواصلاتی رابطوں میں تیزی، سڑکوں اور میڈیا کی ترقی نے نئے رجحانات کو جنم دیا۔

نوابی دور میں اگر پشتونوں کی اصلی ثقافت کہیں صوبہ سرحد میں تھی تو وہ دیر کا علاقہ تھا جہاں پشتونوں کی ثقافت اصلی حالت میں دیکھنے کو ملتی تھی۔ 1960ء کے بعد لوگوں نے اپنے آباؤ اجداد کے طریقوں کو چھوڑ کر مختلف تہذیبوں کو اپنا لیا۔ اور اس طرح پشتونوں کی ثقافت کی بعض قابل فخر روایات بھی مٹتیں چلی گئیں۔ اگرچہ پختونوں کی ثقافت کے نمونے اب بھی کوہستان، عشیرئی درّہ اور دوسرے پہاڑی دروں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ بھی ہے کہ جہاں دولت، سڑک، گاڑی اور بجلی کی تاریں پہنچ جاتی ہیں وہاں مقامی روایات کو زوال آجاتا ہے۔

خارجہ پالیسی

نواب محمد شاہ جہان کے اقتدار کو مستحکم کرنے میں اس کے اعلیٰ سطح پر تعلقات نے اہم کردار ادا کیا ۔ پانچ ہزار مربع کلومیٹر والی چھوٹی سی ریاست کا یہ حکمران بین الاقوامی سطح پر تعلقات رکھتا تھا۔ سیاسی گرو ہونے کے علاوہ، آس پاس کی ریاستوں سے رشتے، خارجہ پالیسی پر بے تحاشہ دولت خرچ کرنے کی وجہ سے پورے ہندوستان میں اس کے رعب، شان وشوکت اور جاہ وجلال کی مثال دی جاتی تھی۔ شاہ ایران، شاہ افغانستان اور وائسرائے ہند کے علاوہ پاکستان کے گورنر جنرل سے تعلقات کی وجہ سے اس کا تختہ الٹنا غریب اور بے بس رعایا یا سرداروں کی بس کی بات نہ تھی۔

انگریزوں سے تعلقات

1924ء میں تخت نشین ہونے کے بعد نواب نے ایک سال بعد دہلی کا پہلا دورہ کیا۔ اور ایک سال کے مختصر عرصے میں ''نواب'' کا خطاب حاصل کیا۔ 1929ء میں نواب دوسری دفعہ دہلی گیا اور وائسرائے ہند لارڈ ڈارون کو مدعو کیا یہ کامیاب سفارتکاری کا ایک بڑا ثبوت ہے کہ ایک نواب دہلی سے وائسرائے ہند کو بلوا کر کامرانی میں شکار کھلاتا ہے اور پھر تیمر گرہ لا کر اس کی ضیافت کا اہتمام کرتا ہے۔

جب کوئی انگریز پولیٹکل ایجنٹ ریاست دیر آتا تو دیر حکومت کی طرف سے مہمان کو آنے پر انیس توپوں کی سلامی پیش کی جاتی ۔ ڈھول سرنا کے ساتھ انتہائی گرم جوشی کا مظاہرہ کر کے زبردست پروٹوکول دیا جاتا۔ مہمان کی خوب قدر منزلت کر کے جاتے وقت چکو، رشکاری کتے اور معجون دیا جاتا الغرض نواب کی مہمان نوازی اور پروٹوکول پر ریاست کا سرکاری مہمان کافی مسرور ہو جاتا تھا۔

اللہ بخش یوسفی کے مطابق وائسرائے ہند نے 1926ء، اکتوبر 1929ء اور اپریل 1930ء میں ملاکنڈ اور چکدرہ کا دورہ کیا تھا۔ ہر وائسرائے سے اس کے اتنے قریبی مراسم تھے کہ کسی وائسرائے کی دعوت ہوتی تو دیر کے نواب کو ایسے موقع پر ضرور بلایا جاتا تھا۔

شاہ ایران اور شاہ افغانستان سے تعلقات

شاہ ایران سے تعلقات کا ذکر فضل غفور تحصیلدار کچھ یوں کرتے ہیں ''میں نواب کی طرف سے شاہ ایران کی بیٹی کی شادی پر ایران کے شاہی دربار میں داخل ہوا، بڑے بڑے ملکوں کے بادشاہ اور حکمران موجود تھے شاہ سے میرا تعارف کیا گیا تو میری خوب قدر منزلت کی ۔ نواب کا افغانستان کے

حکمرانوں سے قریبی تعلق تھا لیکن انگریزوں کے ڈر سے اپنے تعلقات کو انتہائی خفیہ رکھتا تھا۔

گورنر جنرل سے تعلقات

انگریزوں کے بعد نواب نے پاکستانی اعلیٰ حکام سے بھی قریبی تعلق رکھنے کی کوشش کی۔ قائد اعظم اور لیاقت علی خان سے تعلقات کچھ سرد رہے۔ مگر جب خواجہ ناظم الدین گورنر جنرل بنا تو اسے ریاست دیر کے دورہ کی دعوت دی گئی۔ اس نے دیر کا دورہ کر کے نواب کے ساتھ شکار بھی کھیلا۔ اس کے بعد نواب نے گورنر جنرل سکندر مرزا کو بدر خومیاں تاج محمد کے ذریعے مدعو کیا۔ سکندر مرزا اپنی بیوی کے ساتھ دیر کے دورے پر آیا، شکار کھیلا اور روایتی مہمان نوازی سے متاثر ہوا۔ بعد میں خوب دوستی رہی اور ایک ٹرک اسلحہ نواب دیر کو تحفے میں دیا۔

انگریزوں سے چالبازیاں

بیس سال تک انگریزوں کے ساتھ ایسا سیاسی کھیل کھیلا جس کو انگریز آخر تک نہ سمجھ سکے اگرچہ نواب نے انگریزوں سے دوستی کی، تحریک آزادی کو سرد رکھنے میں ساتھ دیا۔ مگر ان پر پیچھے سے کئی وار کئے ،انگریزوں سے بھاری وظیفہ وصول کیا، مگر انگریزوں کو نہ جنگلات کاٹنے دیئے، نہ شجر کاری اور نہ ہی سیرو سیاحت کا موقع دیا۔ اگرچہ انگریزوں کے بھی نواب سے کچھ مفادات تھے مگر مجموعی طور پر نواب انگریزوں کی نسبت زیادہ فائدہ میں رہا۔

انگریزوں کو ریاست سے نکلنے پر مجبور کرنا

انگریزوں کی تین ہزار فوج ہر چھ ماہ بعد پشاور سے براستہ دیر چترال اور گلگت جاتی تھی 1895ء سے حساس علاقہ ہونے کی وجہ سے انگریزوں نے دیر چترال سڑک پر قریباً نو مقامات پر چوکیاں بنائیں تھیں جو ''پڑاؤ'' کہلاتی تھیں۔ ڈیوک کو شاید یہ خدشہ تھا کہ انگریز اس ملک میں آزادانہ گھومتے پھرتے رہے تو انھیں اس کی حکومتی پالیسیوں، رعایا سے سلوک اور غربت کا قریب سے دیکھنے کا موقع ملے گا۔ اسلئے یہ ناگزیر تھا کہ وہ انگریزوں کو ریاست دیر سے باہر ہی رکھے۔

ہر چھ ماہ بعد چترال اور گلگت جاتے ہوئے انگریز فوج ریاست دیر سے گزرتی تو نواب اپنی

فوج کو اس دن الرٹ رکھتا۔ اور دوسری جانب کارندے بھیج کر انگریز فوج پر حملہ کرواتا۔ پھر انگریزوں کی توجہ ہٹانے کیلئے یہ سب رعایا کے کھاتے میں ڈال دیتا۔ کہ ''یہ سب کچھ جاہل لوگوں نے کیا ہے جنہیں میں سخت سزا دونگا''۔

ایک انگریز پولیٹکل ایجنٹ نے تورہ غنڈئی نزد منڈا شکار کی خواہش ظاہر کی۔ نواب نے سڑک پر بیگاریان لگا دیئے مگر اپنے کارندے بھیج کر مزدوروں پر ہوائی فائرنگ کروائی جب یہ خبر اس انگریز کو پہنچی تو اس نے علاقے کو پرخطر سمجھ کر اپنا ارادہ ترک کر دیا۔

ایک دفعہ انگریز فوج کے چند افسران چترال جا رہے تھے۔ نواب نے ان کی خوب خاطر مدارت کی اور ان سے کہا ''اگر تم چاہو ہو تو میرے سپاہی تمھیں لواری کے اس پار پہنچا دینگے''۔ ان افسروں نے گھمنڈ میں آکر انکار کر دیا'' اور شکریہ ادا کر کے چترال کی راہ لی۔ چند ساعت بعد سپاہیوں کو چرواہوں کے بھیس میں ان کے پیچھے لگا دیا۔ کارندوں نے جنگل میں انگریزوں کو گھیر کر لوٹ لیا۔ انگریزوں کا ایک ساتھی سکھ سپاہی دربار آیا اور نواب سے شکایت کی نواب نے بناوٹی غم وغصہ کا اظہار کیا اور ایک دستہ روانہ کیا جس نے انگریزوں کو بحفاظت چترال کی حدود میں پہنچا دیا۔

انگریزوں کا احمقانہ معاہدہ

1933ء میں جب علماء باجوڑ نے انگریزوں کا ساتھ دینے پر نواب شاہ جہان کے خلاف فتوی جاری کیا تو باجوڑ اور دیر میں اسلام پسندوں نے نعرہ بغاوت بلند کیا۔ سلطان خیل اور پائندہ خیل قبائل بھی نکل آئے اور رباط اور واڑی کے چوکیوں کو آگ لگا دی۔ کافی مزاحمت ہوئی حتی کے باجوڑ کے بعض علاقوں پر بمباری تک کی گئی۔ اس عمل کو نواب نے سیاسی پتے کے طور پر استعمال کیا۔ کیونکہ وہ انگریزوں کو پہلے سے باور کرا رہا تھا کہ میری ریاست غیر محفوظ ہے۔ انگریز چونکہ بار بار حملوں سے تنگ آچکے تھے بالآخر چالاک نواب کی چال میں آہی گئے۔ انگریزوں نے نہ صرف ریاست کے کئی مقامات سے اپنی چوکیاں ختم کر ڈالیں بلکہ معاہدہ بھی کیا جس کی رو سے نواب نے انگریز فوج کو حفاظت سے لواری کے اس پار پہنچانے کا ذمہ لے لیا۔

بعد ازاں ہوتا یوں کہ جب انگریز فوج چکدرہ میں داخل ہوتی۔ تو سڑک کے دونوں جانب

نواب کی فوج اس کے حفاظت پر مامور رہتی اور برطانیہ جیسی بڑی طاقت کی مسلح فوج اس پہرے میں ریاست میں سے گزر کر چترال جاتی۔ بعد میں انگریز اس بات کے بھی پابند بنائے گئے کہ اگر وہ ریاست دیر میں قدم رکھنا چاہیں تو انھیں نواب کو پہلے سے خبردار کرنا ہوگا۔ تاکہ ان کی حفاظت کا بندوبست کیا جاسکے ۔اسلئے جب انگریز دیر میں داخل ہوتے تو انھیں پہلے سے پیشگی اطلاع دینی پڑتی تھی۔

جب انگریز دیر کی سڑک کی کشادگی کا مطالبہ کرتے تو انگریزوں سے قوم کو اعتماد میں لینے کی مہلت مانگی جاتی۔ پھر قوم کے مشران کو اکسا کر نواب انگریزوں کے سامنے زبردست واویلا کرواتا یوں وہ منصوبہ پھر التواء کا شکار ہوجاتا۔ دیر کی سڑک صرف ایک گاڑی کے گزرنے کی قابل تھی۔ انگریز اور پاکستانی حکام کے مطالبات کے باوجود یہ سڑک کچی اور تنگ رہی حتی کہ شجر کاری تک کا موقع نہیں دیا گیا۔

انگریز افسر کا قتل

1934ء میں ہزاروں برطانوی فوج چترال کی طرف گامزن تھی سڑک کی دونوں جانب نواب کے سپاہی پہرے پر کھڑے تھے۔ اس فوج کے آگے خچر تانگہ جو کہ ''کرنچی'' کہلاتا تھا، اسلحہ لئے جارہا تھا۔ اس سے آگے ایک گورا ٹریفک افسر موٹر سائیکل پر جسے دیر والوں نے ''ڈگ ڈگے'' کا نام دیا رواں تھا۔ جب یہ فوج ایک جگہ پڑاؤ ڈالنے لگی تو فوج کے کمانڈر نے کھڑے ہوکر پیشاب کرنا شروع کردیا۔ جسے دیکھتے ہی نواب کے سپاہی نے اس پر گولی چلادی جس سے وہ موقع پر ہی ہلاک ہوگیا۔

یہ دیکھتے ہی برطانوی فوجیوں نے بھاگتے قاتل کو گرفتار کرلیا۔ پہلے اسے ملاکنڈ لے جایا گیا اور پھر قلعہ بالا حصار پشاور میں اس سے پوچھ گچھ کی۔ مجرم کا کہنا تھا'' میں نے صرف اسے اس وجہ سے قتل کیا کہ وہ قبلہ کی طرف منہ کرکے پیشاب کررہا تھا''۔ اس سپاہی کو انگریزوں نے خونخوار کتوں کے سامنے ڈال کر بڑی بے دردی سے شہید کردیا۔

چک درہ قلعہ سے اسلحہ چوری

انگریزوں کے عہد میں مشہور واقعہ چکدرہ قلعہ میں واقع اسلحہ ڈپو تک رسائی تھا۔ ایک روز چکدرہ ڈپو میں فوجی کیا دیکھتے ہیں کہ ایک غار کھودی گئی ہے۔ اسے دیکھ کر پہرہ دار نے جلدی سے اعلی افسران کو مطلع کیا۔ انگریزوں نے دیکھا کہ کافی دور سے دریا کے کنارے سے کھدائی کرکے چوروں نے اس ڈپو

تک رسائی حاصل کی۔اسی لئے اس زمانے میں یہ بند بہت مشہور ہوا۔

ٹوپک دچکدری نه　　　　چابوڑه دپنجری نه

اوخاص دملاکنڈنه ورله راغلل پیرنگیا ن　　　　او ورته اوردریدل حیران

کامرانی پکٹ سے اسلحہ چوری

والی سوات نے فریدون خان نامی شخص کو ریاست بدر کیا جو دیرآ کر بمقام انڈھیرئی آباد ہوا۔ اس کا ایک ملازم جس کا نام تیلی تھا ایک مست اور شدت پسند قسم کا آدمی تھا۔اسے انگریزوں سے سخت نفرت تھی۔مزاقی اور نخرے باز بھی تھا اور داڑھی اور مونچھوں کے کئی اسٹائل اپناتا تھا۔
1935ء میں انگریزوں سے کامرانی سر میں چوکی سے دوراتیں مسلسل اسلحہ چوری ہوتا رہا۔تیسری رات سکھ پہرہ دار نے تاریکی میں کیا دیکھا کہ ایک کتا ادھر بڑھ رہا ہے۔سپاہیوں نے تعاقب کیا۔جب وہ نزدیک پہنچے تو کتے کی کھال سے ایک قوی اور توانا شخص نکل آیا،اس نے فرار ہونے کی کوشش کی اور اسی کوشش میں اسے کئی برچھیاں لگیں۔جس سے وہ دم توڑ گیا۔صبح یہ خبر نواب کو بھی پہنچی۔محمد رازق جمالدار نے جا کر لاش کی تصدیق کی اور تحصیلدار رضا خان نے لاش کو وصول کیا۔آج بھی بانڈہ گئی میں تیلی شہید کے نام سے اس کا مزار موجود ہے۔

انگریزوں کو نواب کی دوستی پر اعتماد تھا۔وہ انگریزوں کے ساتھ تحریک آزادی کو کچلنے میں اہم اتحادی تھا۔شاید یہی وجہ تھی کہ انگریز خفیہ ایجنسیاں دیر میں سرگرم عمل نہ تھیں اور شاید یہ انگریزوں کے وہم گمان میں بھی نہ تھا کہ ایک ایسی قوم جو موٹروں کو گھاس ڈالتی ہے، پر حکومت کرنے والا نواب ساری دنیا پر حکومت کرنے والی چالاک انگریز قوم کو الو بنارہا ہے۔ایسے حربے اور سیاسی چالبازیوں کے کئی واقعات اور بھی مشہور ہیں۔انگریز ان چالوں کو آخر وقت تک نہ سمجھ سکے،نواب کو اپنا وفادار سمجھتے رہے اور اسے کئی خطابات سے نوازا۔

نواب شاہجہان کے عہد میں
سیاسی سرگرمیاں

ایرانی سیاح کے مطابق والی سوات کے خلاف جماعت اسلامی کے کارکنان چوک میں جلسے جلوس کرتے تھے۔ ریاست دیر میں جلسہ تو درکنار اٹھ دس بندے کسی جگہ جمع نہیں ہو سکتے تھے۔ ریاست دیر میں سیاسی جلسے جلوس اور سرگرمیوں پر سخت پابندی تھی۔

تقسیم ہند کی مخالفت اور انگریزوں کی حمایت

نواب شاہ جہان پاکستان سے پہلے انگریزوں کے ساتھ بڑی چالبازیاں کرتا رہا کیونکہ انگریزوں سے دیرینہ نفرت کی وجہ سے قوم اس کا ساتھ دیتی رہی۔ اس نے بڑی چالاکی سے انگریزوں کو دیر سے باہر رکھا۔ اس کی بجائے دوراندیش نواب کا خیال تھا کہ اگر پاکستان بنا تو اسے پرانی ڈگر پر اپنی پالیسیاں چلانا مشکل ہوگا اور قوم بھی پاکستان کے خلاف اس کا ساتھ نہیں دے گی۔ شاید یہی وجوہات تھیں کہ اس نے تحریک آزادی کچلنے میں انگریزوں کا ساتھ دیا۔

کانگریس کی مخالفت

1930ء میں کانگریس کا بیج بونے خان عبدالغفار خان خال آئے۔ انھوں خال اخونزادگان کے کہنے پر ایک سکول بنایا۔ جب کانگریسی لیڈر واپس ہوئے تو نواب نے وہ سکول مسمار کرڈالا اور کانگریس کی مہم کو ناکام بنادیا۔ دیر تو کیا نواب باجوڑ میں بھی کانگریسیوں کے تعاقب میں رہا۔ اس کی انگریز نوازی دیکھ کر باجوڑ کے علماء نے اس کے خلاف فتوی جاری کیا اور جگہ جگہ اس کے خلاف مظاہرے کئے گئے۔ 1935ء میں انگریزوں نے آزادی کی تحریک کو کچلنے میں ساتھ دینے کے عوض نواب محمد شاہ جہان کو سر Sir کا خطاب دیا۔ یاد رہے کہ نواب کی قبر پر سر Sir کے علاوہ برگیڈیئر K.B اور KBE کے خطابات بھی لکھے گئے ہیں۔

باچا خان تحریک اور نواب دیر

خان عبدالغفار خان المعروف بہ باچا خان اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ "میں اپنی تحریک کے سلسلے میں دیر گیا وہاں ایک رات صاحبزادگانِ دیر کے ہاں مقیم تھا کہ ایک جمالدار آیا اور کہا "نواب صاحب نے بلایا ہے" میں اس کے پاس پہنچا تو نواب کچھ یوں گویا ہوا۔

---

۱ زما ژوند او جدوجہد صفحہ ۱۸۹

''پٹ پہ زڑہ کی می انگریز ڈیر بدی شی تہ چہ سہ غواڑی ذما ھم دغہ ارزو دہ. سہ او کڑم میاں گلے ی راتہ کینولے دے چہ ایلہ حرکت کوم راباندی راچوی ، کہ صبا می دقام اور خلکو پہ مخکی ستا د خبرو مخالفت او کڑو چہ تہ خفہ نہ شے زما پٹہ مرستہ بہ درسرہ وی''۔

میں دل سے انگریزوں سے نفرت کرتا ہوں۔ جو تم چاہتے ہو میری بھی یہی آرزو ہے لیکن کیا کرو میاں گلے (میاں گل عبدالودود) کو میرے سر پر بٹھایا گیا ہے اگر معمولی حرکت کروں تو حملہ آور ہوتا ہے اگر کل میں قوم اور لوگوں کے سامنے تمہاری باتوں کی مخالف کروں تو خفہ نہ ہونا میری ہمدردی تمہارے ساتھ رہیگی۔

پھر صبح باچا خان ولی عہد محمد شاہ خسرو سے ملاقات کیلئے بانڈئی گئے مگر انھیں بتایا گیا کہ وہ بیمار ہے۔ پھر وہ شاہی پاس کے راستے باڑہ گئے وہاں افسروں نے انھیں بتایا کہ شہاب الدین خان خوابگاہ میں ہے کیونکہ کل ہی اس کی شادی ہوئی ہے۔

باچا خان کی اس روداد کو پڑھ کر کہا جاسکتا ہے کہ اس روز نواب نے انھیں صرف اعتماد میں لیا بانڈئی اور جندول میں بیٹوں سے ملاقات کے وقت بہانے تراشے گئے۔ باچا خان سے ہمدردی جتانے والے اس حکمران نے 1930ء میں کانگریس کا مدرسہ جلاڈالا اور کانگریسی کارکنان کو ملک بدر کردیا۔

مسلم لیگ اور جماعت اسلامی

1940ء میں حکمران سوات میاں گل عبدالودود نے قائداعظم سے ملاقات کر کے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی۔ بعد میں فاطمہ جناح بھی سیاسی مہم پر سوات گئیں۔ مگر نواب نے اس طرح کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ دیر میں مسلم لیگ کی بنیاد اخونزادہ بہرور سید نے رکھی۔ لاہور میں قانون کے اس طالب علم سے قائداعظم نے کہا کہ آپ دیر میں مسلم لیگ بنائیں۔ اس مہم کو لئے بہرور سید اخونزادہ وطن آیا اور خال میں مسلم لیگ کے پرچار میں لگا رہا۔ بعد میں طور منگ میں نامی گرامی ملک ہارون کو مسلم لیگ میں شمولیت پر آمادہ کرلیا۔ ریاست میں طور منگ پہلا گاؤں تھا جس میں مسلم لیگ کے جھنڈے لہرائے گئے یہ خبر نواب تک پہنچی تو اس نے گاؤں کو آگ لگادی اور یہاں سے مسلم لیگ کے کارکنوں کو ریاست بدر کردیا

1957 کے لگ بھگ دیر میں جماعت اسلامی کو متعارف کرانے کی کوشش کی گئی۔ مگر نواب نے اس کے کئی کارکنوں کو بھی ریاست بدر کر دیا جو ملاکنڈ کے گاؤں تھانہ میں آباد ہو گئے۔

اگر چہ دیر کے عوام کو سیاست کا موقع نہیں دیا گیا مگر عوام میں سیاسی اور آزادی کا بے پناہ جذبہ موجود تھا۔ دیر سے بٹی جان، نواب کے بھائی عالمزیب خان، نرہانزملا، میاں حضرت یوسف اور بہرور سید اخونزادہ نے قائداعظم سے ملاقاتیں کیں اور آزادی کیلئے سرگرم رہے۔ جبکہ ریاست کی غریب رعایا نے قائداعظم ریلیف فنڈ میں دو لاکھ کا چندہ جمع کر کے ایسی عظیم قربانی کا ثبوت دیا جسے تاریخ ہمیشہ کیلئے یاد رکھے گی۔

پنڈت جواہر لعل نہرو پر پتھراؤ

سیاسی چالوں میں ماہر نواب نے بیس سال تک کانگریس کو ناکام بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اس کے باوجود وہ کانگریسی لیڈروں سے رابطے میں رہا۔ جب صوبہ سرحد کی ریفرنڈم مہم شروع ہوئی تو مسلم لیگ کو مرعوب کرنے کیلئے نواب نے کانگریس کی طرف جھکنا شروع کر دیا۔ اس پر باچا خان نے پنڈت جواہر لعل نہرو کو ریاست دیر کا دورہ کرنے کی دعوت دی۔

پیر مانکی شریف پر لکھی گئی کتاب میں سید وقار علی شاہ کاکاخیل لکھتے ہیں ''پنڈت جواہر لعل نہرو صوبہ سرحد میں ریفرنڈم کے موقع پر ملاکنڈ پہنچا تو مسلم لیگ کے مشتعل جلوس نے پنڈت جواہر لعل نہرو کی گاڑی پر پتھراؤ کیا جس میں خان عبدلغفار خان اور ان کے بھائی ڈاکٹر خان بھی موجود تھے۔ عوامی مزاحمت اور پتھراؤ دیکھ کر گاڑی کا رخ موڑ دیا گیا اور درگئی کے راستے پنڈت جواہر لعل نہرو کو انجان راستوں پر لے جاتے ہوئے پشاور پہنچایا گیا۔

دہلی پہنچ کر نہرو نے مظاہرے کا الزام ملاکنڈ پولیٹیکل ایجنٹ شیخ محبوب ولی پر ڈالا تحقیقات کے بعد اس پولیٹکل ایجنٹ کو معطل کیا گیا یہ مقدمہ مدراس ہائیکورٹ میں جسٹس آر کلارک نے لڑا۔ صوبہ سرحد میں یہ واقعہ بہت اہمیت کا حامل ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس واقعہ کی وجہ سے صوبہ سرحد کے ریفرنڈم میں کانگریسی تحریک کافی حد تک متاثر ہوئی۔

ریاست دیر کا پاکستان سے الحاق

جیسے جیسے تحریک آزادی زور پکڑتی گئیں، نواب کو مجبوراً مسلم لیگ یا کانگریس میں سے کسی ایک کا ساتھ دینا پڑا، قائداعظم اور لیاقت علی خان سے سرد تعلقات کے باوجود ریاست دیر اور پاکستان کے درمیان ایک معاہدہ ہوا۔ جس میں ریاست دیر کے وزیر خارجہ تحصیلدار فضل غفور نے قائداعظم سے دو دفعہ ملاقات کی۔ یہ معاہدہ نواب کی سخت شرائط کے باوجود ہوا۔ حالات ہی کچھ ایسے تھے کہ پاکستان کو مجبوراً نواب کی سخت شرائط تسلیم کرنی پڑیں۔ اور 8 نومبر 1947ء کو ریاست دیر کا پاکستان سے الحاق کر دیا گیا۔

جہاد کشمیر

پاکستان سے الحاق کے بعد جب بھارت نے کشمیر پر حملہ کیا تو دیر کے غیور عوام نے جہاد کا نعرہ بلند کیا۔ عوام کے جوش و خروش پر نواب نے کوئی دھیان نہ دیا تو عبدالمناف، شیر احمد خان اور قاضی شمس الرحمٰن کی نگرانی میں لوگوں نے ایک جلوس نکالا جس میں حکومت سے جہاد میں شرکت کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ جلوس میں عبدالشکور نامی ایک نوجوان ڈفلی (تمبل) کے ساتھ یہ ترانہ گا رہا تھا۔

شمشیر په لاس کی گڈه ووم ددین غزا له زمه ،ددین آبادله زمه

جب نواب کو خبر ملی تو مذکورہ مشران پر قتل کے برابر یعنی پانچ سو روپیہ جرمانہ لگایا گیا۔ نواب کے جہاد کشمیر کے سلسلے میں تذبذب کا شکار ہونے کی کئی وجوہات تھیں۔

مثلاً نواب انتظامیہ بھی یہ اقرار کرتی ہے کہ کسی نے حکمران کو اسلامی ارکان جیسے نماز، روزہ حج اور زکواہ کی بجا آوری کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ گویا ایک جابر اور عیاش حکمران میں یہ مذہبی جذبہ نہیں تھا۔ نواب نظریہ پاکستان کا بھی دل سے حامی نہ تھا۔ نواب کو شاید یہ بھی خدشہ تھا کہ اگر دیر سے لوگ جہاد کیلئے کثیر تعداد میں نکلیں گے تو وہ باہر کی دنیا دیکھیں گے، مال غنیمت اور اسلحہ ساتھ لائینگے اور اگر فاتح بن کر لوٹ آئے تو انھیں قابو میں رکھنا مشکل ہوگا۔

سوات کے حکمران نے جب سرکاری دستے کشمیر روانہ کئے تو دیر کے غیور عوام کا خون اور بھی کھول اٹھا۔ جہاد کا جذبہ روز بروز بڑھتا رہا اگر دیر کی حکومت لوگوں کو مزید جہاد سے روکتی تو شاید نوبت

بغاوت تک پہنچ جاتی۔عوام کا جوش وجذبہ دیکھ کرانھیں جانے کی اجازت دی گئی۔

جہاد کشمیر کے سلسلے میں نواب نے ملیزی کے چار قبائل سلطان خیل، پائندہ خیل، نصرالدین خیل اور اوسی خیل کی درجہ بندی کی۔قبیلہ اوسی خیل کو پابند کیا گیا کہ وہ لاشیں اٹھانے کا کام سرانجام دینگے ،قبیلہ نصرالدین خیل کو ابتدائی دستوں میں روانہ کیا گیا جس میں بیشتر لوگ غازی بن کر لوٹے۔اپنے ساتھ مال غنیمت لائے اور انھیں کم نقصان اٹھانا پڑا۔تیسرا جنگجو اور غیور قبیلہ پائندہ خیل گزشتہ دوسو سال سے دیر حکمرانوں کا ہراول دستہ رہا تھا۔مگر جہاد کشمیر میں پائندہ خیل نے شرکت نہ کی۔چوتھا قبیلہ سلطان خیل تھا جس کو فرنٹ لائن پر لڑنے کیلئے بھیجا گیا،ساتھ ہی میدان اور براول سے،مشوانی،وردگ اور کئی دوسرے قبیلوں سمیت ترکلانی قبیلے کے مجاہدین کو جہاد کے ہراول دستوں میں شامل کیا گیا۔

مجاہدین کی کشمیر روانگی

مجاہدین تیمر گرہ میں جمع ہوئے۔گیدڑو (نوے کلے) کے مقام پر پڑاؤ ڈالا۔اوپر پہاڑی پر ڈھول سرناوالے مجاہدین کو جوش میں لانے کی کوشش کررہے تھے اور شمندروزئی نامی رقاصہ (ڈمہ) ناچ رہی تھی۔وہاں سے یہ دستہ چکدرہ پہنچا۔آٹھ سو غازیوں پر مشتمل مجاہدین کے سامنے ولی عہد محمد شاہ خسرو نے پرجوش تقریر کی۔نومبر 1947ء میں اس دستے کو عبداللہ جان تحصیلدار کی کمان میں دے کر رخصت کیا گیا۔اس کے کچھ عرصہ بعد دوسرا دستہ حضرت علی کاکا کی سپہ سالاری میں کشمیر روانہ کیا گیا۔جب مجاہدین دیر سے رخصت ہورہے تھے تو بعض کی زبانوں پر یہ اشعار تھے۔

شمشیر په لاس کی گڈه وومه جنگ له آزاد ورزمه　　جهان آباد له زمه

د سکھ هندو سره جهگڑ اماته　　پیغور خکاری

چه او س خدائے او کڑه نو زه به پرے آزاد ورزمه　　جهان آباد له زمه

ایک شاعر شجادئی گاؤں سے گزرا تو میدان کو خالی پایا کیونکہ بیشتر لوگ جہاد کیلئے گئے تھے اس کا ذکر اس نے کچھ یوں کیا۔

د شجادئی په ڈبو راغلم

چیلم پراته وو خانان جنگ له تلی وونه

مجاہدین کشمیر کی فتوحات

عبداللہ جان تحصیلدار کی کمان میں مجاہدین نے میر پور اور دھرم سالہ کے محاذوں کو فتح کیا مجاہدین کا جوش اور جذبہ مثالی تھا، دسمبر میں منگل کوٹ بھی فتح ہوا۔ دیر کے مجاہدین پے در پے فتوحات حاصل کر کے پیش قدمی کر رہے تھے۔ ''ٹائی'' کشمیر کا ایک مشہور مورچہ گزرا ہے میجر گل ملا خان کی کمان میں دیر مجاہدین کے حوصلے بلند تھے کئی محاذوں کو فتح کیا۔ مگر بدقسمتی سے ٹائی مورچے پر فاتح لشکر کا بارودی سرنگوں پر گزر ہوا جس کی وجہ سے تقریباً چھ سو مجاہدین اپنے بہادر سپہ سالار میجر گل ملا خان سمیت جام شہادت نوش کر گئے۔ نواب کی فوج سے غفار میجر بانڈئی نہاگ درّہ، محمد شاہ تحصیلدار اور ان کا بیٹا شمشیر صوبیدار اسبز ترناؤ، فضل غفور تحصیلدار، صوبیدار شیر افضل خان عرف کئیر خان، رحیم اللہ جان (والد مشیر مال طور خان صوبیدار منجائی)، صوبیدار میاں عبدالغفار اور صوبیدار سید محمود جان سمیت کئی صوبیدار اور جمالدار مختلف دستوں کے ساتھ جہاد کشمیر پر گئے۔

جہاد کشمیر میں نواب کے بعض افسروں نے دل و جان سے شرکت کر کے دیر ریاست والوں کا سر فخر سے بلند کیا۔ مگر بعض نے سرد مہری کا مظاہرہ کیا۔ حتی کہ بہت سے لوگ ان کی بزدلی دیکھ کر کشمیر سے واپس ہو گئے۔[1] عزیز جاوید (تمغہ امتیاز) لکھتے ہیں کہ ''مجاہدین کی فتح کو شکست میں بدلنے میں کسی کا ہاتھ تھا''۔ جہاد کشمیر میں ریاست دیر سے قریباً دو ڈھائی ہزار مجاہدین نے شرکت کی مگر ان میں بہت ہی کم مجاہدین واپس آ سکے اور شہداء کی لاشیں بھی ادھر ہی رہ گئیں۔

جہاد کشمیر میں شرکت کرنے والے شہداء کے وارثین کیلئے والی سوات نے سپاہی ایک ہزار، حوالدار بارہ سو، صوبیدار پچیس سو روپیہ آدا کئے۔ ادھر نواب نے مجاہدین کے ورثاء کیلئے کوئی وظیفہ مقرر نہ کیا البتہ جب حکومت پاکستان نے مجاہدین کے ورثاء کیلئے فی شہید ایک ہزار روپیہ وظیفہ مقرر کیا۔ تو نواب نے کہا کہ یہ وظیفہ کم ہے، اسطرح مجاہدین کے ورثاء کا وظیفہ ملاکنڈ پولیٹیکل ایجنٹ کے پاس پڑا رہا اور سینکڑوں شہداء کے ورثاء اس بھاری وظیفے سے محروم رہ گئے۔ جہاد کشمیر میں شرکت کرنے پر حکومت پاکستان نے نواب کو ''غازیٔ ملت'' کا خطاب دیا اور جہاد شرکت کی وجہ سے بہت عرصہ تک پاکستان اور ریاست دیر کے تعلقات خوشگوار رہے

---

[1] ''رواں دواں'' کے صفحہ ۱۰۱ پر

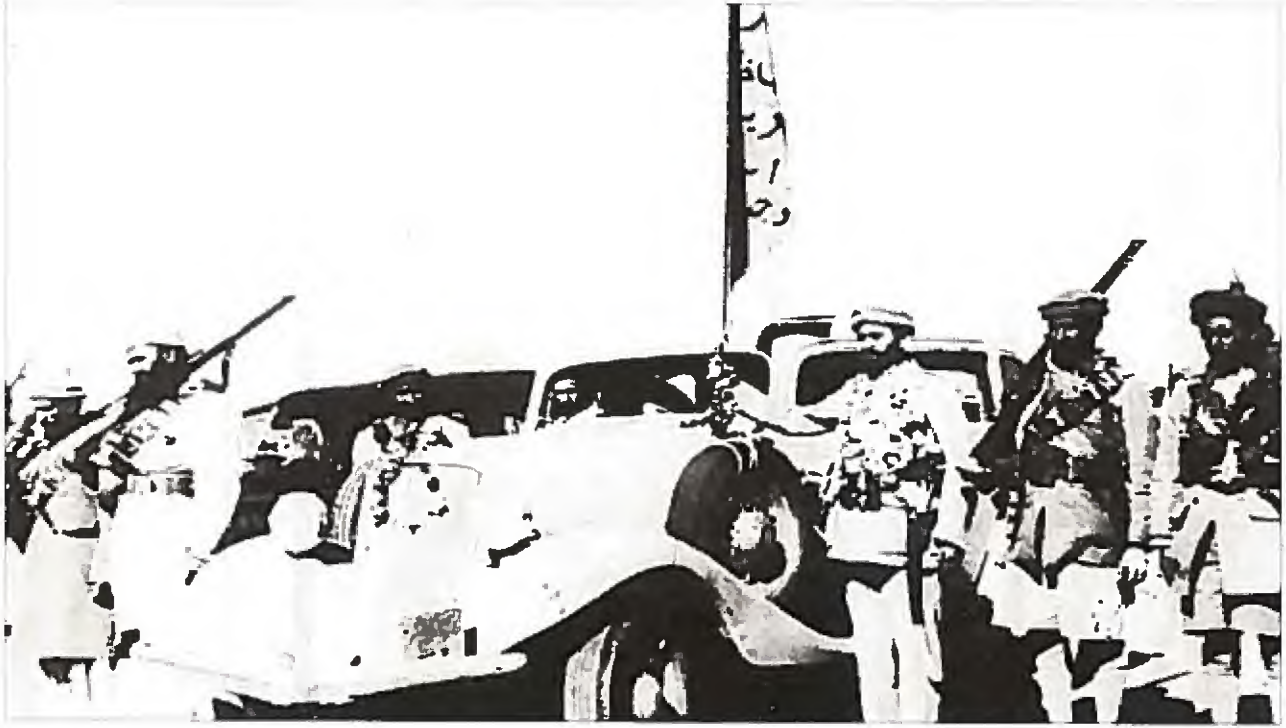

تحصیل دار عبداللہ جان کی سربراہی میں 800 سپاہیوں کا دستہ جہاد کشمیر کیلئے روانگی سے قبل (چکدرہ)

BLACK SET-3

اقتدار شاہ جہان کے
دوام بخش محرکات

نواب شاہ جہان نے قوم پر مطلق العنان کی حیثیت سے چھتیس سال حکومت کی ۔اس کی پالیسیوں کی جہاں قوم مخالف تھیں ۔وہاں انگریز اور بعد میں حکومت پاکستان ریاستی انتظام میں اصلاحات اور ترقی کا بار بار مطالبات کر رہی تھی ۔مگر ثابت قدم حکمران اپنی پالیسیوں پر ڈٹا رہا اور اول سے آخر تک وہ انداز اپنایا جو اس کے جی کو بھایا۔

وہ قوم کی جائیداد اور معیشت پر قابض تھا، اس کے کارندے ظلم وستم ڈھا رہے تھے ۔نواب کے ریاست میں ہزاروں دشمن تھے ۔اس کا تختہ الٹنے کیلئے ابتداء سے بااثر خاندانوں نے سعی شروع کر رکھی تھی مگر حکمران نے آخر وقت تک انھیں موقع نہ دیا کہ وہ اسے اقتدار سے ہٹا دیں ۔یہ حکمران کی عقلمندی کا ثبوت ہے کہ اس نے اقتدار کو لمبے عرصے تک دوام دیا۔دوام اقتدار کے چند محرکات درجہ ذیل ہیں ۔

بااثر خاندانوں سے انتظامیہ کی تشکیل

اکثر اہم عہدے کمزور خاندانوں کے پاس تھے مگر جمالدار، صوبیدار بہت بااثر خاندانوں سے لئے گئے ۔اسی طرح ہر قوم یا گاؤں پر بااثر خان یا ملک نواب کی طرف سے مقرر کیا جاتا۔ریاست میں تقریباً چار سو کے لگ بھگ خاندان انتظامی امور کی صورت میں نواب کی حکومت میں شامل رہے کچھ ڈر سے اور کچھ مراعات اور وظیفوں کے لالچ سے ۔اسی طرح انتظامی افسروں، خوانین، ملکان، قومی مشران اور تجارتی ٹھیکیداروں نے نواب کے اقتدار کو طول دینے میں اہم کردار ادا کیا۔

گروہ سازی

نواب کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ اس نے ہر قبیلے اور ہر گاؤں میں اپنے حمایتی پیدا کر رکھے تھے ۔خان، ملک، ملا اور قاضیان جو اپنے اپنے علاقوں میں اس کے قصیدہ خواہاں رہے ۔اس نے اپنے بھائی عالمزیب خان کے خلاف قوم کو اعتماد میں لے کر مضبوط گروہ بندی کی ۔اس نے قوم کو پسماندہ رکھا جائیدادیں ہتھیائیں، ظلم وستم ڈھائے مگر اس نے قوم کو ایسا اعتماد میں لیا ہوا تھا کہ بیشتر رعایا اس کی مداح رہی اور دشمن بھی اس کی عقلمندی اور گروہ سازی کی تعریف کرتے تھے ۔پشتون روایات اور اقدار سے پیار کرنے والے بزرگ آج بھی نواب کے بارے میں ایک بھی برا لفظ سننے کے روادار نہیں ہیں ۔اور آج بھی اس کی یاد میں آنسو بہا رہے ہیں ۔

بااثر خاندانوں میں رشتے

عقلمند حکمران نے ریاست میں جہاں بھی رشتہ جوڑا اس میں اس کا کچھ نہ کچھ سیاسی مقصد رہا ۔اس نے ریاست میں بااثر قبیلوں اور خاندانوں سے رشتے کئے جو اس کے تخت و تاج پر مضبوط میخیں ثابت ہوئیں۔

☆ نوب محمد شاہ جہان کی ایک بیوی براول سے تھی۔اس رشتہ سے حکمران براول کے مشہور قبیلے بھادر شاہ خیل کا داماد بنا اور اثر ورسوخ حاصل کیا یاد رہے کہ نواب اورنگزیب کا سپہ سالار صفدر خان اور کئی اہم درباریوں کا تعلق بھی اسی قبیلے سے تھا۔

☆ نواب کا بھائی عالمزیب خان جندول کے بااثر قبیلے مست خیل کے سردار سید احمد خان کا داماد تھا ۔حکمران نے یہاں بھائی کا اثر ورسوخ کم کرنے کیلئے سید احمد خان کی دوسری بیٹی سے شادی کی۔

☆ حکمران نے کوہستان میں گرڑی گاؤں کے مشہور ملک غلام ملک کی بیٹی سے بیاہ کیا۔

☆ 1929ء میں جب نواب نے عالمزیب خان سے جندول قبضہ کیا تو جندول کے طور قلعہ میں چچازاد بھائی حیات اللہ خان عرف ڈوڈباہ خان کو انتظامی افسر مقرر کیا۔بغاوت اور غداری کے تدارک کیلئے اپنی بیٹی حیات اللہ خان کے بیٹے سے بیاہ دی۔

☆ نواب نے سلطان خیل قوم میں اثر رسوخ بڑھانے کیلئے اخونزادگان میں حضرت سید اخونزادہ کی بیٹی سے ولی عہد محمد شاہ خسرو کی شادی کرائی۔

☆ نواب نے وادی میدان میں ترکلانی قبیلے کے حکمران خاندان بانڈئی خانان میں اپنی بیٹی بیاہ دی۔

مذکورہ علاقے نہ صرف جغرافیائی لحاظ سے انتہائی اہم تھے بلکہ مذکورہ خاندان اپنے علاقوں میں کافی اثر ورسوخ کے مالک تھے۔

پڑوسی حکمرانوں سے رشتے

ریاست دیر کے سنگ واقع ریاست سوات روشن خیال اور ترقی پذیر ریاست تھی۔نواب شاہ جہان نے آس پاس کی ریاستوں کے حکمرانوں کو رشتوں کی زنجیروں میں اس بناء پر جکڑا تا کہ ان حکمرانوں کے سوات سے رابطے کم رہیں اور سوات کی ترقی اور پالیسیوں کا اثر آس پاس کی ریاستوں تک نہ پہنچے۔

ریاست چترال میں نواب نے خود شادی کی،اس کی ایک بہو بھی چترال کی شہزادی تھی اور وہاں کے ایک مہتر ناصر الملک کو داماد بنایا۔باجوڑ کے حکمران کے ہاں شہاب الدین کا رشتہ کیا۔ریاست مردان کے نواب اکبر خان ہوتی کا بیٹا محمد عمر خان نواب دیر کا داماد تھا۔نواب نے سوات میں بھی اثر ورسوخ بڑھانے کیلئے وہاں کے مشہور خاندان میں شادی کی۔نواب نے نوشہرہ کے امیر تاجر بدر خومیاں کی بیٹی سے شادی کی اور اس زمانے کے مشہور سیاستدان اور عالم پیر مانکی شریف کے ہاں اپنی بیٹی بیاہ دی۔

دیکھا جائے تو اپنے ہاتھ مضبوط کرنے اور سیاسی طاقت حاصل کرنے کیلئے رشتوں کا یہ جال پھیلایا گیا۔آس پاس کے حکمرانوں سے رشتے داریاں ہونے کی وجہ سے نواب کا ان علاقوں پر کافی اثر ورسوخ رہا۔نواب کی موجوگی میں باجوڑ،چترال اور مردان کے حکمران نہ سوات کے حکمرانوں سے رشتے استوار کر سکے اور نہ ہی سفارتی تعلقات قائم کر سکے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ ریاست سوات کی علمی،معاشی اور تہذیب وتمدن کی ترقی کا اثر چترال ،باجوڑ اور مردان تک نہیں پہنچا۔1938ء میں چترال میں پہلا مڈل سکول قائم کیا گیا۔اس کے بعد چترال میں بیرونی مداخلت شروع ہوئی اور چترال کا تختہ ڈگمگاتا ہوا ایسا گرا کہ پھر کبھی سنبھل نہ سکا۔مہتر چترال سیف الرحمٰن کا ہوائی جہاز لواری کے پہاڑوں میں گر کر پاش پاش ہوگیا۔کہا جاتا ہے کہ اس حادثے کے پیچھے بھی کسی کا ہاتھ تھا۔

طاقتور قبائل کی حمایت

ریاست میں افرادی اور جنگی قوت کے لحاظ سے تین قومیں مثالی رہیں۔ سلطان خیل، پائندہ خیل اور ترکلانی قبائل۔ اولذکر دو برادریاں نہاگ درۂ، عشیرئی درّہ، درہ سلطان خیل، خال اور طور منگ درۂ وغیرہ علاقوں میں آباد تھیں۔ اور ترکلانی قبیلہ میدان، براول اور جندول میں۔

اپنے اقتدار کو دوام بخشنے کیلئے نواب نے سلطان خیل اور پائندہ خیل کے طاقتور قبائل کو ایک ڈھال کے طور پر استعمال کیا۔ ان قبائل کی طاقت کو بھانپ کر دوسرے قبائل کی نسبت انھیں بہت سی مراعات سے نوازا گیا۔ حکمران نے نہاگدرہ، عشیرئی درّہ، کاروڈرہ اور درّہ سلطان خیل وغیرہ میں اپنے حمایتی سردار پیدار کھے تھے جو نہ صرف مراعات، برات اور عہدوں کی لالچ میں حکومتی کے حمایتی تھے بلکہ اپنی برادری اور حکومتی مخالفین کو دبانا اور کمزور رکھنا ان کا کام تھا۔

ترکلانی قبائل

نواب نے اس قبیلے کو سلطان خیل اور پائندہ خیل کے ذریعے دبائے رکھا۔ اس قبیلے کی حدود میں زیادہ قلعے بنائے گئے اور لشکر بھی زیادہ تعینات رکھے گئے [1] ریاض الحسن لکھتے ہیں سلطان خیل اور پائندہ خیل کو نواب اسلئے مواجب دیتا اور انھیں آزادی دی تھی کہ بوقت ضرورت ان قبائل کو دوسرے لوگوں کے خلاف استعمال کر سکے۔ چنانچہ کئی دفعہ حکمران نے ان قبائل کو اپنے مقصد کیلئے استعمال کیا۔

ریاست کے باقی قبیلوں، اوسی خیل، نصرالدین خیل، وردگ، مشوانی اتمان خیل وغیرہ اتنے طاقتور نہ تھے کہ وہ حکمران کی فوج اور سلطان خیل اور پائندہ خیل سے ٹکر لے سکیں۔ ان قبائل کو کمزور رکھا گیا اور عہدے بھی کم دیئے گئے۔ نواب خود انتہائی امیر اور رعایا مفلس تھی۔ اس نے قوم کو ناخواندہ اور جاہل رکھ کر ریاست تک محدود رکھا۔ اس کی فوج تیرہ ہزار افراد پر مشتمل تھی بااثر خاندان اور عمائدین اس کی انتظامیہ کا حصہ تھے۔ اس صورت میں کوئی چھوٹا قبیلہ اس کے خلاف آواز نہیں اٹھا سکتا تھا۔

---

[1] داستان دیر ۶۳ صفحہ

جاسوسی نظام

تیز جاسوسی نظام نے بھی نواب کو بغاوتوں اور انتشار سے محفوظ رکھا۔ ریاست میں حکومت وقت کے خلاف کوئی منصوبہ بنایا جاتا تو تیز جاسوسی نظام کے زریعے خبر پا کر حکومت وقت فوری متحرک ہو کر ایسی شورش کو بروقت دبا دیتی۔ یہی وجہ تھی اس زمانے کے مشہور اور طاقتور گھرانے حکومت کے خلاف ہونے پر ایک ایک کر کے کمزور کر دیئے گئے یا ریاست بدر کر دیا گیا یا اپنے برادری کے مختلف تنازعات میں الجھا دیا گیا۔

اقتدار میں آتے ہی نواب نے جاسوسی نظام پر خاص توجہ دی اور اس سلسلے میں وہ انتہائی حساس ثابت ہوا۔ افسروں کی کارگزاری اور وفاداری جانچنے کیلئے ان میں سے کئیوں کو ایک دوسرے کے پیچھے لگا دیا۔ خواص کے علاوہ عام لوگوں مثلاً گڈریا، ڈوم، پراچگان میں بھی کئی لوگ نواب کے بھیدی تھے۔ یاد رہے کہ انگریزوں کی طرح ریاست دیر کے جاسوس اکثر ملا ہوا کرتے تھے۔ گاؤں سندرول کا ایک نامی گرامی ملا نواب کا خاص جاسوس تھا۔

ملاکنڈ انتظامیہ کی جاسوسی

ملاکنڈ میں انگریز پولیٹیکل ایجنٹ کے کارندے نواب کے ہم راز تھے۔ پولیٹیکل ایجنٹ کے دورہ ریاست کے موقع پر نواب کو پہلے ہی سے معلومات بہم پہنچاتے اور دورے کے اغراض و مقاصد کے متعلق اسے آگاہ کرتے۔ نواب ہنگامی اجلاس بلا کر اس موضوع کو زیر بحث لاتا تا کہ بوقت ضرورت ٹھوس دلائل سے مہمان کو قائل کیا جا سکے۔ پولیٹیکل ایجنٹ کے مزاج کے بارے میں موصولہ معلومات کے تحت اس کی خاطر تواضع کی جاتی اور اس کو مرعوب کیا جاتا۔ ایک انگریز افسر کے پوچھنے پر نواب نے بتایا کہ ساری ملیزئی قوم اس کی جاسوس ہے۔

پڑوسی ریاستوں میں جاسوس

ریاست سے باہر بھی نواب کے جاسوس سرگرم عمل تھے۔ اکثر اہم شخصیات کے پیچھے لگ کر دور دور تک ان کا تعاقب کرتے اور ان کی سرگرمیوں سے حکمران کو آگاہ کرتے۔ چترال اور سوات کے شاہی

خاندانوں کے نوکر اور نوکرانیاں بھی ریاست دیر کیلئے جاسوسی میں مصروف رہیں۔

حضرت صاحب (موضع طوطہ کان) انکشاف کرتے ہیں کہ'' ایک شام میں اپنے دوست تحصیلدار ادینزئی فضل غفور کے پاس بیٹھا تھا۔ایک شخص آیا اور سرگوشی میں کچھ بتانے لگا تحصیلدار یہ باتیں کاغذ پر فارسی میں درج کرتا رہا۔جاتے وقت اس شخص کو دس روپیہ کا نوٹ تھما دیا گیا۔معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ یہ شخص والی سوات کے محل کا موچی تھا اور خفیہ معلومات لے کر آیا تھا''۔چترال میں نواب کے جاسوس اکثر تاجر ہوا کرتے تھے۔ان کا سربراہ اتالیق سرفراز شاہ تھا۔

چند مثالیں

1933ء میں جب محل کی از سر نو تعمیر شروع ہوئی تو تزئین و آرائش کا سامان لینے کیلئے گران جان نامی تاجر کو ہندوستان بھیجا گیا۔سامان خریدنے کے بعد بمع رسید جب یہ شخص دیر پہنچا تو اسے اندازہ ہوا کہ اس کی خرد برد کی خبر نواب تک پہنچ چکی ہے۔دراصل جاتے وقت اس کے ساتھ جاسوس لگا دیئے گئے تھے ان کے ذریعے ساری معلومات نواب تک پہنچیں۔یہ شخص دم دبا کر کابل بھاگ گیا اور کبھی واپس نہ آیا یاد رہے کہ بعد میں یہ شخص ریڈیو کابل سے خبریں سنانے پر مامور ہوا۔

مردوں کے علاوہ ریاست میں زنانہ مخبر بھی سرگرم تھیں۔ایک دفعہ چینو مرزا نامی تاجر سے چوری ہوگئی۔موضع تنگی درّہ میں ایک مشکوک شخص کے گھر ایک زنانہ جاسوس بھیجی گئی جس نے چور کی بیوی سے راز اگلوالیا اور یوں وہ چوری پکڑی گئی۔

عشر اور اناج وصولی کے موسم میں جاسوس دندناتے پھرتے تھے۔واقعہ مشہور ہے کہ ایک زمیندار نے ٹیکس کی کم ادائیگی کیلئے پھلوں کی پیداوار کا کچھ حصہ چھپایا۔تو نواب نے باغ کے پھل اور مالٹوں کی اصل پیداوار بتا کر اسے بوکھلاہٹ سے دوچار کیا۔

صحافت کے بارے میں رویہ

اخفائے راز

نواب نے راز چھپانے کا گر تخت و تاج لینے سے پہلے ہی سیکھ لیا تھا۔ تخت نشین ہونے سے پہلے بھی اس کا ماسٹر پلان خفیہ رہا اقتدار میں آتے ہی وہ اپنے خوابوں کو عملی جامہ پہنانے لگا۔ نواب کو جہاں ریاست کے ہر کونے سے خبریں ملتی رہیں وہاں ریاستی معاملات اور محل کی معلومات انتہائی حد تک خفیہ رہیں۔ خزانہ میں رکھی دولت کا کسی کو پتہ نہ چل سکا، اسلحہ کی مقدار، اناج، اخراجات وغیرہ بھی خفیہ رہے۔ سفر اور راستے کا انتخاب بھی وہ خود کرتا۔ پولیٹیکل ایجنٹ سے ملاقات ہوتی تو دوبدو اور بات چیت پشتو میں ہوتی۔

(یاد رہے کہ انگریز پولیٹیکل ایجنٹ کو ملاکنڈ میں تعیناتی سے پہلے پشتو سیکھنا پڑتی تھی)۔

قومی شعور اور حالات حاضرہ سے باخبر رہنے کیلئے صحافت کا کردار مسلّم ہے۔ دوسری جانب نواب نے اپنے لوگوں کو دنیا میں رونما ہونے والے واقعات سے بے خبر رکھا۔ اور اسلئے بھی کہ اگر صحافت فروغ پائے تو لوگ اس کی اکثر پالیسیوں سے اختلاف کرنے لگیں گے۔ لہذا نواب نے دیر میں صحافت کو پنپنے نہ دیا۔ آزادی صحافت پر قدغن لگائی اور معلومات کی آزادانہ ترسیل پر پابندی لگائی۔

پریس اور ریڈیو سٹیشن پر اثر دخل

نواب نے ریاست میں ڈاک نظام کو محدود رکھا تاکہ باہر سے ایسی معلومات نہ آئیں جو رعایا کی ذہنیت کو بدل کر باغیانہ خیالات سے روشناس کر سکیں۔ ریاست سے باہر معلومات کی منتقلی، باغی قبائلی سرداروں سے رابطہ اور خطوط کی آزادانہ ترسیل پر بھی پابندی تھی۔ باہر سے آنے والا ہر خط سرکار کی چھلنی سے گزر کر پہنچتا۔

ایرانی سیاح محمود دانشور ''بسوئے کافرستان'' میں لکھتے ہیں ''میں نے والی سوات اور نواب دیر پر رپوٹ تیار کر کے پشاور پریس اور ریڈیو سٹیشن کو شائع کرنے کے لئے دی۔ اگلی صبح میری حیرت کی انتہاء نہ رہی کہ دیر کے متعلق ایک سطر بھی شامل نہیں کی گئی تھی''۔

دستاویزات پر پابندی

1951 میں محمود دانشور دیر آئے اور واپسی پر انھوں نے حکمران دیر کی عیاشی اور ظلم وستم پر اپنے سفرنامے میں تفصیلی روشنی ڈالی۔ کتاب شائع ہوئی تو مشیروں کی مشاورت سے اس کی ساری کاپیاں خریدی گئیں ۔کتاب کی مارکیٹ کو دیکھ کر مصنف نے مزید چھپائی کا آرڈر دیا۔

دوبارہ اشاعت پر نواب برانگیختہ ہوا اور حکم دیا کہ چھاپے مار کر کتاب کو ضبط کرلیا جائے اور جس کے پاس بھی ملے اسے سزا دی جائے۔ پولیٹیکل ایجنٹ سے رجوع کر کے اسے باور کرایا گیا کہ کتاب میں لکھے گئے واقعات میں کوئی حقیقت نہیں اور یوں پولیٹیکل انتظامیہ کو بھی اس کتاب پر پابندی لگانے کیلئے قائل کر دیا۔ یہ بہت نایاب کتاب ہے۔

ایرانی سیاح کے بعد ''داستان دیر'' دوسری تصنیف تھی جس میں نواب شاہ جہان کے ظالمانہ طرز حکومت کو نشانہ بنایا گیا۔ راقم پر انکشاف ہوا کہ اس کتاب کے مصنف میاں گل ریاض الحسن المعروف بہ سفیر صاحب (پڑپوتا تیمر گرہ بابا جی صاحب) پر دو مرتبہ قاتلانہ حملے کیا گیا۔ یوں انھیں مسلح رہنا پڑا۔ 1959ء میں ترکلانی قبیلے کی بغاوت کے دوران نواب کے سپاہیوں نے ظلم وستم ڈھائے تو اس بارے میں مردان کے ایک صحافی عبدالقدوس نے روزنامہ ''جانباز'' میں ایک کالم لکھا۔ ردعمل کے طور پر ریاستی غنڈوں نے اس صحافی کو زدوکوب کیا۔

ریاست سوات میں والی نے صحافت کو فروغ دیا۔ اخبارات والی کے پالیسیوں پر کھل کر تنقید کرتے تھے یوں آج سوات میں شمال، آزادی، خبرکار، سلام اور چاند کے نام سے کئی اخبارات شائع ہوتے ہیں۔

رعایا کی زبان بندی

ایک دن کسی زمیندار سے بیوی نے کہا "سڑیہ نن م داسی پلاو پخ کڑے دے چه داسی به شاه جهان نواب هم نه وی خوڑلے" ۔آج ایسا پلاؤ پکایا ہے جو نواب شاہ جہان نے بھی نہیں کھایا ہوگا۔ یہ بات پڑوسی کے ذریعے نواب تک پہنچی۔ اگلے روز اسے بلایا گیا۔ اور عمائدین کے مجمع میں اس شخص کو مخاطب کیا۔

" فلانکیه دا راته ووایه چه ستا پلاو خوگ دے او که زما ،تا ته هغه بله وړز خزے د پلاو متعلق سه وئیلی وو". ''بتاؤ تو میرا پلاؤ لذیذ ہے یا تمہارا۔ تمہاری بیوی نے اس روز پلاؤ کے متعلق کیا کہا تھا''۔ یہ سنتے ہی وہ شخص حیران رہ گیا کہ یہ بات نواب تک کیسے پہنچی۔ یہ بات کریدنے کا ظاہری مقصد یہ تھا کہ حاضرین کو یاددہانی کرائی جائے کہ ان کے گھریلو معاملات بھی نواب سے ڈھکے چھپے نہیں ہیں۔

اس واقعہ کو مثال بنانے کیلئے اس شخص کو مجبور کیا گیا کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے۔ یہ بات ریاست میں پھیل گئی تو لوگوں کی زبانیں گنگ ہوگئیں۔ حکمران عیش پرستانہ زندگی گزار رہا تھا۔ یہ باتیں خفیہ رہیں اور کسی کو جرأت نہ ہوسکی کہ وہ محل یا حکمران کے ذاتی مصارف کے متعلق جان سکے۔

تحریک آزادی دیر

دیر کے غیور اور بہادر مجاہد

نواب کے چنگل سے آزادی کیلئے دیر کے ہر گاؤں اور ہر قبیلے نے اپنا کردار ادا کیا۔نواب کا ڈھڑن تختہ کرنے کیلئے اس کے خاندان نے بھی دیر کے عوام کا ساتھ دیا۔ بھائی عالمزیب خان اور بیٹا محمد نواز خان ریاست سے باہر تحریک چلاتے رہے۔اور ولی عہد محمد شاہ خسرو نے والد اور بھائی شہاب الدین خان کو اقتدار سے ہٹانے میں حکومت پاکستان کا ساتھ دیا۔

دیر کی آزادی میں نہا گدرہ (کوٹ، ڈوگرام)، عشیرئی درہ، میدان، ادین زئی، خال، جندول، بروال، کوہستان کے بہت سے لوگوں نے ہجرت کی جس میں انھیں اپنی قیمتی جائیداد بھی گنوانا پڑی۔دیر کی آزادی کی خاطر سمکوٹ، نہا گدرہ، خال، طورمنگ اور میدان کے کئی گاؤں جل کر خاکستر ہوئے۔

سینکڑوں خاندان اپنا مال ومتاع چھوڑ کر ریاست سے ہجرت پر مجبور ہوئے۔ان میں خال اخونزادگان، شاہ ذوالله خان (شجادئی)، ملیز ئے خان (سمکوٹ)، بٹئی جان میدان، کونکی خوانین، رباط کے زریف خان، عبدالله خان (رباط)، مست خیل خوانین، گنڈھیرئی حکیم، بادین استاذ، نہا گدرہ کے ماندار یف ملک، زریف خان ملک، ملک پام جان اور اجڑ ملک، نملئی خان عشیرئی درّہ، ہارون ملک طورمنگ، محمد خان چکدرہ، گندیگار کے میاں امیرزادہ، میاں سلطان یوسف، میاں فضل خالق، میدان کے محمد امین ملک المعروف بہ گل ملک سمیت وغیرہ شامل ہیں۔ایسی قربانیاں دینے والوں میں ایسے سینکڑوں گھرانے شامل ہیں جو آج پشاور، مردان، باجوڑ سے لیکر ملک کے کونے کونے میں آباد ہیں۔ایسے ہی قربانیاں دینے والوں میں چند ایک کا ذکر ذیل میں ملاحظہ ہو۔

معرکہ سمکوٹ

عشیرئی درہ میں واقع سمکوٹ گاؤں تاریخی اہمیت کا حامل گاؤں ہے۔یہاں آباد خانان کا تعلق نواب کے قبیلے اخون خیل سے ہے۔نواب شاہ جہان نے سمکوٹ خانان کے ہاں پرورش پایا تھا۔لیکن اقتدار میں آتے ہی اس نے ریاست کے بااثر خاندانوں سے زور آزمائی شروع کی۔سمکوٹ کے ایک خان ٹائی خان اس زمانے ایک طاقتور خان تھا۔نواب سے سیاسی کشیدگی پیدا ہونے پر نواب نے اپنی لشکر کو سمکوٹ گاؤں پر حملہ آور کروایا۔سلطان خیل قبیلے نے سمکوٹ خوانین کا ساتھ دیا اور ایک خونریز جنگ ہوئی۔جس میں

ریاستی فوج کا بڑا نقصان ہوا۔اس جنگ میں قریباً ایک سو تیس لوگ مارے گئے۔اس جنگ میں کافی بہادری سے ڈٹ کر لڑنے کے بعد آخر سمکوٹ خوانین نے شکست تسلیم کیا اور ایک جابر حکمران کے ہاتھوں یہ خاندان مردان تک ہجرت پر مجبور ہوئی۔

گمنام ہیرو

نواب کا تختہ الٹنے میں جن غیور اور بہادروں نے حصہ لیا ان میں ایک بہادر، غیور، عالم فاضل اور حریت پسند نرہانڑ ملا (قوم پاپینی سادات اصل بخاری سادات) تھے۔اصل نام محسود الحسن تھا مگر داروڑہ کے نزدیک واقع گاؤں نرہانڑ سے تعلق کی نسبت سے نرہانڑ ملا کہلائے۔

آپ نے ابتدائی تعلیم دیر سے حاصل کر کے ہندوستان جا کر دیوبند میں داخلہ لیا جہاں سے فقہ اور دوسرے علوم میں مہارت حاصل کی۔دیر کے ترناوَ باباجی کے علاوہ مولانا مفتی محمود دیوبند میں آپ کے ساتھ تھے۔دیوبند سے واپس آئے تو مشہور مذہبی بزرگ شاوَ بابا (مرید سید و بابا) کی بیٹی سے شادی کی۔

نرہانڑ ملا کی ذہانت اور علم و سیاست کی خبر پا کر نواب شاہ جہان نے انھیں براول میں قاضی مقرر کیا۔جب انھوں نے عدالتی نظام میں حکمران کی مداخلت دیکھی تو استعفیٰ دے دیا۔آپ نے داروڑہ اور گردنواح میں دین کا پرچار شروع کر دیا۔بمقام داروڑہ قوم پاپینی کی جائیداد میں ایک شکارگاہ کو نواب نے قبضہ میں لینے کا ارادہ کیا تو نرہانڑ ملا نے اسے دینے سے انکار کر دیا۔یوں انھیں دیر سے بے دخلی کا حکم دیا گیا۔آپ کا جسم مضبوط، توانا اور شخصیت قدر آور تھی یوں انھیں ''ڈمبور ملا'' سے مشہور کیا گیا۔

ریاست سے باہر جا کر آپ نے تخت بھائی میں سلور اور تانبے کی تجارت شروع کی۔مسلم لیگ میں شمولیت کے علاوہ آپ نے نواب کے خلاف باغیوں کو متحد کر کے ایک محاذ بنایا۔آپ ایک پرجوش مقرر اور بلند پایہ ادیب بھی تھے۔نواب کے خلاف ایک کتاب ''ریاست دیر پر تنقیدی نظر'' لکھی۔اس کے علاوہ پمفلٹ چھپوا کر اپنے پیروکاروں کے ذریعے تقسیم کرواتے رہے۔آپ کو کئی بار دھمکیاں موصول ہوئیں مگر آپ نے اپنی مہم جاری رکھی۔

آپ ہی کی وجہ سے نواب نے باغیوں سے پہلی بار مذاکرات کیے۔پولیٹیکل ایجنٹ کی وساطت سے باغیوں کا جرگہ ملاکنڈ آیا مجلس میں الہ ڈھنڈ اور تھانہ کے عمائدین بھی موجود تھے۔اس نڈر اور

بے باک مقرر نے نواب کو مخاطب کر کے کھری کھری سنائیں جس کے نتیجے میں مذاکرات ناکام ہو گئے۔

یہ قائد ایک روز چند دوستوں کے ساتھ تخت بھائی کے پاس ''پرخوڈھیرئی'' نامی گاؤں میں سے گزر رہے تھے۔ کہ اچانک چند مفروروں نے انھیں گھیرے میں لے لیا اور گھسیٹ کر گنے کے کھیت میں لے جا کر شہید کردیا۔ سر تنے سے جدا کر کے باقی جسم پر مٹی کا تودہ گرادیا۔ دس ہزار روپیہ کے عوض سر کو فروٹ کے کریٹ میں بند کر کے ایک کارندے کے حوالہ کیا گیا۔ یہ کریٹ سورج ڈھلتے وقت دیر پہنچا جہاں ایک شخص اپنے دشمن کا سر دیکھنے کیلئے بے تاب تھا۔

کریٹ کھول کر کارندہ کانپتے ہوئے پرے کھڑا ہو گیا۔ اس شخص نے دشمن کے سر کو اٹھایا اور گھور کر دیکھنے لگا غصہ میں پاگل اس نے کہا ''اچھا تو تم میرے پیچھے اپنی گندی زبان استعمال کرتا رہا'' گالیاں دیتے ہوئے آپے سے باہر ہو گیا اور سر کو دور پھینکا جو دیوار سے جا ٹکرایا۔ سر کے پاس پہنچ کر وہ اس کے ہونٹوں کو لاتیں مارتا رہا۔ پھر پالتو کتے منگوائے گئے۔ کتے خفیہ تہہ خانے میں بو سونگھتے اور بھونکتے ہوئے پہنچے۔

مالک جو بغور دیکھ رہا تھا، کی خواہش تھی کہ کتے اس پر پیشاب کریں مگر کتوں نے پیشاب کی بجائے سر کے سامنے اپنے سر جھکا دیئے اور سسکنے لگے۔ تاریکی چھا گئی اور سر کو کارندوں نے اٹھایا مگر آج تک پتہ نہ چل سکا کہ سر کہاں گیا۔

شہید کی بیوی کو خبر ملی تو ڈر کے مارے ایک سالہ بیٹے کو سینے سے لگائے فرار ہو کر پہاڑی راستوں سے مردان پہنچی۔ اپنے قائد کی شہادت کے ردعمل کے طور پر باغیوں بٹئی جان اور بہرور سید اخونزادہ وغیرہ نے ملاکنڈ انتظامیہ سے احتجاج کیا جس کے نتیجے میں مشکوک افراد کو گرفتار کیا گیا۔ ریمانڈ کے بعد راز اگلوا کر ملزمان کی نشاندہی پر لاش حاصل کی گئی اور دیر لے جا کر بمقام کمبڑ میدان دفن کر دی گئی۔ باغی سرداروں نے اپنے قائد کے معصوم بچے مختیار علی کو مردان میں شمسی روڈ پر واقع سرحد یتیم خانے میں داخل کرادیا۔ 1952ء میں اس عالم کی شہادت سے باغیوں کی تحریک کافی سرد پڑ گئی۔ ریاست میں قتل کا جرمانہ پانچ سو روپیہ تھا مگر اس واقعہ کے بعد اس شہید کے قبیلہ کدی خیل پر جرمانہ دوگنا یعنی ایک ہزار کر دیا گیا۔

شہید کی جائیداد پر رشتہ داروں (تربوروں) نے قبضہ کرلیا اور ان کی سلور اور تانبے کے برتنوں

کی دکان بھی دیر کی آزادی کی نذر ہوگئی۔ شہید کے تین بیٹے تھے مرحوم کا ایک بیٹا مختیار علی داروڑہ ہسپتال میں سپر وائزر ہے اور پوتے صوابی میں گاڑیوں سے سامان اتارنے کی محنت مزدوری کرتے ہیں۔ مرحوم کٹر مسلم لیگی تھے، قائداعظم سے دو دفعہ ملاقات کی۔ ایک پرجوش مقرر کی حیثیت سے مشہور تھے۔ سابق وزیراعلیٰ خان عبدالقیوم خان بھی آپکے قریبی دوست تھے۔ سابق ایم اپی اے ڈاکٹر محمد یعقوب مرحوم نے زمانہ طالب علمی میں مسلم لیگی قائد نرہانڑ ملا سے کئی ملاقاتیں کی تھیں اور ان سے کافی متاثر تھے۔ آپ نے گمنام ہیرو پر کتاب لکھنے کیلئے کئی مرتبہ داروڑہ جاکر معلومات اکٹھی کیں۔ مگر سیاسی مصروفیات کے باعث انہیں کتابی شکل نہ دے سکے۔

2005ء میں مرحوم نرہانڑ ملا کے بیٹے مختیار علی کو گورنر سید افتخار حسین شاہ نے پشاور میں چودہ اگست کے موقع پر ایک گولڈ مڈل سے نوازا جس پر ''گمنا ہیرو'' سنہری الفاظ سے کندہ تھا۔ ہماری تاریخی پسماندگی کا ایک بڑا ثبوت یہ بھی ہے کہ ہم نرہانڑ ملا جیسے نڈر اور دلیر حریت پسند عالم کے نام سے بھی واقف نہیں ہیں۔

نرہانڑ ملا کے بعد دیر کی آزادی کی خاطر قربانیاں دینے والوں میں عبدالغفار خان المعروف بہ ناگوتل ملک کا نام زندہ رہے گا۔ اس کا تعلق علاقہ میدان ناگوتل سے تھا۔ میدان کی بغاوت میں باٹڈئی خانان کے بعد یہ قبیلہ ترکلانی کی کمان کر رہا تھا، جب ترکلانی قبیلے نے فوج کو شرمناک شکست سے دوچار کیا۔ تو نوابی فوج غصے میں آپے سے باہر ہوگئی تھی، سپاہی ناگوتل ملک کو ڈھونڈنے لگے، چھاپوں کے دوران شام کو باغی رہنما ناگوتل ملک سپاہیوں کے ہتھے چڑھ گیا جس کو نہ صرف بڑی بے دردی سے شہید کیا گیا بلکہ زبان بھی کاٹ دی گئی۔

بارعب نواب کے دربار میں داخل ہونے پر بعض خان جھجک محسوس کرتے مگر بہت سے نڈر اور غیر تمند دربار کی چوکھٹ پر قدم رکھ کر شان وشوکت سے نواب کے پاس پہنچ کر کھری کھری سناتے۔ ایسا ہی ایک نڈر دڑہ سلطان خیل کا قومی سردار شیر محمد خان عرف میرے ملک تھا۔ میرے ملک اقوام سلطان خیل کا سردار تھا ریاست میں اس کا بڑا نام تھا اور یہ بڑی بے باکی اور دلیری سے حکومتی پالیسیوں کو تنقید کا نشانہ بناتا تھا۔

نواب موصوف کی عادت تھی کہ وہ قبائلی سرداروں سے الجھنے کیلئے طرح طرح کے حربے استعمال کرتا تھا۔ شیر محمد خان کو حکومت مخالف یا کر نواب نے اس کے علاقے میں جیکٹ نامی مقام کی

جائیداد پر قبضہ کرنے کا ارادہ کیا۔ جیکٹ چار اقوام کی جائیداد کا ایک مرکز تھا اسلئے شیر محمد خان نے صاف انکار کیا۔ اس کے بعد گویا ایک سرد جنگ شروع ہوگئی، نواب نے شیر محمد خان کو دربار بلایا جب وہ ملاقات کے بعد واپس جانے لگا تو نواب کا کتا اس کو کاٹنے کیلئے دوڑا۔ ملک نے اس کتے کو کئی لاتیں رسید کیں حتی کہ وہ چیختا چلاتا نواب کے کرسی کے پاس جا گرا۔ ملک نے مڑ کر کہا ''نواب صاحب پہ خپلہ مو خژوہ خو پہ سپو مو مہ خژوہ'' اس سے تعلقات اور بھی کشیدہ ہو گئے۔

نواب نے اس کی برادری کی مخالف قوم سید احمد خیل میں چند لوگوں کو عہدوں اور نوکریوں کا لالچ دیا۔ شیر محمد خان دیر خاص سے نواب سے ملاقات کے بعد قومی عمائدین سمیت واپس آرہا تھا۔ بیبیوڑ میں ''خان ڈبہ'' کے مقام پر مخالفین تاک میں بیٹھے تھے۔ جیسے ہی بس اترائی پر پہنچی تو ڈرائیور پر فائرنگ کی گئی جس سے بس بے قابو ہو کر نیچے گہرے کھڈ میں جا گری۔ بدقسمتی سے ملک شیر محمد خان بس کے نیچے آ گیا مگر اس نے پھر بھی اپنے ساتھیوں سمیت مخالفیں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جو بس پر گولیوں کی بوچھاڑ کرنے میں مصروف تھے۔ آخر کئی گولیاں لگنے کے بعد وہ جاں بحق ہو گیا۔

اس کے بعد شیر محمد خان کی جائیداد قبضہ کرنے کے علاوہ اس کا قلعہ گرایا گیا خاندان کو ہجرت پر مجبور کر دیا گیا۔ اور جن لوگوں نے اپنے بھائی سے غداری کی ان کو عہدے ملے نہ نوکریاں۔ شیر محمد خان چونکہ سلطان خیل قوم کا مشر تھا۔ اس کی وفات پر دو قوموں میں بعد میں تیس سال تک دشمنی رہی۔

تحریک وحدت ترکلانی

جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے کہ نواب نے سلطان خیل اور پائندہ خیل کو بے پناہ اختیارات دیئے تھے۔ دوسری طرف قبیلہ ترکلانی کو جہالت اور غربت کی چکی میں پیسنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ قبیلہ ترکلانی پر زیادہ بیگار عائد تھا۔ عشر سختی سے وصول کیا جاتا۔ بھاری جرمانے لگائے جاتے۔ انتظامی امور میں اس قبیلے کے افراد کی شرکت نہ ہونے کے برابر تھی۔ ایسی پالیسیوں سے نالاں اس قبیلے نے چار مرتبہ بغاوت کی مگر ہر مرتبہ اتحادی سلطان خیل اور پائندہ خیل سے حملہ کرا کر انھیں خاموش رہنے پر مجبور کیا گیا۔

ریاست پر مضبوط گرفت، تیز جاسوسی نظام، دولت مندی اور اثر ورسوخ کی وجہ سے نواب کا تختہ الٹنا کسی ایک قبیلے کا کام نہ تھا۔ قومی سطح پر مشترکہ جدوجہد کا مرکز مردان میں نواب کے بھائی عالمزیب خان کا گھر تھا۔ میدان، جندول، خال، عشیرئی درہ، نہا گدرہ سے باغی سردار یہاں جمع ہوتے تھے۔

1959ء میں عالمزیب خان کے گھر میں باغی سرداروں کا ایک جرگہ ہوا جس میں فیصلہ کیا گیا۔ کہ عالمزیب خان سوات کی طرف سے مشرقی پہاڑوں سے ہوکر نہا گدرہ میں داخل ہوکر لشکر تیار کرے گا۔ بادشاہ شہزادہ (بٹئی جان) کو باجوڑ کی طرف سے حملہ آور ہونے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ بانڈئی خانان، گل محمد امین ملک اور سپین لعلی ملک کو میدان میں لشکر تیار کرنا تھا۔ ملک عبدالحسیب کو جندول میں جبکہ خال اخونزادگان کو عشیرئی درہ اور طور منگ میں سلطان خیل قوم کو نواب کے خلاف ابھارنے کی ذمہ داری سونپ دی گئی تھی۔ باورچی خانے میں نواب کی جاسوس یہ سب کچھ سن رہی تھی۔ جس کی بدولت یہ خبر نواب تک پہنچی۔ مقررہ روز سے پہلے ہی چھاپے مار کر حکومت مخالفین کو گرفتار کرلیا گیا۔ تین سو سپاہیوں نے جاکر علاقہ اکاخیل درہ کا گھیراؤ کیا اور ملک تورلعلی کو گرفتار کر کے دیر قید خانے میں ڈال دیا۔

بغاوت 1959ء

نواب مستقبل میں وادی میدان پر بیٹے محمد شاہ خان کو حکمران بنانے کا خواہشمند تھا۔ اس غرض سے اس نے میدان میں مزید قلعے بنانے پر توجہ دی۔ میدان کے مشران کو بلا کر شیر حسن تحصیلدار نے جرگہ سے کہا کہ ''نواب کو فوج اور قلعے کیلئے زمین چاہیے''۔ لیکن جرگہ نے معذرت کی۔

ردعمل کے طور پر ریاستی حکام نے عوام کو تنگ کرنا شروع کردیا۔ ایک روز سپاہی عشر جمع کررہے تھے۔ زیادہ عشر لینا معمول بن گیا تھا جس سے عوام تنگ آگئے تھے۔ عید کے پانچویں روز یعنی چھ جون 1959ء کے دن ایک جگہ سپاہیوں اور عوام میں تلخ کلامی ہوئی۔ کھیتوں میں پائندہ خیل سپاہیوں نے مقامی لوگوں کو پیٹنا شروع کردیا، فائرنگ ہوئی اور چار سپاہی مارے گئے۔ یہ واقعہ بڑا عجیب تھا کیونکہ پینتیس سال میں پہلی مرتبہ حکومتی کارندوں کا یہ حشر دیکھنے میں آیا۔ یہ سن کر ترکلانی قبیلہ کے لوگ ادھر جمع ہونا شروع ہوگئے۔ ہجوم نے آہستہ آہستہ جلوس کی شکل اختیار کرلی عوام میں غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی۔ جلوس نے حیاسیرئی پہنچ کر قلعے کا محاصرہ کرلیا۔

جندول خان کی میدان پر چڑھائی

قلعے کے دروازے بند تھے۔اتنے میں جندول خان جیپ کے ذریعے منڈا سے آ پہنچے۔ جندول خان کے پہنچتے ہی فوج حرکت میں آ گئی اور جلوس منتشر ہو کر فرار ہو گیا۔جندول خان نے والد کو خبر دینے کیلئے جیپ دیر خاص روانہ کر دی۔کیونکہ ٹیلیفون لائن پہلے سے کاٹ دی گئی تھی۔حیا سیرئی قلعہ میں کچھ نظم وضبط سنبھالتے ہی جندول خان نے شاہی فوج کو لیکر باغی لشکر کا تعاقب کیا۔

اس بغاوت میں چونکہ بانڈئی خوانین پیش پیش تھے لہذا نواب کے لشکر نے بانڈئی گاؤں تک پیش قدمی کی۔ترکلانی قبیلہ ادھر امڈ آیا۔اس طرح عوام اور فوج میں ایک خونریز جنگ چڑھ گئی جو کئی گھنٹے تک جاری رہی۔جندول خان نے بانڈئی خوانین کے قلعوں پر توپ کی گولہ باری کا حکم دیا۔جس سے قلعوں کے برج گر پڑے اس کے بعد گاؤں کو آگ لگا دی گئی۔

بانڈئی گاؤں کو شعلوں میں دیکھ کر عورتیں ماتم کرنے لگیں۔ترکلانی قبیلے نے اتحاد کا مظاہرہ کر کے فوج کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا،فوج کو شکست ہوئی اور فوجی فرار ہونے لگے۔ باغیوں نے فوجیوں کا تعاقب کیا۔پرانی بندوقوں اور کلہاڑیوں سے لیس عوام جہاں بھی سپاہی دیکھتے انھیں مار ڈالتے۔اس بغاوت میں ایک جمالدار کے علاوہ صوبیدار نور علی جان،صوبیدار ہارون ملک،صوبیدار مرزا خان اور بشیر صوبیدار سمیت دو سو کے لگ بھگ سپاہی مارے گئے۔جبکہ قبیلہ والوں سے چالیس کے قریب لوگ کام آئے۔

ریاستی فوج کا ظلم وستم

شام کو جندول سے سرلڑہ پہاڑی کے راستے سے تازہ دم لشکر پہنچ گیا تھا۔جب نواب کو خبر پہنچی تو اس نے براول قلعے سے چھ سو سپاہیوں کو میدان روانہ کرنے کا حکم دیا۔قبیلہ پائندہ خیل کو اکسا کر میدان پر حملہ آور کروایا۔یوں فوج اور پائندہ خیل ملکر میدان والوں پر ٹوٹ پڑے۔لوگوں نے پہاڑوں کی طرف فرار اختیار کی اور پائندہ خیل قبیلے نے ان کے گھروں میں مال مویشی اور اناج پر لوٹ مار شروع کر دی۔ عورتوں سے زبردستی زیورات چھین لئے گئے۔

باغی کئی دن تک پہاڑوں میں چھپے رہے۔انہیں امان دینے کیلئے میدان کے باغی سرداوں کا ایک جرگہ کراچی پہنچا اور صدر سکندر مرزا کے بنگلے کے سامنے احتجاجی کیمپ لگایا۔یہ لوگ میدان کے شہداء کے خون آلود کپڑے بھی ساتھ لے گئے تھے۔فوجی افسر محمد ایوب خان (بعد میں صدر) نے اس کیمپ کا دورہ کر کے دیر کے قبائلی عمائدین کو انصاف دلانے کا وعدہ کیا۔بغاوت کا منصوبہ چونکہ نواب کے بھائی عالمزیب خان کی رہائش گاہ پر مردان میں تیار ہوا تھا لہذا نواب کی شکایت پر اسے حکومت پاکستان نے گرفتار کر کے تین سال قید کئے رکھا۔

حکومت پاکستان کی سرد مہری

انگریزوں کے جانے کے بعد نواب شاہ جہان حکومت پاکستان کے دور میں بھی اپنی حکومت کو پرانی ڈگر پر چلاتا رہا۔حکومت پاکستان سے خوشگوار تعلقات رکھنے کیلئے اس نے قائداعظم ریلیف فنڈ میں چندہ دیا اور جہاد کشمیر میں شرکت کی۔قائداعظم اور نواب محمد شاہ جہان کے تعلقات اتنے خوشگوار نہ تھے۔ خان لیاقت علی خان نے والی سوات کی رسم دستار بندی کیلئے 1949ء میں سوات جاتے ہوئے چکدرہ میں رات گزاری مگر انھوں نے نواب محمد شاہ جہان سے ملاقات نہیں کی۔

حکومت پاکستان الحاق کے معاہدے کی پابند تھی یا مشکلات کا شکار تھی کہ پاکستان کا حصہ ہوتے ہوئے بھی دیر کے عوام کو کوئی حقوق نہ دے سکی۔کرنسی کابل کی تھی۔دیر کی سرکاری زبان فارسی تھی۔ جو قانون نواب انگریزوں کے دور میں چلاتا رہا تھا وہی پاکستان کا حصہ بننے کے بعد بھی اپنی رعایا پر مسلط رکھا۔ریاست میں بجلی، سڑک، ہسپتال، سکول یا ڈاک کا نظام کچھ بھی نہیں تھا۔الغرض حکومت پاکستان تیرہ سال تک نواب پر دیر کے عوام کی فلاح و بہبود کیلئے کچھ دباؤ نہ ڈال سکی۔

اللہ بخش یوسفی لکھتے ہیں کہ ''قیام پاکستان کے بعد کئی ذمہ دار افسران نے حتی کہ دو گورنر جنرل نے دیر کا دورہ کیا لیکن وہ دیر عوام کی حالت دیکھ کر خاموش رہے۔حکومت مرکزیہ نے نہ تو دیر میں کوئی فلاحی کام کیا اور نہ ریاست کو مجبور کیا۔اور یہ معمہ رہا کہ مرکزی حکومت کیوں خاموش تماشائی کا روپ دھارے رہی۔اور طاقت اور قوت ہوتے ہوئے اس نے دیر کے عوام کو مصاحب سے نکالنے کی سعی کیوں نہ کی اور نواب کو اتنی لمبی ڈور کیوں دی گئی کہ وہ بیسویں صدی میں اپنی من مانی کرتا رہا''۔

حکمرانان دیر کا زوال

محمد شاہ خسرو اور شہاب الدین کا اقتدار پر اختلاف

نواب شاہ جہان نے بھائی عالمزیب خان سے جندول قبضہ میں لے کر اسلئے ریاست بدر کیا کہ وہ ریاست کا واحد آمر بنے۔ جب اس کا بڑا بیٹا محمد نواز خان جوانی کو پہنچا تو باپ نے محسوس کیا کہ یہ نیلی انکھوں والا شہزادہ بہت جلد اس کے اقتدار کی راہ میں حائل ہو کر پالیسیوں سے اختلاف کرے گا۔

انگریزوں اور رعایا کی توجہ ہٹانے کیلئے نواب نے بیٹے پر الزام لگایا کہ ''اس کی آنکھیں نیلی ہیں یہ میرا بیٹا نہیں''۔ حقیقت میں شہزادے کا تصور اس کا زیرک پن، عقلمندی، چابک دستی اور ریاستی معاملات میں دلچسپی لینا تھا۔ جانشین نے باپ کی نظروں میں قہر دیکھا تو ایک شام کو خطرے کی بو محسوس کر کے ریاست کو ہمیشہ کیلئے چھوڑا اور فرار ہو گیا۔ خبر پا کر نواب نے مشرقی پہاڑوں میں کئی سپاہی دوڑائے مگر وہ نکلنے میں کامیاب رہا۔

محمد نواز خان کے بعد محمد شاہ خسرو کو 1936ء میں بارہ سال کی عمر میں ولی عہد مقرر کیا گیا۔ محمد شاہ خسرو بڑے بھائی کی نسبت خاموش طبع، معصوم اور نازک بدن تھا۔ لمبے عرصے تک اقتدار کے خواہشمند باپ کو شاید ایسے ہی جانشین کی ضرورت تھی۔ اور بعد میں ثابت کر کے دکھایا۔ 1960ء میں نواب پینسٹھ سال کا تھا مگر اس نے چھتیس سالہ ولی عہد محمد شاہ خسرو کو اقتدار نہیں سونپا۔

محمد شاہ جہان خود ایک قدامت پسند اور روایت پسند انسان تھا، وہ اپنے جانشینوں کو بھی اس طرح حکومت چلانے کا خواہشمند تھا۔ لیکن ہندوستان میں شملہ کے انگریزی سکول سے فارغ ہونے پر ولی عہد کا ذہن کافی بدل چکا تھا۔ باپ نے ولی عہد کا لباس، انداز گفتگو اور رنگ ڈھنگ دیکھا تو وہ دوسرے بیٹے شہاب الدین خان کو دیر کا آئندہ حکمران بنانے کی خواہش کرنے لگا۔

اگرچہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شہاب الدین خان ولی عہد کی نسبت زیرک، عقلمند اور تند خو تھا اس میں باپ جیسی صفات تھیں۔ نواب نے قوم کو جس طرح شکنجے میں جکڑے رکھا، جو قوانین اور پالیسیاں وضع کیں اسے قوم پر لاگو رکھنا ولی عہد محمد شاہ خسرو کے بس میں نہ تھا۔ دیر پر والد کی طرح حکمرانی کرنا شہاب الدین خان کیلئے آسان تھا کیونکہ وہ سات سال تک جندول کا حکمران رہا۔ باپ کے قوانین کو اس سے بھی زیادہ سختی سے وہاں کے عوام پر لاگو کئے رکھا۔ ایک انکشاف یہ بھی ہوا کہ نواب شہاب الدین خان

کی ماں کے دباؤ اور خواہش پر ایسی تبدیلی لا رہا تھا۔

محمد شاہ خسرو خان پر زہر کا الزام لگانا

نواب نے ایک دن اپنے کھانے میں زہر ملا کر یہ الزام ولی عہد محمد شاہ خسرو پر لگا دیا۔ خسرو کو ایک کوٹھڑی میں بند کر کے اس کے ساتھ ہر کسی کی ملاقات پر پابندی لگا دی۔ نواب نے بیٹے کے رضائی والد سپہ سالار عبدالمالک، سسر حضرت سید اخونزادہ اور دوسرے حمایتی افسران کو برطرف کر دیا تا کہ یہ لوگ جندول خان کو اقتدار دلانے میں رکاٹ نہ بن سکے۔ جب نواب کی خواہش کا پاکستانی حکومت کو معلوم ہوا تو ایک پولیٹیکل ایجنٹ نے فوری دورہ کر کے نواب سے صاف صاف کہہ دیا کہ انگریزوں کے عہد سے مقرر محمد شاہ خسرو کی بجائے ہم شہاب الدین خان کو کبھی ولی عہد تسلیم نہیں کرینگے۔

پاکستان کے خلاف سازش

جندول خان والد کے بعد دیر کا حکمران بننا چاہتا تھا۔ حکومت پاکستان انگریزوں کے عہد سے مقرر تعلیم یافتہ ولی عہد محمد شاہ خسرو کی طرفدار تھی۔ میدان کی بغاوت میں جب جندول خان نے خون خرابہ کیا تو اسے اپنی حکمرانی کی اور بھی فکر لگ گئی اور افغانستان سے ساز باز کرنے کا غلط قدم اٹھایا۔

اللہ بخش یوسفی لکھتے ہیں کہ نواب نے پاکستان کو مرعوب کرنے کیلئے افغانستان سے ساز باز شروع کی۔ سیم وزر کے لالچ میں وطن سے غداری کی سوجھی۔ ایک شام کو جندول خان باجوڑ کے راستے افغانستان داخل ہوا۔ پاکستانی جاسوسوں نے صدر ایوب کو بمعہ تصاویر جندول خان کی پوری رپورٹ پیش کی"۔[1]

ادھر باپ جندول خان کو حکمران بنانے کی فکر میں لگا رہا۔ اور ادھر ولی عہد محمد شاہ خسرو باپ کا تختہ الٹنے میں حکومت پاکستان کے ساتھ ساز باز کرنے لگا رہا۔ نواب کے افسر اس کے انتہائی وفادار رہے لیکن آخر میں مجبوراً انھیں بھی نواب کے خلاف سازش میں حصہ لینا پڑا۔ کیونکہ نواب آخری سالوں میں نہایت خطرناک بن گیا اس کے ارگرد اجرتی قاتل منڈلانے لگے تھے۔ اسی طرح نشوں کی زیادہ لت میں

---

[1] یوسفزئی پٹھان صفحہ ۴۶۶

مشغول نواب ہوس میں اندھا ہوا تھا۔اس کی شخصیت اور وقار کافی متاثر ہوئی اور یوں وفادار لوگ بھی نواب کا تختہ الٹنے میں ساتھ دینے لگے۔

نواب شاہ جہان کی گرفتاری

سات اکتوبر 1960 کو ریہرسل کا بہانہ بنا کر پاک فوج نے چترال جانے کیلئے نواب دیر سے اجازت مانگی۔ریاست میں پہلی بار پاک فوج کے ہزاروں فوجیوں کی نقل وحرکت دیکھ کر جندول خان کو شک ہوا۔اس نے والد کو چکدرہ پل کو توڑنے اور فوج کو گھیرے میں لینے کا مشورہ دیا لیکن عمر رسیدہ نواب یہ ہمت نہ کر سکا۔

رات گزر گئی تو اگلی صبح دارالحکومت میں قریباً چھ بجے گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔نواب معمول کے مطابق محل سے نکلا۔اس کے ہاتھوں پر بٹیر اور ایک باز تھا۔حواس باختہ تحصیلدار نواب کی طرف بڑھا اور اسے پاک فوج کی دارالحکومت کو گھیرے میں لینے کی خبر سنائی۔نواب ششدر رہ گیا۔خان زرین اور سید رسول نے دوڑ کر اس سے باز پکڑ لیا۔جب تحصیلدار نے پاک فوج سے لڑنے کا مشورہ دیا تو نواب غصہ ہوا اور بولا۔''اگر کسی نے ایک بھی گولی چلائی تو میں اس کی آنکھیں نکال دونگا''۔

پاکستانی افسر پل کے اس پار بنگلے میں مقیم تھا۔نو بجے پاکستان کا نمائندہ آیا اور نواب سے کہا کہ'' آپ کو بلایا گیا ہے''۔نواب نے نمائندے سے کہا کہ''میں آتا ہوں''۔اس کے بعد میر منشی سے سرگوشی کرنے کے بعد اسے ایک خط دیا۔

میر منشی اور ایک پائندہ خیل صوبیدار جیپ میں سوار ہوئے۔جیپ تیزی سے محل سے نکلی۔شاید میر منشی کو سلطان خیل اور پائندہ خیل کے پاس بھیجا جا رہا تھا تاکہ وہ پاک فوج کے مقابلے میں صف آراء ہو سکیں۔جیسے ہی یہ جیپ دارالحکومت سے نکلی آگے سڑک بند تھی جیپ رک گئی اس دوران اس پر فائرنگ کی گئی جس سے جیپ کو واپس محل لوٹنا پڑا۔

اسی اثناء میں جنگی اور بمبار جہازوں نے دارالحکومت کے اوپر کئی چکر لگائے اور ترچ میر کے پہاڑوں میں روپوش ہو گئے۔اس سے رعایا پر ایک خوف سا طاری ہو گیا۔اتنے میں ایک دوسرا افسر آیا اور نواب سے آنے کو کہا۔اب کے نواب نے حبیب الحسن سے رومال اور نسوار کا ڈبہ لیا اور اپنی موٹر میں سوار

ہوکر محل سے نکل کر پاکستانی افسر کے پاس پہنچ گیا۔کافی دیر تک گفت وشنید ہوتی رہی ۔رعایا اور افسران بے چین تھے۔حکمران اپنی بات پر ڈٹا رہا،مذاکرات ناکام ہوئے۔

اس دوران دارالحکومت میں ایک ہیلی کاپٹر شور مچاتا ہوا اور گرد غبار اڑاتا ہوا امیری کس ڈاگ میں لینڈنگ کر گیا۔پاک فوج کی جیپ بنگلے سے نکلی اور ہیلی کاپٹر سے کچھ فاصلے پر کھڑی ہوگئی۔دو سپاہی پینسٹھ سالہ نواب کو سہارا دیتے ہوئے کھیتوں میں کھڑے ہیلی کاپٹر کی جانب لے چلے،نواب نے چادر اڑھ رکھی تھی، پگڈنڈیوں پر چلاتے ہوئے نواب کو ہیلی کاپٹر پر سوار کر دیا گیا۔بارعب اور شان وشوکت والے نواب کا آہستہ قدموں سے چلنا،ہیلی کاپٹر پر سوار ہونا،کالے ہیلی کاپٹر کا شور مچانا اور دارالحکومت کا چکر لگا کر براول کی جانب اڑان بھرنا رعایا کی جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنے کے مترادف تھا۔

اخون الیاس کا آنا اور نواب شاہ جہان کا جانا

1640ء میں نہا گدرہ سے الیاس نامی شخص علم کی تلاش میں ہندوستان جاتا ہے۔دینی علم حاصل کرنے کے بعد وطن آکر وہ نہا گدرہ کوہان میں ایک کوٹھڑی میں بیٹھ جاتا ہے قلیل عرصے میں سارا ملیزئی قبیلہ اس کا پیروکار بن جاتا ہے۔اور آخر کار اقتدار کی بھاگیں بھی اسکی اولاد کے ہاتھوں میں تھما دیتا ہے۔جو کہ دیر پر تقریباً ساڑھے تین سو سال حکمرانی کرتی ہے۔

پھر اس خاندان کا زوال 1960ء میں نواب محمد شاہ جہان کے ہاتھوں شروع ہوتا ہے۔اس کی زندگی نہ صرف اپنے جد اعلیٰ اخون الیاس سے مختلف تھی بلکہ شاہانہ جاہ وجلال میں وہ احکام الٰہی کو بھی بھول گیا تھا۔دونوں کی زندگی کا جائزہ پیش ہے۔

☆ 1640ء میں اخون الیاس ہندوستان سے علم کی دولت سے مالا مال ہوکر شاملئی گدر (چکدرہ) سے تسبیح کرتے ہوئے دیر میں داخل ہوئے جبکہ 1960ء میں نواب شاہ جہان گرفتار ہوکر ہیلی کاپٹر میں ریاست سے باہر لاہور جا رہا تھا۔

☆ اخون الیاس کا سفر حکمرانی کا آغاز تھا جبکہ نواب کا یہ سفر ساڑھے تین سو سالہ حکمرانی کا خاتمہ۔

☆ اخون الیاس سوکھی روٹی تھامے، پھٹے پرانے لباس میں مطمئن تھے جبکہ نواب کا چشمہ اور گھڑی سونے کی،لباس شاہانہ مگر بے چین۔

☆ اخون الیاس نے اپنے والد طور بابا کے نقش قدم پر چل کر مذہبی راہ اختیار کی جبکہ نواب نے اپنے والد کے برعکس دولت، ہوس، غرور، ظلم وستم اور شان وشوکت کی۔

☆ اخون نہا گدرہ پہنچے تو لوگوں نے انھیں سر آنکھوں پر بٹھایا جبکہ نواب شاہ جہان لاہور پہنچا تو ملیشہ نے اسے گھیرے میں لے لیا۔

اخون الیاس اور نواب شاہ جہان کی زندگی میں عقلمندوں کیلئے بڑا سبق ہے۔ایک خاندان سے دو انسان تھے۔اس دنیا میں آئے دونوں کو آزمایا گیا ایک نے درویش کا روپ اختیار کیا اور دوسرے نے ظالم اور جابر حکمران کا۔اولذکر نے دنیا میں عاجزی، انکساری اور یاد الٰہی میں پرسکون زندگی گزاری اور اخرالذکر دنیا میں احکامات الٰہی سے بیگانہ شہرت، دولت اور عیش وعشرت کی زندگی میں مگن رہا۔اس کا دل اخون جیسا مطمئن نہ تھا وہ دنیا کی بازی ہار گیا اور آخرت کی اللہ جانے۔

آزادی کا پیغام

ہیلی کاپٹر ریاست میں چکر کاٹتے ہوئے پرچیاں گراتا رہا جن میں انقلاب کا یہ پیغام تھا۔'' تمھارا نواب تمہاری جائیدادوں پر قابض تھا اور تم لوگوں سے بیگار لیتا تھا اور عیش عشرت میں مگن رہتا تھا آج تم لوگ اس کے چنگل سے آزاد ہو گئے ہو''۔عین اس وقت منڈا میں پاک فوج نے جندول خان کو بھی گرفتار کر لیا تھا اور اس کو موٹر میں بٹھا کر رسالپور روانہ کر دیا تھا۔

ہیلی کاپٹر رسالپور میں جا اترا۔ایک فوجی جرنیل نے نواب کی مزاج پرسی کی۔نواب نے اسے بتایا کہ میری دوائی رہ گئی ہے۔ہیلی کاپٹر بھیج کر دیر خاص سے نواب کی دوائی لائی گئی۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بحیثیت قیدی بھی اس کا کتنا احترام تھا۔چند گھنٹے بعد جندول خان کو بھی ادھر پہنچا دیا گیا۔اس کے بعد باپ بیٹے کو لاہور لے جا کر علیحدہ مقامات پر نظر بند کر دیا گیا۔رعایا کی غم اور خوشی کا تعین اسلئے مشکل ہے کہ اس دن جہاں حکومت مخالف لوگ خوش تھے وہاں بہت سے گھروں کا چولہا نہیں جلا لیکن حقیقت یہ کہ ایسے انجام پر اس کے دشمن بھی اداس تھے۔وفادار نوکروں کے علاوہ نواب کے کتے انتہائی مغموم تھے۔جنہوں نے روتے روتے کھانا پینا تک چھوڑ دیا تھا اور اپنے مالک کے لئے بلبلاتے تھے۔جب شام ہوئی تو پاک فوج پہاڑوں سے سفید جھنڈے لئے دارالحکومت میں اتر آئی اور ریاست میں کوئی دنگا فساد نہیں ہوا۔

یو ضروری اعلان

[illegible]

حکومت پاکستان

18 اکتوبر 1960ء حکومت پاکستان کی جانب سے ہیلی کاپٹر سے گرائی جانی والی پمفلٹ

حکومت پاکستان کی طرف سے ہیلی کاپٹر سے گرائی جانے والی پرچی کا ترجمہ۔

ایک ضروری اعلان (خوشخبری)

دیر کے مظلوم بے اسرا اور بے یار و مددگار بھائیوں!

حکومت کو معلوم ہے اور ساری دنیا جانتی ہے کہ تمھارے ساتھ تمھارے ریاست میں کیسا سلوک کیا جاتا ہے۔ آپ کا نواب آپ کیلئے سڑکیں، پل، ہسپتال اور سکول نہیں بنواتا۔ کہ آپ کی ذرائع آمدورفت بہتر ہو اور اپنے اجناس اور مال واسباب ایک جگہ سے دوسری جگہ باآسانی لے جاسکیں۔ یا آپ کا علاج معالجہ ہوسکیں اور تعلیم حاصل کرسکیں اور آپ پاکستان کے دوسرے علاقوں کی طرح ترقی کرسکیں۔

پاکستان کے دوسرے لوگ زراعت، صنعت، تعلیم اور زندگی کے ہر میدان میں روبہ ترقی ہیں اور آرام وسکون سے باعزت زندگی گزار رہے ہیں۔ جبکہ آپ لوگوں کی ساری کمائی نواب کی ذاتی عیش و عشرت پر صرف ہوتی ہے اور آپ بھوکے پیاسے رہتے ہیں۔

حکومت کو یہ بھی معلوم ہے کہ نواب آپ سے کتنا بیگار لیتا ہے آپ کی جائیداد پر زبردستی قبضہ کرلیتا ہے کہ وہ اور بھی امیر ہوجائے اور آپ اس سے بھی زیادہ غریب ہوجائیں۔ آپ میں سے جس نے بھی اس کے مظالم کے خلاف آواز اٹھائی ہے یا تو ان کو قتل کردیا گیا یا ان کو ریاست بدر کردیا گیا اور وہ لوگ پاکستان کے دوسرے علاقوں میں دربدر ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ اگر نواب ریاست کی تھوڑی سی بھی آمدنی کو قوم پر خرچ کرتا تو آپ کی حالت اتنی خراب نہ ہوتی۔

آپ نے وقتاً فوقتاً نواب اور اس کے بیٹے جندول خان کے خلاف اپنی اواز حکومت تک پہنچائی اور اس غرض سے کئی جرگے بھی بھیجے ہیں کہ حکومت پاکستان آپ کو ان مظالم سے چھٹکارا دلائے۔ حکومت نے آپ کی اس فریاد پر غور کیا ہے اور ہمیشہ نواب سے یہی کہا ہے کہ وہ ریاست میں سڑکیں، پل، ہسپتال اور مدرسے بنوائے اور لوگوں سے زبردستی بیگار نہ لے۔ لوگوں سے زبردستی زمینیں قبضہ نہ کرے۔ اپنی ذاتی غرض اور مفاد کیلئے مظلوم لوگوں کا قتل نہ کرے اور نہ اپنی رعایا کو بغیر کسی وجہ کے ریاست بدر کرے لیکن نواب نے ابھی تک ان باتوں پر کان نہیں دھرا۔

حکومت پاکستان مزید ایسے حالات برداشت نہیں کرسکتی ۔دیر بھی پاکستان کا ایک حصہ ہے ۔دیر کے لوگوں کا بھی یہ حق بنتا ہے کہ وہ بھی پاکستان کے دوسرے لوگوں کی طرح آرام وسکون اور عزت کی زندگی بسر کریں۔اس بارے میں حکومت پاکستان پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ملک کے تمام حصوں اور علاقوں کے لوگوں کے آرام وآسائش اور ترقی کا خیال رکھے۔اس وجہ سے حکومت نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ آپ لوگوں کو ہر قسم کے ظالموں اور ان کے ظلم وجبر سے نجات دلائے کہ آپ اور آپکی آئندہ نسلیں آرام وسکون اور عزت کی زندگی بسر کرسکیں۔

حکومت اور پاکستان کے عوام آپ کو یہ خوشخبری سناتے ہیں کہ آپ لوگ اس ظلم وستم سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے آزاد ہوگئے ہیں۔

حکومت پاکستان

ریاست کی نظم ونسق میں تبدیلیاں

آٹھ اکتوبر کو جیسے ہی کالا ہیلی کاپٹر ریاست سے نکلا تو اس دن چھتیس سال بعد ریاست میں بڑی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔1947ء تا1960ء یعنی تیرہ سال تک ریاست دیر میں کابلی سکہ چلتا رہا ۔سرکاری زبان فارسی رہی ،سڑک ،شفاخانہ ،ٹیلیفون ،یا سکول کا انتظام موجود نہ تھا۔گویا 1947ء تا1960ء پاکستان کا حصہ ہوتے ہوئے بھی پاکستان کا اس ریاست میں کوئی عمل دخل نہ تھا۔لیکن اٹھ اکتوبر کے بعد ریاست دیر پاکستان کے مکمل زیر اثر آیا۔محمد شاہ خسرو کھ پتلی نواب تھے لہذا حکومت پاکستان کے زیر اثر نواب کے اختیارات کی کمی کے علاوہ نواب شاہ جہان کے انتظامی افسروں کا نظم وضبط بھی سست پڑ گیا۔

نواب شاہ جہان کے خوف سے رعایا نہ آزادانہ تجارت کرسکتے تھے ،نہ درخت کاٹ سکتے تھے نہ شکار کھیل سکتے تھے حتی کہ آزادانہ نقل وحرکت اور ریاست سے باہر نکلنے میں لوگ تذبذب کا شکار رہتے تھے۔نواب کی گرفتاری کے بعد رعایا کو آزادی ملی لوگوں نے ریاست سے باہر آزادانہ نقل وحرکت شروع کردی۔اور ریاست اندر لوگوں کو تجارت کرنے ،علوم حاصل کرنے کے علاوہ بیگار سے بھی چھوٹ مل گئی۔ اٹھ اکتوبر تک محل کی مثال قید خانے کی سی تھی یوں اس دن محل میں قید وبند دوشیزاؤں اور شاہی خاندان کے

عورتوں کو بھی آزادی مل گئی۔

نواب نے مزاحمت کیوں نہ کی؟

گرفتار ہونے کے وقت نواب نے یہ کہا تھا کہ" میں اپنی قوم کو لڑانا نہیں چاہتا میں ایک شخص ہوں میں قید بھی ہو جاؤں مگر قوم کو نہیں مرنے دونگا"۔اس بات میں کتنی حقیقت ہے کیا نواب نے واقعی قوم سے ہمدردی کی خاطر آسانی سے گرفتاری دی یا وہ اس قابل نہ تھا کہ پاک فوج سے ٹکر لے سکے یہ اندازہ درجہ ذیل حالات پڑھ کر ہی لگایا جا سکتا ہے۔

حکومت افغانستان سے ساز باز کرنے میں اسے ناکامی ہوئی تھی، میر منشی اس کا خط سلطان خیل اور پائندہ خیل تک نہ پہنچا سکا کیونکہ دارالحکومت کی چاروں طرف سے ناکہ بندی کر دی گئی تھی۔اس کا بیٹا اور کئی افسران اس خفیہ سازش میں شریک تھے۔پاکستان کی فوج جدید اسلحہ سے لیس تھی اور لڑاکا طیارے بھی اس کی مدد کیلئے موجود تھے دوسری طرف نواب کے پاس ایک ہزار فوج تھی باقی تیرہ ہزار فوج کسان ،گڈریئے یا عام لوگوں پر مشتمل، ریاست میں جگہ جگہ تعینات تھی جس کا انا فانا دارالحکومت پہنچنا مشکل تھا۔ نواب کو یہ بھی معلوم تھا کہ اس کے دشمن اور مخالف قبیلے میدان جنگ میں پاک فوج کے شانہ بشانہ اس کے خلاف لڑینگے۔دور اندیش حکمران کا یہ بھی خیال تھا کہ اگر اسے شکست ہوئی تو پھر اسے کئی مقدمات اور الزامات کا سامنا کرنا پڑے گا۔

قوم یہ سمجھی کہ نواب نے رعایا سے ہمدردی کی خاطر اسے خون خرابے سے بچا کر خود کو قید کروا دیا۔مگر اصل میں گرفتاری دینا حکمران کے اپنے مفاد میں تھا۔اس نے مذاکرات میں ایک خفیہ ڈیل کی جس کے تحت قوم پر چھتیس سال ظلم وستم ڈھانے والے اور قوم کی جائیداد پر قابض حکمران نے لاہور میں پرسکون زندگی گزاری اور قوم کے متعلق اس سے کوئی پوچھ گچھ نہ کی گئی۔

اللہ بخش یوسفی لکھتے ہیں کہ معزول ہونے کے بعد عام خیال یہی تھا کہ اسے مارشل لاء کے تحت بغاوت کے مقدمے کا سامنا کرنا پڑے گا لیکن حکومت نے صرف نظر بند رکھنے پر اکتفاء کیا"۔

نواب محمد شاہ جہان کو لاہور میں نظر بند کر کے صدر ایوب نے اس کی رعایا کو آزادی تو دلا دی مگر قوم کی جائیدادوں کے مسئلے پر اس نے اپنی ذمہ داریاں نہیں نبھائیں۔قوم کی جائیداد پر افسران اور حواری

قابض ہوئے۔اس طرح حکومت پاکستان نے نواب کو پنجرے میں بند کر کے غریب رعایا کو اس کے بیٹے اور افسران کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا۔

نواب دوران نظر بندی

نواب کو بنگلہ 42Fcc جبکہ جندول خان کو بنگلہ FR گلبرگ میں نظر بند کر دیا گیا۔محمد شاہ خسرو نے اپنے والد کو ایک جیپ میں تقریباً پچاس بٹیر بھیجے۔نواب پر ایک سال کڑا پہرا رہا پھر اسے باہر گھومنے پھرنے کی اجازت دی گئی۔نواب کو بیویوں نے پیغام بھیجا کہ اگر آپ چاہیں تو ہم خدمت کیلئے آجائیں۔لیکن نواب نے انھیں لاہور آنے سے سختی سے منع کر دیا۔

دوران نظر بندی نواب شاہ جہان نے شکار کی بجائے صرف بٹیر سے دل لبھایا۔کتا یا گھوڑا بھی نہیں پالا۔صرف شاہ وزیر مرزا کو پاس رکھا اور باقی شطرنج کے ساتھی ریاست میں رہ گئے۔اس نے مطالعہ کا شوق جاری رکھا۔بازار سے نوادرات اور کتابیں خریدنا مشغلہ رہا۔

اگر چہ وہ دوران اقتدار بھی کم خواب تھا لیکن نظر بندی میں وہ دن کو نہیں سوتا تھا اور رات گئے تک جاگتا رہتا تھا۔نواب کا ذاتی خانساماں عابد جمالدار انکشاف کرتا ہے کہ ''نواب کو لاہور میں نیند نہیں آتی تھی وہ مٹھی بھروانے اور مالش کروانے کا عادی تھا دو نوکر پہلے اور دو بعد میں اسے آدھی رات تک دباتے رہتے تھے۔جس سے نواب کی بے خوابی کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔سیر کا مشغلہ نواب نے لاہور میں بھی جاری رکھا اور سہ پہر کے وقت ایک جھیل کی طرف نکل جاتا تھا۔

اقتدار سے معزولی پر نواب جہاں بیٹے محمد شاہ خسرو سے نالاں تھا وہاں ریاست سے اس کا کوئی افسر ملاقات کیلئے آتا تو نواب چیں بجبیں ہو جاتا۔ایک دفعہ ایک بڑا افسر نواب سے ملنے کیلئے آیا۔جب واپس ہوا تو نوکر کو حکم دیا گیا کہ اس بے ایمان نے جس پیالے میں چائے پی ہے اسے توڑ ڈالو۔چھ سال نواب نے لاہور میں گزارے۔بلڈ پریشر اور دوسری بیماریوں میں مبتلا ہوا تو اسے پنڈی میں محمد شاہ خسرو کی کوٹھی میں منتقل کر دیا گیا۔پنڈی جاتے ہوئے تالاش کا بادشاہ زادہ ڈرائیور گاڑی چلا رہا تھا اور چھوٹا پوتا محمد شاہ ناصر خان پچھلی سیٹ پر دادا کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔جولائی 1966ء میں نواب بیمار ہوا اور سی ایم ایچ ہسپتال اسلام آباد منتقل کر دیا گیا۔

وفات

نواب کئی روز سے اس ہسپتال میں زیر علاج تھا۔ پیر کے دن اس کو رہا ہونا تھا۔ ہفتے کے دن عالمزیب خان عیادت کیلئے آیا تو نواب نے اسے کہا ''ہم دونوں دیر جا کر براول میں رہینگے''۔ 24 جولائی کی شب بستر پر لیٹے شوربہ پی رہا تھا اسکے پاس وفادار گونگا نوکر بھی موجود تھا چند گھونٹ پینے کے بعد اچانک اس کی طبیعت بگڑنے لگی۔ ڈاکٹر اور نرس بھاگے چلے آئے، مگر جان کنی کی عالم میں چند لمحے گزارنے کے بعد رات ساڑھے اٹھ بجے کے قریب اکتر سالہ معزول نواب کی بارعب آنکھیں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے بند ہوگئی۔

رات دس بجے اس کی لاش دیر روانہ کردی گئی۔ نواب کی میت کے پیچھے محمد شاہ خسرو اپنی فیملی کے ساتھ موٹر میں جارہا تھا۔ ڈرائیور بادشاہ زادہ ملک کا کہنا ہے'' کہ سارے راستے پر محمد شاہ خسرو اپنے باپ کی موت پر دھاڑیں مار مار کر روتا رہا''۔

لاش ریاست دیر میں داخل ہوئی۔ لوگوں نے دیکھا کہ شان شوکت والے نواب کا تابوت ویگن کے اوپر باندھا ہوا تھا۔ رعایا نے جانشین کی کم فہمی پر بڑی خفگی ظاہر کی۔ سب لوگ کام کاج چھوڑ کر دیر خاص کی طرف ہولئے۔ لاش دیر خاص پہنچی تو دربار میں پہلے سے تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ ہر کوئی اپنے نواب کا آخری دیدار کرنے کیلئے بے تاب تھا۔ میت کا رنگ کالا ہو چکا تھا بعض لوگوں کا خیال تھا کہ اسے زہر دے کر مارڈالا گیا ہے۔ اس روز نواب کے حواری، قومی سردار، دوست واحباب آٹھ آٹھ آنسو رو رہے تھے۔ نہا گدرہ کے گل بہار مولوی صاحب نے تقریر کی اور جنازہ پڑھایا۔ جنازے میں بڑے بیٹے محمد نواز خان نے شرکت نہ کی اور جندول خان نظر بندی کے سبب شرکت نہ کرسکا۔ دس بجے صبح نواب کو دربار سے متصل چھوٹی سی مسجد میں سپرد خاک کردیا گیا۔

نواب شاہ جہان کی طرز حکومت کے مثبت پہلو

تاریخ لکھنے کا مطلب یہ ہے کہ کسی کی خامیوں کے ساتھ ساتھ اس کی خوبیوں کا بھی ذکر کیا جائے۔نواب شاہ جہان کی طرز حکومت اور پالیسیوں نے جہاں قوم پر جہالت، ناخواندگی اور پسماندگی جیسے برے اثرات ڈالے وہاں نواب کی حکومت کے کچھ مثبت پہلو سامنے آتے ہیں جن کو نظر انداز کرنا نواب سے زیادتی ہوگی۔جیسے

مثالی امن وامان

ریاست سوات میں امن کی وجہ وہاں کی تعلیمی اور معاشی بہتری تھی۔عوام سے اسلحہ اکٹھا کر کے لائسنسوں کا اجراء کیا گیا تھا۔ریاست دیر میں جہالت اور ناخواندگی کی وجہ سے اسلحہ کی نمائش عام تھی اور اس پر مستزاد نواب کا یہ قول" یو ٹوپک خو سڑے د خپلی خخی د حفاظت د پارہ ساتی "ایک بندوق تو بیوی کی حفاظت کیلئے رکھتے ہیں۔

اس کے باوجود دیر میں امن مثالی تھا۔قتل، ڈکیتی اور دوسرے واردات نہ ہونے کے برابر تھے جرائم اور بدامنی نہ ہونے کی وجہ سے جیلوں کی تعمیر پر زیادہ توجہ نہ دی گئی۔البتہ دارلحکومت میں ایک کمرہ متعین تھا جہاں شاذ و نادر مجرم دیکھنے کو ملتے اس کے برعکس سوات میں سنٹرل جیل کے علاوہ تحصیل کی سطح پر جیل خانے قائم تھے۔جن میں جرائم پیشہ افراد کو رکھا جاتا۔

عدالت

انگریزی نظام عدالت میں اگر شہتوت کی شاخ پر کیس شروع کیا جائے تو پوتا اس کی پیروی کرتے کرتے دادا بن جاتا ہے مگر کیس جوں کا توں رہتا ہے۔اگرچہ نواب عدالت میں بعض اوقات امتیازی برتاؤ کیا جاتا، نواب اور کارندے قانون سے بالاتر تھے۔مگر یہ عدالت شریعت اور جرگہ کے اصولوں کی پابند انگریزی قانون سے بدرجہا بہتر تھی اور پیچیدہ نوعیت کے مقدمات بھی فوری حل ہوتے تھے۔

دیر کا وقار اور قومی تشخص

نواب شاہ جہان کا ذاتی کردار جیسا بھی تھا مگر اس نے قوم کی عزت اور ناموس پر آنچ نہیں آنے

دی۔ وہ ایک بارعب اور شان وشوکت والا حکمران تھا۔ انگریزوں اور بعد میں پاکستان کیلئے ریاست دیر کی ایک ممتاز حیثیت رہی۔ ریاست دیر کا آس پاس ریاستوں پر ایک رعب تھا۔ اس زمانے کے تاجر جب ہندوستان سے مال درآمد کرتے ہوئے کسی پھاٹک پر نواب کا نام لیتے تو نواب کی ہیبت سے انھیں چھیڑ نے سے گریز کیا جاتا اور دیر کے باشندوں کی باہر کے علاقوں میں نواب کی وجہ سے عزت کی جاتی تھی۔

فرقہ بندی

نواب کے عہد میں فرقہ بندی کا کوئی تصور نہ تھا۔ اس نے دیر کے لوگوں کو قومیت کے ایک سانچے میں ڈھال رکھا تھا۔ پوری قوم یکجہتی، اتحاد اور یگانگت کی مضبوط زنجیروں میں جکڑی رہی۔ ایک دین ایک مذہب۔ نواب کے حکم سے ایک دن پر روزہ اور ایک دن پر عید منائی جاتی تھی۔ جندول کے گاؤں گمبیر کے مولوی صاحب کو اس وجہ سے ریاست بدر کیا گیا کہ اس نے نواب کی اجازت کے بغیر عید منانے کا اعلان کیا تھا۔ گویا اس کی رعایا مذہبی دنگا فساد، منافرت اور پیچیدگیوں سے محفوظ رہی۔

شرم وحیاء والی تہذیب

نواب کی طرز حکومت کی ایک خوبی یہ تھی کہ ریاست میں سخت قوانین کی وجہ سے ایک شرم وحیاء والی تہذیب پروان چڑھی۔ جھوٹ، منافقت، بے حیائی اور بدکاری نہ ہونے کے برابر تھی۔ بڑھوں کی عزت کی جاتی اور چھوٹوں پر شفقت۔

قوم کو غیرتمند اور بہادر رکھنا

نواب کے عہد میں غیرت، پختون ولی، ننگ اپنی عروج پر تھے۔ نواب اور اس کے رعایا پختون ولی پر جان چھڑکتے تھے۔ سخت محنت اور خالص غذاؤں سے قوم صحتمند اور توانا رہی۔ یوں صحتمندی اور روایات کے سبب قوم میں بہادری کا ایک جوہر موجود رہا۔

رعایا کو مطمئن اور خوش رکھنا

اگرچہ قوم نواب کی بعض پالیسیوں سے نالاں تھی۔ لیکن بعض پالیسیوں سے قوم مطمئن تھی جیسے امن وامان، سادگی، پختون روایات کی پاسداری وغیرہ۔ اگرچہ معاشی مساوات نہ تھے مگر خان اور غریب

کے کپڑوں میں پیوند ایک بات تھی۔ نواب نہ صرف اپنے رعایا کا ہر دلعزیز تھا بلکہ آج اس کی رعایا اس کے یاد میں روتی ہے۔

ریاست کی خود کفالت

نواب کے عہد میں ریاست زرعی اجناس میں خود کفیل رہا بلکہ ریاست سے اناج، گھی اور بہت ساری آشیاء برامد کی جاتی تھی۔ ریاست کی خود کفالت کے علاوہ مہنگائی بھی کم تھی اگر چہ تنخواہ کم تھی لیکن مہنگائی نہ ہونے کی وجہ سے اس پر گزارہ ہوتا تھا۔

جنگلات اور جنگلی حیات کا تحفظ

نواب کے دور میں جنگلات کی کٹائی پر پابندی کی وجہ سے کوہستانی اور پہاڑی جنگلات محفوظ رہے۔ جنگلات کے علاوہ نواب نے چرہ دار بندوق سے شکار کرنے پر بھی پابندی عائد کر رکھی تھی۔ یوں جنگلی جانور اور چرند پرند کو بھی تحفظ حاصل تھا۔

جب نواب گرفتار ہوا تو شکار پر پابندی نرم پڑ گئی۔ چکور کے علاوہ کئی قیمتی پرندے شکاریوں کی زد میں آئے۔ لوگوں کی معاشی زبوحالی کے سبب 1976ء میں پشاور اور لاہور کے قالین فروشوں اور سمگلروں نے دیر کی پہاڑیوں میں موجود شیر اور چیتے کی کھال کیلئے لوگوں کو آٹھ سو روپیہ فی کھال کا لالچ دیا۔ یوں شکاری جنگل میں تعاقب کرتے اور مختصر عرصے میں ریاست سے نایاب جانوروں کا خاتمہ کر دیا۔

پختون روایات اور ثقافت کا تحفظ

نواب شاہجہان کے عہد میں ریاست میں پانچ ہزار سالہ پرانی پختون تہذیب اپنی اصلی حالت میں موجود رہی۔ نواب نے انگریزی اور اردو پر پابندی عائد کر دی تھی۔ اور دوسروں کے ثقافت کی نقل کرنے والوں کو وہ نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ ریاست میں جرگہ، مہمان نوازی اور دوسرے روایات زندہ رہیں۔ لیکن جب نواب گئے تو پختون تہذیب پر غیروں کی تہذیب کا گہرا اثر پڑا۔ شاید انھی مثبت پہلوؤں کے وجہ سے آج بھی اس زمانے کے لوگ نواب کو اپنے دلوں میں بسائے ہوئے ہیں۔

نواب اپنے بیٹوں محمد شاہ خسرو، شہاب الدین خان، اور چھوٹے بیٹے محمد شاہ خان کیساتھ

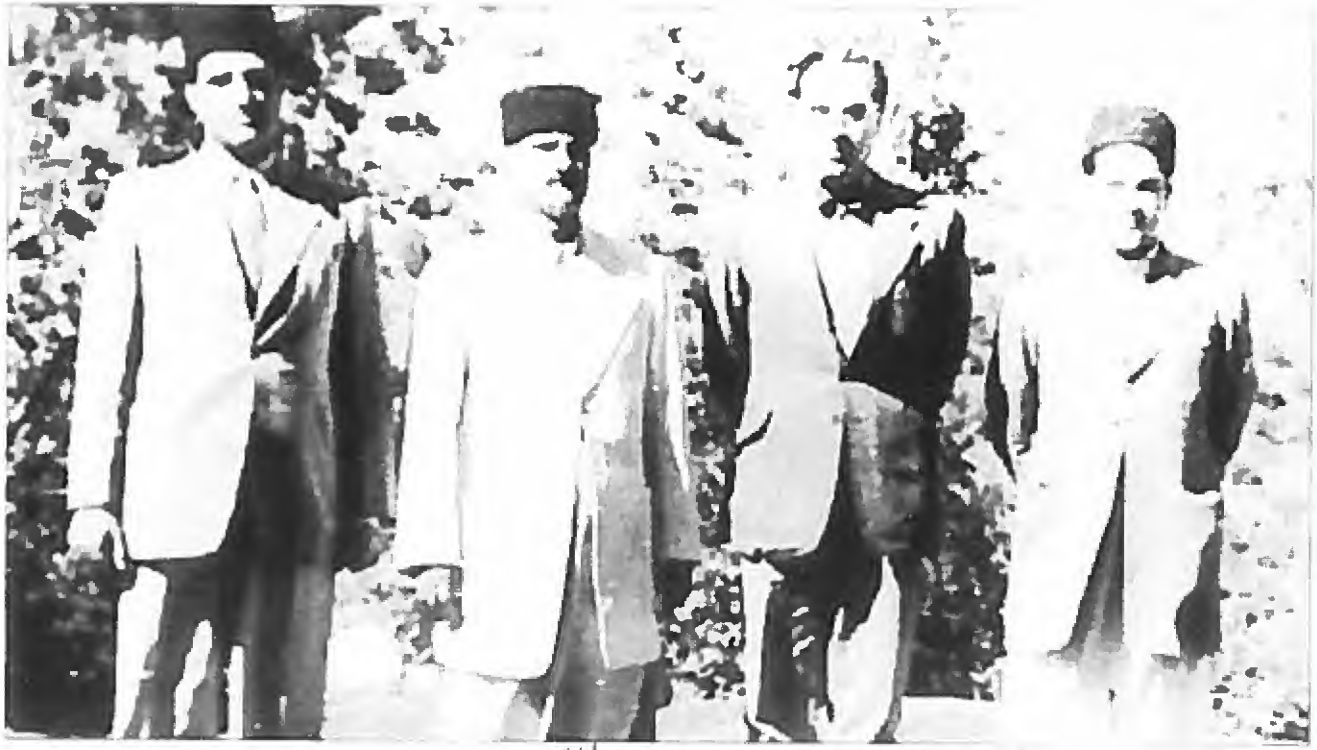

بائیں سے دائیں محمد شاہ خسرو، محمد شاہ جہاں خان، پولیٹیکل ایجنٹ اور شہاب الدین خان

نواب محمد شاہ خسرو کا عہد حکومت

آٹھ اکتوبر 1960ء تا دس جون 1967ء

9نومبر 1960ء کو چکدرہ میں سابق گورنر مغربی پاکستان ملک امیر محمد خان نے ایک پروقار تقریب میں چھتیس سالہ خسرو کو تاج پہنا کر نواب آف دیر بنا دیا۔ اصلاحات کا عمل تیزی سے شروع ہوا۔ محمد شاہ خسرو کو نواب تسلیم کرنے کیساتھ ہی پولیٹیکل ایجنٹ (وزیراعظم) کو ریاست کا انتظامی سربراہ مقرر کیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد ریاست میں پہلی مرتبہ مشاورتی کونسل کا قیام عمل میں لایا گیا۔ دیر کے عمائدین پر مشتمل کونسل ممبران کی تعداد پینتیس تھی جو نواب اور وزیراعظم کے ساتھ ریاستی معاملات چلانے میں ساتھ دیتی رہی۔ گویا کونسل اور پولیٹکل ایجنٹ کے ہوتے ہوئے شاہ جہان نواب کے برعکس محمد شاہ خسرو کے پاس بہت ہی کم اختیارات تھے۔

بحیثیت حکمران

نواب محمد شاہ خسرو نے ہندوستان (شملہ) کے بشپ نامی سکول سے تعلیم حاصل کی تھی۔ کچھ عرصہ تک انڈین آرمی میں رہے۔ مصنف ریاض الحسن کے مطابق ''نواب خسرو ایک درویش صفت انسان ہے کسی کے کام میں بلاوجہ خلل اندازی نہیں کرتا''۔

نواب محمد شاہ خسرو کا بڑا کارنامہ اپنے والد کا تختہ الٹنے میں حکومت پاکستان کا ساتھ دینا تھا۔ دیر عوام کو آزادی دلانے اور ریاست کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے میں محمد شاہ خسرو نے کلیدی کردار ادا کیا۔ حکومت پاکستان کو والد کے خلاف کافی ثبوت پیش کئے۔ اس نے ترقی کے کاموں میں حکومت پاکستان کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی۔ اس کے دور میں ریاست میں درجنوں سکول تعمیر کئے گئے۔ ریفرل ہسپتال بنائے گئے جس میں مفت دوائیاں تقسیم ہوتی تھی۔ شجرکاری کی گئی اور جنگلات کو فروغ حاصل ہوا۔

نواب اور جانشین میں فرق

نواب میں کٹر پختون ولی، مستقل مزاجی، دوست دشمن کی پہچان، بات کو تولنے کی قوت اور سفارتکاری میں کافی مہارت حاصل تھی۔ زبان دراز اور تندخو ہونے کے علاوہ اس کی شخصیت بارعب تھی اور اسے انتظامی امور چلانے کا کمال حد تک تجربہ تھا۔ جبکہ خسرو میں باپ جیسی صلاحیتوں کی کمی تھی نواب محمد شاہ جہان ایک بیدار مغز اور انتہائی حساس حکمران تھا۔ وہ ریاست کی پل پل کی خبر رکھتا تھا۔ افسروں سے سختی سے پوچھ گچھ کرتا تھا۔ لیکن محمد شاہ خسرو کی ریاست، انتظامیہ اور رعایا پر گرفت ڈھیلی پڑ گئی

تھی۔نواب ہر سپاہی کو خود بھرتی کرتا تھا جبکہ جانشین کے عہد میں بھرتیوں کا اختیار تحصیلداروں اور مشیروں کے پاس تھا۔

داستان دیر کا حوالہ

مصنف ریاض الحسن لکھتے ہیں[1] ''نواب محمد شاہ خسرو میں معاملہ فہمی، دور اندیشی اور حکومت چلانے کی کوئی اہلیت نہ تھی اس نے اپنے باپ کی طرح پرانے بہروپیوں، گرگوں اور قلابازوں کو لاکر عوام کے سروں پر بٹھادیا۔اس کے دور میں عوام کو شاہجہان کے دور سے زیادہ لوٹا گیا''۔نواب خسرو دیر کے ترقیاتی منصوبوں میں کوئی دلچسپی نہیں لیتا تھا بلکہ بسا اوقات وہ ریاست سے باہر رہتا تھا۔

ترقیاتی منصوبوں میں عدم دلچسپی، ریاست سے باہر رہنے میں دلچسپی اور امور ریاست چلانے میں عدم دلچسپی۔اس کی وجہ نواب محمد شاہ خسرو کے پاس اختیارات کی کمی بھی ہوسکتی تھی۔نواب محمد شاہ خسرو بہت جلد ہی افسروں کے بہکاوے میں آجاتا تھا۔شاید اس کے دور میں جو کچھ ہوا اس میں افسروں کا بڑا ہاتھ تھا۔

مذہبی زندگی

اپنی وفات سے کچھ عرصہ پہلے نواب محمد شاہ خسرو نے دربار میں اسلحہ کارخانہ کی عمارت گرا کر شاہی مسجد کے نام سے ایک بڑی مسجد کا سنگ بنیاد رکھا جو اس کے وفات کے بعد پایہ تکمیل تک پہنچی۔مگر ریاض الحسن نے نواب محمد شاہ خسرو کے مذہبی زندگی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ'' نواب محمد شاہ خسرو نہایت کنجوس ہے اس کا کام صرف دولت جمع کرنا ہے اگرچہ ایک سنی مسلمان ہے لیکن ارکان اسلام کی پابندی نہیں کرتا، حد سے بڑھ کر مے نوش ہے زمانہ موجود کا برائے نام مسلمان ہے''۔

ظلم وستم

نواب محمد شاہ خسرو کے عہد میں اس کے چچا تیمر خان نے ایک قلعہ بنایا اور اس کے اوپر برج کھڑے کئے۔نواب کو معلوم ہوا تو اس پر دھاوا بول دیا اور کارندے بھیج کر نہ صرف قلعہ مسمار کیا بلکہ اناج اور نوے ہزار کی خطیر رقم لوٹ لی۔

---

[1] داستان دیر صفحہ ۹۶

ا؎ ریاض الحسن لکھتے ہیں کہ" تحصیلدار ملیزئی نے جب میدان کے عوام کا جینا دوبھر کر دیا تو 1962ء میں میدان کی اقوام کے چار مشران ملک محمد امین، عمرا خان، شیخ عبدالحمید اور ملک نوروز خان پر مشتمل ایک جرگہ دیر دربار پہنچا اور تحصیلدار کے بھاری جرمانوں اور ظلم وستم کے خلاف شکایت کی۔

اس پر نواب نے ان کی گرفتاری کا حکم دیا۔ ملک محمد امین اور عمرا خان کو گرفتار کر کے نواب کے سامنے پیش کیا گیا جبکہ باقی دو ساتھی فرار ہونے میں کامیاب ہوئے۔ نواب نے پوچھا باقی ساتھی کہاں گئے جب انھوں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو نواب نے پاس کھڑے اپنے کارندوں سے کہا کہ ان کو مارو۔ حکم ملتے ہی کارندوں نے تابڑ توڑ لاٹھیاں برسانا شروع کر دیں۔ اس کے بعد نواب خود اٹھا اور پتھروں سے ان مشران کو مارنا شروع کر دیا جس سے ان کے منہ لہولہان ہو گئے۔ پھر انھیں گھسیٹ کر قید خانے لے جایا گیا اور ان کے پاؤں پر وزنی سلیپر رکھ دیئے گئے۔

نواب محمد شاہ خسرو کی معزولی

نو اکتوبر 1960ء تا دس جون 1967ء خسرو اقتدار میں رہا۔ اس کے دور میں چونکہ آزادی صحافت پر اتنی پابندی نہ تھی اسلئے 1967ء میں لوگوں نے اس کے خلاف کئی جلوس نکالے اور حکومت پاکستان سے اس کی برطرفی کا مطالبہ کیا۔ اس تحریک میں آئے دن اضافہ ہوتا رہا اور آخر کار پندرہ اپریل کو بمقام تیمرگرہ ایک عظیم الشان جلسہ ہوا۔ جس کے نتیجے میں دس جون 1967ء کو ایک باقاعدہ اعلان کے ذریعے نواب محمد شاہ خسرو کو معزول کر دیا گیا۔

دس جون اس لحاظ سے دیر کیلئے اہمیت کا حامل ہے کہ اس دن دیر پر یوسفزئیوں کے (1511ء تا 1967ء) یعنی 449 سالہ اقتدار کا خاتمہ ہوا اور اخون الیاس بابا کے عہد 1640ء سے لیکر محمد شاہ خسرو کی معزولی 1967ء تک نواب خاندان کے تین سو سترہ سالہ اقتدار کا آخری دن تھا۔ نواب محمد شاہ خسرو کو حکومت پاکستان نے بریگیڈئیر اور میجر جنرل کے اعزازات، ہلال قائد اعظم اور ہیز ہائنس کے خطابات سے نوازا۔ 1967ء میں دیر کو ایجنسی کی حیثیت دی گئی جس کے انتظامی امور پولیٹیکل ایجنٹ چلاتا رہا۔ 1969ء میں دیر کو ضلع کی حیثیت دی گئی اور ڈپٹی کمشنر نے انتظامی امور سنبھالے۔

ا؎ داستان دیر صفحہ ۷۸

شہاب الدین خان المعروف بہ جندول خان

جندول خان والد کے دور میں 1953ء تا 1960ء جندول کا حکمران رہا۔ وہ کئی سال تک اپنے والد کی پالیسیوں پر کاربند رہا۔ اس کا مزاج اور حکمرانی کا انداز باپ سے ملتا جلتا تھا یہی وجہ تھی کہ باپ کی خواہش تھی کہ وہ اس کے بعد حکمرانی کی بھاگ سنبھالے مگر حکومت پاکستان اڑے آئی اور جندول خان کا دیر پر حکمرانی کا خواب ادھورا رہ گیا۔ جندول خان ابتداء میں ایک با اخلاق جوان تھا۔ پہلے پہل وہ نماز بھی پڑھتا تھا اور سماجی کاموں میں بھی دلچسپی لیتا تھا۔ لیکن بعد میں آہستہ آہستہ بگڑتا گیا۔ جندول خان کی شخصیت پر باپ کا گہرا اثر تھا۔

''داستان دیر'' میں لکھا ہے کہ جندول خان پہلے نہایت قوم پرست تھا۔ اس نے ایک سکول بنایا ،طلباء کو مفت بس سروس فراہم کی، مفت دوائیاں تقسیم کرتا تھا۔ لیکن باپ کے منع کرنے پر رفاہی کاموں سے آہستہ آہستہ روگرداں ہوگیا۔ میدان بغاوت میں اپنے سامنے باغیوں کو قتل کروایا''۔

جندول خان کی بے راہ روی

نواب شاہ جہان نے اپنے جانشینوں کو مذہب پسند یا شریف النفس نہیں بنایا شاید اس خدشے سے کہ اس کی اولاد اس کی زندگی کے معمولات میں مداخلت سے باز رہے۔ جب جندول خان تعلیم اور دوسرے رفاہی کاموں میں دلچسپی لینے لگا تو باپ نے اسے سختی سے ایسے کاموں سے منع کیا کیونکہ جندول خا ن کی ایسی پالیسیاں رعایا کے ذہنوں میں احساس بیداری پیدا کرسکتی تھیں۔

1956ء میں ریاستی قوانین پر اختلاف اس حد تک بڑھا کہ جندول خان نے پورے جندول سے باپ کی متعین کردہ انتظامیہ کو برطرف کردیا اور اس کو جنگ کے لئے للکارا۔ مگر عقلمند باپ نے کسی طرح بیٹے کو منالیا اور ایک جرگہ نے بمقام تیمر گرہ باپ بیٹے میں عارضی صلح کرادی۔

جب اس کے بیٹے کے ذہن میں ایسے خیالات پیدا ہوئے تو اس کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ اپنے بیٹے کو عیاشی اور نشے کی دنیا میں لے جائے کیونکہ نواب جانتا تھا کہ بیٹے کے جدید خیالات کا تدارک، طاقت اور دباؤ سے ممکن نہیں۔

نواب نے شہاب الدین خان کیلئے منڈا میں ایک عالیشان محل بنوایا اور اس کے لئے نشہ آور ادویات تیار کرنے والے اپنے حکیم محمد شاہ خان کو بھی بھیجا۔ نواب کا یہ مقصد تھا کہ اگر شہاب الدین ہوش میں رہا، اس کی محفل میں پاکیزہ لوگ آئے، وہ پرہیز گار بنا اور نماز پڑھنی شروع کی تو عدل وانصاف کی صورت میں نہ صرف مجھ میں اور میرے بیٹے میں جندول اور دیر کے عوام فرق محسوس کرینگے بلکہ وہ میری تمام پالیسیوں میں بھی رکاوٹ بنے گا۔ ایسی باتوں سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ نواب نے اپنے خاندان کے ساتھ بھی اقتدار کی خاطر کیا کچھ نہیں کیا اور اسے دنیاداری اور حکمرانی کتنی عزیز تھی۔

ا ''داستان دیر''

جندول خان مذہبی لحاظ سے سنی مسلمان تو تھا لیکن فرائض اسلام کا کوئی خاص پابند نہ تھا۔ اوائل عمری میں کبھی کبھار نماز پڑھ لیتا تھا لیکن پھر اس طرف سے روگرداں ہوتا گیا۔ علماء دین کا سخت دشمن بن گیا تھا یہاں تک کہ ایک عالم کو حق گوئی پر اصطبل میں گھوڑوں کے لید پر بٹھا دیا تھا۔ شراب کباب اور عیاشی کے لحاظ سے مصر کے شاہ فاروق سے بھی چند قدم آگے تھا یہ کئی قسم کے نشے کرتا تھا۔ مصدقہ ذرائع کے مطابق گرفتاری کے وقت اس کے محل سے دوسو بیس بوتلیں شراب کی برآمد ہوئیں۔

نواب شاہ جہان اور جندول خان میں مماثلت

بیدار مغزی، سخت خوئی، حساس پن، مردم شناسی اور رعایا کے ساتھ رویہ کے معاملے میں واحد جندول خان تھا جو اپنے باپ پر گیا تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ نواب شاہ جہان کے باقی بیٹے انتظامیہ سے دور رہے مگر جندول خان نے اپنے باپ کا کالا قانون جندول کے عوام پر لاگو کئے رکھا۔ جندول خان ظلم و ستم میں بھی کافی مشہور تھا۔ اس نے اپنی سخت سزاؤں سے جندول کے عوام کو کافی عرصے تک خوفزدہ رکھا۔ مجرموں کو بنگلے سے نیچے لٹکاتا تھا۔ میدان کے عوام نے بغاوت کی تو جندول خان نے اسے سختی سے دبایا حتی کہ عوام کے خلاف توپیں تک استعمال کئے۔

ا داستان دیر صفحہ ۸۷

جندول خان شکار کے بعد

نواب محمد شاہ جہان کی ذاتی زندگی

پورا نام نواب سر محمد شاہجہان خان

تاریخ پیدائش 3 اپریل 1895ء بمقام براول بانڈئی

تاریخ وفات 24 جولائی 1966ء راولپنڈی سی ایم ایچ ہسپتال

عرصہ اقتدار 1924ء تا 1960ء چھتیس سال

بچپن

محمد شاہ جہان خان کی ولادت صاحبہ بی بی کے ہاں ہوئی جو ایک مزدور کی بیٹی تھی۔ اس کا گھر کلپانئی سر (براول اور میدان کی پہاڑی) میں تھا مگر قابلیت اور حسن کی وجہ سے نواب کی بیگم بنی۔ اس میں کئی خوبیاں تھیں وہ ایک چالاک، زیرک اور دانشمند عورت تھی۔

(یاد رہے کہ خارو بی بی نواب محمد شاہ جہان کی سوتیلی ماں تھی)

نوعمر شاہ جہان پہلے اپنی ماں صاحبہ بی بی کی گود میں پلا بڑھا۔ عمر ڈیڑھ ماہ کو پہنچی تو نواب اورنگزیب نے اسے پہاڑی درّے عشیرئی میں بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ عبدالرحیم سمکوٹ خان کو بوجہ رشتہ داری محل بلا لیا گیا۔ اس نے ہامی بھری اور اس طرح خادماؤں کے ساتھ یہ شہزادہ عشیرئی سمکوٹ پہنچا۔

عبدالرحیم خان کی زوجہ نورہ بی بی کا ایک فرزند فیض طلب خان تھا۔ نورہ بی بی نے بخوشی ولی عہد کو قبول کیا۔ دونوں بچے ایک ساتھ دودھ پیتے اور ماں انھیں ایک چارپائی پر سلاتی۔ کئی ماہ سمکوٹ میں گزارنے کے بعد نورہ بی بی اسے گود میں لئے محل واپس لے آئی۔

بچپن کی یادوں کی وجہ سے شہزادہ جوانی میں سمکوٹ کا چکر لگاتا تھا۔ فیض طلب کے ساتھ اس کی تاحیات دوستی رہی اور وہ کئی سال اس کے ہمراہ محل میں رہا نواب شاہ جہان اس کے ساتھ بٹیر بازی اور شطرنج کھیلا کرتا تھا۔ وفات تک اس کے دل میں عبدالرحیم اور نورہ بی بی کیلئے احترام کا جذبہ موجود تھا۔ رضائی ماں کو وہ سمکوٹ آبئی کہتا تھا۔ نورہ بی بی کی اولاد کو اب بھی یاد ہے کہ بچپن میں شاہ جہان دودھ اور دہی کا شوقین تھا اور اسے ''منزرے'' نامی کھیل بھی بہت پسند تھا۔

تعلیم

ولی عہد محمد شاہ جہان دو سال تک دیر دربار میں کھیلتا رہا۔ وہ تین سال کا تھا کہ اس کا چھوٹا بھائی عالمزیب خان پیدا ہوا۔ بچپن میں دونوں شہزادوں کو دینی علوم کے حصول کیلئے اوچ بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا ۔ایک صبح صاحبہ بی بی دونوں بچوں کو دربار لائی، بچوں کو خوب سنوارا گیا تھا۔ جب فضل عظیم جان ان بچوں کو لئے محل کے صدر دروازے پر پہنچا، پیچھے مڑ کر دیکھا تو ماں کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ ابھی یہ بچے زیر تعلیم تھے کہ سوات سے بغاوتیں شروع ہوئیں۔ جنگی مہمات اور باپ کی مصروفیات نے ان بچوں کی تعلیم و تربیت کو بری طرح متاثر کیا اور انھیں اوچ سے واپس دیر محل بلا لیا گیا۔

لڑکپن

گیارہ سال کی عمر میں ولی عہد کو جنگی میدان میں اترنا پڑا۔ سوات کے خلاف پہلی جنگ میں نو عمر ولی عہد نے نہ صرف شکست کھائی بلکہ ''لڑم'' (بچھو) پہاڑی سے فرار ہو کر وہ نہا گدرہ پہنچا۔ میاں گل جان نے دیر پر قبضہ کرنے کیلئے جندول کے لشکر کے ہمراہ دیر خاص تک پیش قدمی کی۔ بمقام اخگرام سولہ سالہ ولی عہد اور چودہ سالہ عالمزیب خان دیر و جی لشکر کو لئے اپنے چچا کے سامنے آئے مگر انھیں شکست ہوئی۔

چچا نے نہ صرف بھتیجوں کو شکست دی بلکہ انھیں قیدی بنانے کا تہیہ بھی کر لیا۔ مگر جنگ کے گرد و غبار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سولہ سالہ شاہ جہان اور تیرہ سالہ عالمزیب خان پہاڑی دروں سے باجوڑ فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ میاں گل جان نے دیر کو قبضے میں لے لیا اور نواب اورنگزیب معزول ہو کر نہا گدرہ میں پناہ لینے پر مجبور ہوا۔ کچھ عرصہ بعد معزول نواب نے نہا گدرہ سے اور بیٹوں نے باجوڑ سے لشکر کشی کر کے اقتدار پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ الغرض ولی عہد نے لڑکپن جنگی میدانوں میں گزرا۔

ولی عہدی کا زمانہ

فارغ اوقات میں ولی عہد براول باندئی بنگلے میں وقت گزارتا۔ شکار کھیلتا اور معجون استعمال کرتا کئی جنگی محاذوں پر ناکامی کی وجہ سے وہ کافی مایوس ہو گیا تھا۔ علاوہ ازیں مقامی قبائلی عمائدین کے ساتھ

بھی وقت گزارتا جس کی بدولت عملی تعلیم اور ذہنی پختگی حاصل کی۔اس نے جاسوس رکھے تھے جو دربار اور محل کی پل پل کی خبر بہم پہنچاتے۔کبھی کبھار خود دیر خاص جا کر والد کی طرز حکومت اور خود غرض افسروں کا مشاہدہ کرتا۔

محل میں ولی عہد کی کوئی وقعت نہ تھی، کیونکہ درباری اس کے بھائی کو نواب بنانے کے متمنی تھے ولی عہد یہ سب کچھ خاموشی سے دیکھتا رہا، دونوں بھائیوں کے مابین درباریوں کی وجہ سے کدورت نے جنم لیا۔اور باپ بیٹوں کے درمیان بھی فاصلے بڑھنے لگے۔یہی وجہ تھی کہ انتیس سال کی عمر تک اسے ولی عہد ہی رہنا پڑا، اور وہ براول بانڈئی میں کسمپرسی کی حالت میں زندگی گزارنے پر مجبور تھا۔

(باقی تفصیل دیکھئے گمنام ریاست حصہ اول)

ازدواجی زندگی

(۱) پہلی بیوی محمد نواز خان کی ماں (تورہ بی بی) قوم بھادر شاہ خیلہ براول

(۲) خسرو نواب کی ماں (شیخہ بی بی) نورستانی

(۳) جندول خان کی ماں (اخونزادی بی بی) شہزادی چترال

(۴) محمد عمر خان المعروف بہ بدر خومیاں (نوشہرہ) کی بیٹی

(۵) حیا سیرئی خان کی ماں (بنگلے بی بی) ایک کلال کی بیٹی

(۶) (شاہی بی بی) سید احمد خان کی بیٹی

(۷) (سوات بی بی) سوات کے ایک خان کی بیٹی

(۸) (گرڑئی بی بی) غلام ملک کی بیٹی

اولاد

بیٹے

(۱) محمد نواز خان

(۲) نواب محمد شاہ خسرو خان

(۳) شہاب الدین خان (جندول خان)

(۴) محمد شاہ خان (حیا سیرئی خان)

بیٹیاں

(۱) مہتر چترال ہیز ہائنس ناصر الملک کی بیوی

(۲) محمد عمر خان کی بیوی (نواب مردان اکبر خان ہوتی کی بہو)

(۳) ڈوڈبا ہ خان (حیات اللہ خان) کی بہو

(۴) گرڑئی بی بی کی بیٹی (میدان بانڈئی خان ظاہر شاہ خان کی شریک حیات)

(۵) پیر مانکی شریف کے بیٹے مولانا روح الامین کے ساتھ حیا سیرئی خان کی چھوٹی بہن کی منگنی ہوئی تھی لیکن شادی نہ ہوسکی کیونکہ شہزادی کی دماغی حالت ٹھیک نہیں رہی تھی۔

یاد رہے کہ نواب کی بیویوں اور اولاد کی اصل تعداد نزدیکی افسران اور رشتہ داروں کو بھی معلوم نہ تھی۔ انتہائی باپردہ نواب نے نہ صرف محل کی معلومات کو صیغہ راز میں رکھا، بلکہ کسی بیوی یا اولاد کے وفات پاتے ہی علی الصبح تاریکی میں دفن کر دیا جاتا۔ کہ کہیں لوگ واقعے کی خبر پا کر بڑی تعداد میں جمع نہ ہو جائیں

شخصیت

نواب کا قد اوسط (پانچ فٹ سات انچ کے لگ بھگ) تھا۔ رنگ سانولا، جسم مضبوط اور توانا، آنکھیں لال اور بڑی اور شخصیت بارعب تھی"۔ ایرانی سیاح لکھتے ہیں "نواب کی عمر پینسٹھ برس ہے لیکن بڑے مضبوط اور قوی الجثہ ہیں۔ میں نے دیکھا کہ ان کے جسم کی ہڈیاں بہت بڑی ہیں"۔

لباس

نواب ہمیشہ خاکی کپڑا زیب تن کرتا کبھی سفید یا رنگ دار کپڑا نہیں پہنا۔ اس کے کپڑوں، جوتوں، چادر اور کمبل وغیرہ کا اندراج ایک علیحدہ رجسٹر میں کیا جاتا۔ ایک عرصہ تک استعمال کرنے کے بعد نواب ان اشیاء کو دوستوں اور عزیز و اقارب کو تحفے میں دے دیتا۔

کپڑوں کی سلائی کیلئے ملا حیات نامی درزی کو پشاور سے بطور خاص بلایا گیا تھا۔ نواب کا ذاتی لباس "ویلہ" کہلاتا تھا۔ گرمیوں میں خاکی رنگ کی ہلکی قمیص پاجامہ اور سردیوں میں خاکی رنگ کا موٹا کپڑا پہنتا۔ اکثر چادر اوڑھے رکھتا۔ لباس ڈھیلا ڈھالا، گلے کے بٹن بند، آستین کھلی، کھلی شلوار اور پائینچے تیرہ انچ رکھتا تھا۔ سر پر ترکی ٹوپی سجائے رکھتا جس کے وسط میں بٹن لگا ہوتا تھا۔

سردیوں میں ایسا پکول استعمال کرتا جس میں صرف چہرہ نظر آتا اس کو جیکر پکول کہا جاتا تھا۔ انگریزی کوٹ کے علاوہ تھان کوٹ بھی استعمال کرتا جو بدخشان میں خصوصی آرڈر پر تیار ہوتا تھا۔ چادر کے طور پر لوئی ''شڑئی'' بھی اوڑھے رکھتا جو مقامی جولاہے (جولاگان) بڑی محنت اور نفاست سے تیار کرتے۔ ''پٹو'' نامی چادر پشاور یا کابل سے منگواتا۔ انگریزی جوتے بھی استعمال کئے مگر پسندیدہ جوتے کلوش اور کھسے (پنڑے) تھے جن پر کیتاڑی کا شریف احمد موچی بڑی نفاست سے بیل بوٹے بناتا تھا۔

خاکی کپڑے میں ملبوس نواب کو دیکھ کر لوگ اس کو سادگی پسند خیال کرتے۔ مگر یہ ایک دکھاوا تھا مصدقہ اطلاع کے مطابق سونے کے فریم والا چشمہ پہنتا، زمرد اور یاقوت کے ہیروں کی انگوٹھی اور سونے کی گول زنجیر والی گھڑی گلے میں لٹکائے رکھتا۔ روزانہ شیو کرتا لیکن کبھی کبھار شیو بڑھا بھی لیتا، مونچھیں اور سر کے بال چھوٹے رکھتا، رومال اور نسوار کی ڈبیہ پاس رکھتا۔

مزاج

نواب انتہائی سخت مزاج کا مالک تھا۔ اس کی تندخوئی اور سخت مزاجی ہی اس کے رعب کا سبب تھی۔ انتظامیہ حکم ملتے ہی فوراً بجالاتی۔ حکم کی بجاآوری پر خوش ہوتا اور قانون توڑنے یا نظام میں تبدیلی لانے کے خیالات پر سخت برافیختہ ہوجاتا۔ نشست و برخاست اور قیام و طعام ذاتی مزاج پر منحصر تھا۔ فیشن ایبل اور سمارٹ لوگوں کو ناپسند کرتا تھا۔ اسے وہ شخص پسند تھا جو بڑا نوالہ لیتا، جس کے بال، کپڑے اور جوتے پھٹے پرانے ہوتے اور وہ شخص علم و عقل کے لحاظ سے گنوار ہوتا۔ جب کبھی کوئی مہذب انداز اور لہجے میں مخاطب ہوتا تو اس کے تیور بدل جاتے۔ سر پر ٹوپی نہ رکھنا، بن ٹھن کہ رہنا یا پکول ترچھا کر کے رکھنا یا اس میں پھول لگانا بھی نواب کے مزاج کے خلاف تھا۔ جب کسی مجرم کی پیشی ہوتی تو نواب کا چہرہ سرخ ہوجاتا اور آواز میں گرج پیدا ہوجاتی۔ غصے کی انتہائی حالت میں پپوٹے متحرک ہوجاتے۔

طنز و مزاح

سنجیدگی اور متانت اس کی تصویروں میں نمایاں ہے۔ اگرچہ وہ بسا اوقات تنہا پسند اور خاموش طبع تھا مگر باتونی بھی تھا۔ ایرانی سیاح کے مطابق ''نواب صاحب باتیں بہت زیادہ کرتے ہیں مجھے بتایا گیا کہ متواتر تین گھنٹے تک باتیں کرسکتے ہیں زبان میں بڑی چاشنی ہے اور فارسی خوب بولتے ہیں''۔ کھیل

کے دوران سنجیدگی کو پرے رکھتا اور شطرنج کھیلتے ہوئے ایک کھلاڑی کی حیثیت سے کھیل سے خوب لطف اندوز ہوتا۔ وائسرائے ہند یا گورنر سے ملاقات کے وقت اور یا پھر کتوں کے ساتھ ہوتا تو اس کا چہرہ کھل اٹھتا۔ قبائلی عمائدین کی کسی محفل میں شاذ و نادر ہی قہقہہ لگاتا۔ سلطان خیل اور پائندہ خیل کے عمائدین آتے تو شائستگی کا مظاہرہ کرتا۔

فطرتاً سنجیدہ ہونے کے باوجود مزاج میں طنز و مزاح کا عنصر بھی شامل تھا۔ انجون نامی ایک پنجابی جو گھوڑے سدھانے پر مامور تھا بہت چرس پیتا تھا، رمضان المبارک کی ایک سہ پہر کو گھوڑا سدھانے کے بعد واپس آیا تو دیکھا کہ نواب کرسی پر براجمان ہے۔ نواب نے مڑ کر آواز دی ''تم گھوڑا شرینگل سے دوڑا کر لائے تو ہو لیکن تم نے اس کے پاؤں خراب کر دیئے ہیں''۔

یہ سن کر پنجابی چونکا اور جو نیچے دیکھا تو گھوڑا ٹھیک تھا۔ نواب نے کہا جاؤ۔ کچھ دور جا کر نواب نے پھر آواز لگائی اور وہی الفاظ کہے تیسری دفعہ جب ایسا ہوا تو واپس مڑتے ہی پنجابی بڑبڑانے لگا۔ اس نے نواب کو برا بھلا کہا مگر اس نے خوب قہقہہ لگایا اور ہنستے ہوئے افسر کو آواز دی۔ ارے اسے چرس دے دو۔ پنجابی اصطبل کی طرف بڑھا اور نواب اسے دیکھتے ہوئے ہنستا رہا۔

آنسو

سخت گیر اور تند مزاج نواب کے بعض موقعوں پر آنسو بھی بہے۔ ''ایک شام کو دربار میں خال کا پاچہ محمد سیٹھ نواب کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا، باتوں ہی باتوں میں نواب اپنے جانشینوں کی نااہلی پر رونے لگا۔ ۔لاہور میں نظر بندی کے دوران اکتیس سال بعد اپنے بھائی عالمزیب خان سے ملاقات ہوئی، تو اس سے بغلگیر ہو کر زار و قطار رونے لگا۔ رضائی بھائی فیض طلب خان سے ملنے پر بھی اکثر آبدیدہ ہو جاتا تھا''۔

لب و لہجہ

نواب کی گفتار سو فیصد پختو الفاظ پر مشتمل بڑی مدبرانہ اور عقلمندانہ ہوتی تھی۔ قبائلی عمائدین کے مجمع میں نواب کی موجودگی میں بہت علمی اور دانشمندانہ باتیں ہوتی تھیں۔ جب کوئی افسر غلطی کرتا یا مجرم سامنے آتا تو اس وقت اس کی زبان بے لگام ہو جاتی جو زبان پر آتا کہہ دیتا تھا۔

جب اس کے سامنے کوئی ''کنڑ کوڈ بے'' (دیا سلائی) کو ماچس یا کپڑے ''ٹوکی'' کو کپڑا کہتا تو اسے برا بھلا کہتا۔ایک دفعہ محل کے میدان میں ناصر خان اور محمد شاہ خان کی ٹیموں کے مابین والی بال کھیلا جا رہا تھا۔ اتفاقاً اس وقت نواب دربار کے کونے سے نیچے بازار کا تماشہ کر رہا تھا، بال لکیر سے باہر گرا تو ریفری گل تحصیلدار کے بیٹے نے Out کا نعرہ لگایا جسے سن کر نواب نے اسے خوب ڈانٹ پلائی۔

لوگوں کو بڑے دلچسپ القاب سے نوازتا تھا۔اپنے بیٹے محمد شاہ خسرو کو ''ھلکہ'' چھوٹے بیٹے محمد شاہ خان کو ''وڑوکیہ''، پوتے ناصر خان کو ''لالی'' کہہ کر بلاتا۔ بیٹے انھیں بابا کہہ کر پکارتے۔عشیرئی کے صوبیدار اسفندیار کے والد کا نام شاہ مراد تھا وہ اسفندیار کو ''شاہ مراد'' کہہ کر پکارتا تھا۔سپاہی یا حوالدار کو آواز دیتا ''ھلکہ دفلانکی زویہ''، نواب اپنے ڈرائیور کو ''تالا شے''، سوات کے حکمران میاں گل عبدالودود کو ''میاں گلے''، تور خان صوبیدار مشیر مال کو ''تورہ کے''، میر منشی کو ''گلاب''، رضائی بھائی فیض طلب خان کو ''لالا''، نہاگدرہ پام جان ملک کو ''ترہ'' اور شوہ کے نادر ملک کو ''خان کاکا'' کے نام سے پکارتا۔اسی طرح انگریز کو ''پرنگے'' اور پاک فوج کو پینٹ پہننے کی وجہ سے ''دوہ خوخی'' کہتا تھا۔

نشست و برخاست میں امتیاز

رتبے اور عہدے کے لحاظ سے وہ مہمانوں کے کی نشستوں کا اہتمام کرتا۔خواص کو صوفوں پر بٹھایا کرتا، جیسے ملاکنڈ انتظامیہ اور اہم قبائلی سردار، عام قبائلی عمائدین قالین پر بٹھاتا اور خود شاہی کرسی پر براجمان ہوتا۔اس کی گفتگو کا انداز آدمی کی حیثیت مطابق ہوتا تھا۔زیر دست افراد کے ساتھ اس کی گفتگو حاکمانہ اور دوٹوک ہوا کرتی تھی۔مجرم یا کسان پیش ہوتا تو اسے خالی فرش پر بٹھا کر تند خوئی سے پیش آتا تھا۔بعض اوقات نوبت گالی گلوچ تک پہنچ جاتی۔

مصافحہ

وائسرائے ہند یا گورنر جنرل ریاست کا دورہ کرتے تو تحصیلدار انھیں خوش آمدید کہہ کر مہمان خانہ لے جاتا۔نواب مہمانوں سے ملنے کیلئے اپنے خاصہ داروں سمیت بڑے ٹھاٹھ باٹ سے جاتا تاکہ انھیں مرعوب کیا جاسکے۔نواب کا کہنا تھا ''زہ زکہ لک ورستے ورزم چہ انگریز ماتہ پاسی'' میں اسلئے تاخیر سے آتا ہوں تاکہ فرنگی میری تعظیم میں کھڑا ہو''۔

وہ ہر ملاقاتی سے ہاتھ نہیں ملاتا تھا صرف خواص سے مصافحہ کرتا تھا اور بغلگیر ہونا اس کی فطرت میں نہ تھا۔ دو گز کے فاصلے سے عمائدین جھک کر اسے سلام کرتے تھے اور وہ کرسی پر ہی بیٹھا رہتا۔ رعایا کی طرف سے اسے جھک کر سلام کرنا پسند تھا۔ ایک دفعہ نواب تیمر گرہ جا رہا تھا بمقام واڑی بہت سے لوگ جمع تھے، نہا گدرہ کے پام جان ملک کے نواسے نے سلوٹ کیا۔ نواب نے گاڑی رکوا کر اسے تنبیہ کی کہ" آئندہ ایسا سلام نہ کیا جائے"۔ جب وہ دیر سے تیمر گرہ آتا تو راستے پر جگہ جگہ قبائلی عمائدین سلام اور آداب پیش کرنے کیلئے نکل آتے مگر نواب رکے بغیر ہاتھ سے سلام کا جواب دے کر گزر جاتا تھا۔ اسی طرح شکار کیلئے دارالحکومت کے بازار میں سے گزرتا تو گھوڑے پر سوار ہاتھ کے اشارے سے عمائدین کو سلام کر کے آگے نکل جاتا تھا۔ اس کی عادت تھی کہ وہ گاڑی میں دو کتے ساتھ رکھتا تھا کسی اور کو ساتھ بٹھانا پسند نہیں کرتا تھا۔

معمولاتِ زندگی

صبح کا آغاز

نواب صبح سویرے جاگنے کا عادی تھا۔موسم سرما میں سورج نکلنے سے پہلے چغہ اور جیکر پکول پہنے نکلتا۔لوہے کے تھال ''منقل'' میں جلتی ہوئی آگ کے پاس آکر بیٹھ جاتا۔اکیلے بیٹھے آگ سے لطف اندوز ہوتا اور کلہاڑی لیکر لکڑیوں کے ٹکڑے کر کے انھیں منقل میں رکھتا۔محل کے برجوں پر سورج کی کرنیں پڑتے ہی نواب ہولے سے محل کے اندر چلا جاتا۔

محل سے نکل کر صبح کا آغاز ریاست کے معاملات سے شروع کرتا۔خزانچی حبیب الحسن کو بلوا کر خزانے کی نقدی اور تحصیلوں سے وصول شدہ جرمانوں کی بابت پوچھتا۔خزانچی صوبیدار فاتح جان، امبار مرزا (اناج سٹور افسر) اور مشیر مال اپنی اپنی باری پر رجسٹر لئے پھرتی سے حاضر ہوتے۔ہر افسر پچھلے دن کی کارگزاری بیان کرتا۔مثلاً مہمان خانہ میں مہمانوں کی تعداد بمع سکونت و ولدیت، کتوں نے کتنا دودھ پیا، گھوڑوں نے کتنا چارہ کھایا، شکاری پرندوں کیلئے کتنے بکرے ذبح کئے گئے وغیرہ۔الغرض تیرہ رجسٹروں کے کھاتے چیک کر کے نواب اس پر اپنے دستخط اور مہر ثبت کرتا۔

اس کے بعد وہ ''بازوان'' اور ''مشکاروں'' کو بلوا کر پرندوں کا حال پوچھتا، پھر کتوں کا جمالدار کتوں کا حال بتاتا۔اسی طرح گھوڑوں کا سائیس بھی گھوڑوں کے بارے میں تفصیل بتا۔یوں ایک بیدار مغز اور حاضر دماغ منتظم کے طور پر صبح سویرے ہی ریاستی امور اور سیاسی حالات سے باخبر رہنے کی کوشش کرتا تھا۔

دفتری اوقات کار

اس کے بعد نواب عدالتی امور نمٹانے شاہی کرسی پر براجمان ہو جاتا۔میر منشی عرضیاں لئے حاضر ہوتا اور اپیل کنندہ، مجرم یا چور وغیرہ دربار کے دربان کی آواز پر کان لگائے بیٹھے رہتے۔نواب ہر عرضی پر مخصوص الفاظ میں میر منشی کے نام ہدایات لکھتا۔میر منشی تفصیل لکھ کر اسے واپس نواب کے سامنے میز پر رکھتا۔چشمہ لگائے نواب اس پر سرسری نظر دوڑاتا اور اس پر حکم جاری کرتا۔یوں یہ حکمنامہ مقامی تحصیل دار کے پاس بھیجا جاتا جس مزید کاروائی کی جاتی۔

عدالت آٹھ سے گیارہ بجے تک لگتی۔گیارہ بجے اندر جا کر کھانا کھاتا اور چار بجے تک عموماً محل

کے اندر ہی رہتا۔ سہ پہر کو درجنوں عمائدین کئی گھنٹوں کے انتظار کے بعد ملاقات سے مشرف ہوتے ۔شام ڈھلتے ہی دربار کے ایک کونے میں درجنوں مسلح سپاہیوں کے پہرے میں کھڑے یا کرسی پر بیٹھ کر بازار اور دریا کا نظارہ کرتا۔ سورج غروب ہوتے ہی محل میں داخل ہو جاتا اور پھر صبح تک کسی صورت میں بھی محل سے باہر نہیں نکلتا تھا۔ معمولات کو دیکھا جائے تو چند گھڑی صبح اور سہ پہر کی سیر، عمائدین سے ملاقاتیں اور عدالتی امور کے اوقات کو ملا کر وہ چھ گھنٹے باہر اور لگ بھگ اٹھارہ گھنٹے محل کے اندر ہی گزارتا تھا۔

دلپشوری

نواب ہمیشہ اپنی ذات اور انا کے خول میں بند رہا۔ ایک طرف افسروں اور دوسرے تعلق داروں سے فاصلہ روا رکھا تو دوسری طرف چند ایسے لوگ بھی تھے جن کی معیت میں وقت گزارنے اور گپ شپ لگانے میں اسے مزہ آتا تھا۔ ان میں سمکوٹ کا فیض طلب خان، خان پاچہ میدان، انعت خان، خان سڑے، گرڑئی ملک اور شاہ وزیر مرزا قابل ذکر ہیں۔

محفل سجا کر شطرنج اور تاش کھیلنے کا شوقین تھا۔ یہاں بلا تفریق گپ شپ ہوتی، سنجیدگی اور متانت کو بالائے طاق رکھ کر ایک عام کھلاڑی کی حیثیت سے شریک ہوتا۔ ریاست میں کوئی بھانڈ (مسخرا) یا نقال ہوتا تو اسے دربار بلوایا جاتا۔ ان لوگوں پر مشتمل الگ گروہ تھا۔ یہ لوگ نقل اتارتے ،لطیفے سناتے اور پھبتیاں کستے جس سے نواب خوب لطف اندوز ہوتا تھا۔ ایسے مسخروں (ٹوتماروں) میں مشہور فیروز گجر تھا جس کے نخروں پر محفل میں قہقہے بلند ہوتے۔ محفل کے ختم ہوتے ہی حکمران کے چہرے پر وہی رعب اور سنجیدگی عود کر آتی جو اس کا عام معمول تھا۔

خوراک

دربار میں روزانہ دستر خوان لگائے جاتے۔ ایک ولی عہد کا دستر خوان جس پر انتظامیہ اور اوسط درجے کے مہمان ہوتے اور دوسرا نواب کا جس پر معززین اور قبائلی عمائدین کی ضیافت کی جاتی۔ طرفہ تماشہ تو یہ ہے کہ نواب نے کبھی بھی مہمانوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا نہیں کھایا وہ کھانا ہمیشہ محل کے اندر کھاتا تھا ۔کھانے کے برتن فرانسیسی ساختہ ''گردز'' کے نام سے مشہور تھے۔ جن میں زہر آلود خوراک ڈالی جاتی تو یہ

خود بخود ٹوٹ جاتے تھے۔

اس کی خوراک کا وقت بھی عجیب تھا۔ گیارہ بجے ناشتہ کر کے رات کا کھانا چار بجے کھانا اس کا معمول تھا۔ شاید یہ ترتیب معالج یا حکیموں کی بتائی ہوئی ہو۔ اس دوران اخروٹ اور بادام کھانا اس کی عادت تھی۔ نواب صحت کے بارے میں بڑا حساس تھا اور بسیار خور نہ تھا۔ باورچی ایک پاؤ لایان چاول ،ایک پاؤ مونگ اور ایک پاؤں دیسی گھی ملا کر پلاؤ تیار کرتا کیونکہ اسے باقاعدہ تول کر کھانا بنانے کا حکم تھا۔ اسے مچھلی پسند تھی مچھلی اس کیلئے شجادئی کا ملک اوڈیگرام سے شکار کر کے پہنچاتا۔ مچھلی کباب کی صورت میں پلاؤ کے ساتھ کھاتا تھا۔ کوہستانی دنبے کے گوشت کے علاوہ اسے بٹیر اور چکور کا گوشت بھی مرغوب تھا۔ لاہور میں چاول ہانڈی (دیگچی) کی تہہ کر یدکر انگلیوں سے کھاتا۔

اس کیلئے پانی چکیاتن میں واقع ایک چشمے (خوگے اوبہ) سے لایا جاتا تھا۔ جبکہ گرمیوں میں برف ڈروخوڑ (لواری، فاصلہ 40 کلومیٹر) کے گلیشیئرز سے لائی جاتی۔ ایک مشین سے سوڈا واٹر تیار کر کے پینے کے علاوہ ہر شام کو دودھ الائچی کا قہوہ پینا معمول تھا۔ ایوب جان نامی تاجر کابل سے انگور اور ہندوستان سے آم خرید کر پیش کرتا۔ شاہی باغات میں بادام، پستہ، انار اور انگور پیدا ہوتے۔ جس خان یا ملک کے باغ میں عمدہ پھل پیدا ہوتے وہ انھیں نواب کو نذرانے کے طور پر بھیجتا۔

نواب کھانے پینے کے معاملے میں کافی محتاط اور شکی مزاج تھا۔ اس کے کھانے کا کئی بار معائنہ کیا جاتا۔ وہ صرف خزانہ کے صوبیدار حبیب الحسن اور چاڑا کے ہاتھ سے پانی پیتا تھا۔ ایک دفعہ تیمر گرہ کے باغ کی سیر کو گیا۔ وہاں مالی صاحب علی کو گاجریں لانے کو کہا۔ جب مالی گاجریں لے آیا۔ تو اسے اپنے ہاتھوں سے دھویا اور مالی سے کھانے کو کہا مالی نے ایک گاجر کھائی تو نواب نے پاس کھڑے نوکر کو اشارہ کیا اور اس نے گاجریں اٹھالی اور پھر وہاں سے چل پڑے۔

باغات میں چہل قدمی

نواب پھولوں اور پودوں سے شغف رکھتا تھا۔ باغ میں سیر کرنے جاتا، چاقو اور درانتی ساتھ لے کر فاضل جڑی بوٹیوں کی کٹائی بھی کرتا۔ شاہی باغات کے لئے میوہ دار پودے اور پھول دہلی اور لاہور سے منگوائے گئے تھے۔ آج بھی تیمر گرہ ریسٹ ہاؤس میں ہندوستانی بلب نما پھول دیکھے جاسکتے

ہیں۔اس زمانے میں تیمر گرہ باغ (موجودہ بس سٹینڈ) میں دو نہریں بہتی تھیں۔اس باغ میں خوبصورت پھولوں کی کیاریاں، انواع واقسام کی سبزیاں، آنار، کھجور، مالٹے اور مختلف قسم کے انگور کے علاوہ اور بھی پھلدار درخت تھے۔نواب موسم سرما میں سہ پہر کو اس باغ کی سیر کو جاتا تھا۔

ریڈیو اور اخبار کا مطالعہ

نواب ریڈیو کابل سے پشتو، ریڈیو تہران سے فارسی اور دہلی سروس سے اردو میں خبریں سنتا تھا۔دوسری جنگ عظیم کے دوران انگریزی اور جرمن خبروں کا خلاصہ بادین استاد نواب کو سناتا اور جنگ کی صورت حال سے بھی مختصر طور پر آگاہ کرتا۔خدایار نامی شخص ریڈیو سے اہم خبریں اور معلومات فارسی میں لکھ کر نواب کو پیش کرتا۔نواب کو لاہور سے شائع ہونے والا اخبار ''زمیندار'' روزانہ ڈاک بس کے ذریعے پہنچتا جو کہ ریاست میں آنے والا واحد اخبار تھا۔دوران نظر بندی اس نے لائبریری بنائی تھی۔وہ شعر و شاعری کا دلدادہ تھا اور تنقید بھی کیا کرتا تھا۔

نواب کے بیٹھنے کی نشست

قبائلی عمائدین کے بیٹھنے کی نشست

نواب کے ذاتی دفتر کا ایک منظر

منشیات کا استعمال

کسی عارضہ کے لاحق ہونے کی صورت میں نواب ہندوستان کے مشہور حکیم اجمل خان سے مشورہ لیتا۔ بعد میں حکمران نے حکیم اجمل خان کے پاس اپنا ملازم شمشی خان حکیم بھیجا جس نے کئی سال میں علم طب سیکھا اور شاہی حکیم کی حیثیت سے خدمات سرانجام دینے لگا۔

بعد میں حکمران کی طب میں دلچسپی کے سبب کئی شاہی طبیب رکھے گئے۔ یہ لوگ مختلف جڑی بوٹیاں جمع کر کے اور انھیں کوٹ کر دوائیاں بنانے میں مصروف رہتے تھے۔ میاں کلے کے محمد شاہ حکیم، معیار کے گنڈھیری حکیم، صاحبزادہ امیر اجان (اوچ)، بیبیوڑ حکیم اور ڈاکٹر ملا بھی شاہی طبیب کے طور پر دربار میں کام میں مشغول رہتے تھے۔

برش دوائی

نواب کی پسندیدہ دوا ''برش'' کے لئے اجزاء بڑی مشکل سے اکٹھی کی جاتی تھیں۔ مردمی قوت کیلئے جرمن کیپسول، یاقوت اور زمرد کے علاوہ اعلیٰ قسم کی زعفران ایران سے منگوائی جاتی تھیں۔ کوہستان کی پہاڑیوں میں حکیموں کے شاگرد نادر و نایاب جڑی بوٹیاں تلاش کر کے پہنچاتے۔ دواء تیار کرنے میں بہت محنت کی جاتی تھی۔ سید باؤ جان نامی ترکھان کئی تولہ سونا رگڑ رگڑ کر اسے ذرات میں تبدیل کرتا اور بزرگ اعظم نامی حکیم اس کو کشتے میں ملاتا۔

چرس کا پانی بھی دوا کا اہم جز ہوتا تھا۔ مہتران چترال جوتے کے تلوے کے برابر چرس کے موٹے تختے بھیجا کرتے۔ حکیم ان تختوں کو ہانڈی میں چڑھا کر دودھ میں ابالتے تھے۔ پھر باریک کپڑے سے چھان کر اس دودھ سے دہی تیار کیا جاتا۔ تیسرے مرحلے میں مکھن نکال کر دوائی کا حصہ بنایا جاتا۔ اس سے بھی مشکل کام بیل کو ذبح کر کے اس کے اعضائے مخصوصہ کو دھوپ میں رکھا جاتا۔ سوکھنے پر انھیں رگڑ رگڑ کر ذرات میں تبدیل کیا جاتا اور یوں یہ بھی اس دوائی کا حصہ بن جاتے۔ ''مشک'' جو ایک جانور کی ناف میں پایا جاتا ہے جسے پشتو میں ''رامبوئی غوٹہ'' کہتے ہیں۔ لمبی چلانگ لگانے والے اس جانور کو افغانستان کے سنگلاخ پہاڑوں میں شکار کیا جاتا۔ نواب اسے چاقو سے کاٹ کر یا پھر برش دوائی کے ساتھ کھاتا تھا۔ حکیم چار سیر دوائی تیار کر کے ایک صندوق میں محفوظ کر کے رکھتے۔ یہ دوا کھانے کے بعد نواب گڑ ضرور کھاتا جو اشتنگر سے لایا جاتا جبکہ مکئی کے بھٹے بھی کھاتا۔

لوگوں کا خیال تھا کہ مدہوش رہتے ہوئے نواب نے نہ تو آزادانہ میل ملاپ رکھا اور سہ پہر کو چار بج جاتے تو خواہ کتنا ہی بڑا مہمان آجاتا اسے نواب سے ملنے کیلئے صبح تک انتظار کرنا پڑتا تھا۔ ریاست میں شاہی مہمان آتے تو انھیں تحفے میں یہ دوائیاں دی جاتیں۔

نواب گیا تو اس کے کشتوں اور مقویات کے فارمولے بھی گویا دفن ہو گئے۔ نواب کا پوتا سلیم خان بھی طب میں دلچسپی رکھتا تھا۔ اس نے برش دوائی کو تیار کرنے کیلئے ایک سو بتیس اجزاء کی ایک لسٹ تیار کی، کئی اجزاء کو جمع کیا مگر مشکل کام سمجھ کر دوائی کو تیار کرنے کا کام ترک کر دیا۔

چرس، معجون، نسوار اور شراب

پختونوں کا روایتی نشہ ''نسوار'' اس کیلئے ''بڈہ'' گاؤں میں تیار ہوتا۔ چاڑا نامی ملازم اور حوالدار شمس اللہ وغیرہ اعلیٰ قسم کی نسوار کی تیاری پر مامور تھے۔ نواب نوجوانی میں میاں کلے کا مشہور معجون استعمال کرتا تھا۔ مصنف ریاض الحسن کے مطابق نواب بہت شراب پیتا تھا۔ نواب نے ایک افسر سے کہا تھا'' میں نے شراب پینا اس وقت ترک کیا جب ایک انگریز کے ساتھ بیٹھ کر شراب پیتے ہوئے اس کے گلاس کو اپنا گلاس سمجھ کر پی لیا''۔

نواب کے رعب اور تیز جاسوسی نظام کی وجہ سے دوسری کہانیوں کی طرح نشے کی کہانی بھی دیر محل کے زندان کا قیدی بنی۔ دوران تحقیق پتہ چلا کہ نواب جاڑے میں چرس ''سٹہ'' پیتا تھا۔ موسم سرما میں بارش برستی تو شیر حسن المعروف بہ مشکار ماما کے والد میر حسن سے کہتا'' لگ ایسا رشہ دم بہ اولگو'' تھوڑی دیر رک جاؤ دم لگا لینگے۔ دونوں بیٹھ کر ڈوڈو نیا'' غوڑا سکے'' کے انگاروں پر چرس ڈال کر چیلم (نچہ) کی مدد سے پیتے تھے

مفتاح الدین نامی ایک شخص ریاست میں چرس کا خفیہ کاروبار کرتا تھا۔ نواب کے حکم سے اس پر چار ہزار روپے جرمانہ لگایا گیا وہ فرار ہو کر لاہور میں مقیم ہو گیا۔ نواب کو لاہور میں نظر بند کیا گیا تو نواب نے اسے ڈھونڈ نکالا اور اس نے نواب کو چرس پہنچانا شروع کیا۔ حراست کے دوران چرس پینے میں اس کا ہم نشین شاہ وزیر مرزا تھا۔

بیماریاں

نواب کو کئی نشوں کی لت لگی ہوئی تھی مگر وہ ہر دم صحتمند ہونے کا تاثر دیتا تھا۔ چھتیس سال کے اقتدار کے دوران وہ لمبے عرصے تک بستر پر دراز نہ ہوا اور چابکدستی سے ریاستی امور کو سنبھالے رکھا۔ جزام شاہی خاندان کی موروثی بیماری تھی جس سے نواب کے والد اور دادا کم عمری میں لقمہ اجل بن گئے تھے ۔اس مرض سے بچنے کیلئے نواب نے 1925ء میں دہلی سے واپسی پر جزام کا علاج شروع کیا۔ لاہور میں سلزر نامی ایک انگلش ڈینٹسٹ سے دانتوں کا معائنہ کروایا۔ جس نے نواب کو بیماری سے بچنے کیلئے سارے دانت نکلوانے کا مشورہ دیا۔ خیبر بازار پشاور میں ''کیمفر ڈینٹیل کلینک'' میں کرسٹن نامی انگریز نے اس کیلئے سونے کے مصنوعی دانت بنائے۔ یوں بروقت علاج کروا کے وہ جزام سے محفوظ رہا۔

دوران اقتدار اس نے کئی بیماریوں کو راز میں رکھا جب لاہور پہنچا تو پتہ چلا اسے بلڈ پریشر ،شوگر، بواسیر جیسی بیماریاں لاحق تھیں۔ اس کے پاؤں میں کیل نکل آتے تھے۔ نظر بندی کے دوران کئی بار دل کا دورہ بھی پڑا۔ مندرجہ بالا شکایات کے باوجود اکہتر سالہ نواب کو کبھی بھی لاٹھی کا سہارا لینا نہ پڑا اور آخری دم تک حافظہ سمیت سارے قواء ٹھیک رہے۔

عیش پرستی

موسیقی سے لگاؤ

نواب رنگ و آہنگ کی محفلیں سجانے کا بھی دلدادہ تھا۔ اس نے باقاعدہ موسیقاروں ،گلوگاروں اور فنکاروں کی ایک انجمن بنا رکھی تھی۔ ہارمونیم سیکھنے کیلئے پنجاب کے ایک ماہر کے علاوہ ماسٹر نواب علی کو بھی باہر سے بلوایا تھا۔ ان لوگوں سے موسیقی سیکھی اور پھر خود ہارمونیم بجا کر محفل میں نغمہ سرا ہوتا رہا۔ اس کے ہاں رباب، طبلہ اور ستار بجانے والوں کا ایک ٹولہ تھا۔

رباب اور ستار بجانے والوں میں نوشہرہ کا باؤرے کا کا، جبلوک گاؤں کا گل ولی کا کا، گاؤں بانڈئی کا جمالدار استاذ، فقیر جمالدار اور کامبٹ کا نوجوان پیر استاذ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ بروال کا آدم خان ماما پچیس سال تک دربار میں موسیقی سے وابستہ رہا۔ ان میں بعض لوگ بہت خوش آواز بھی تھے ۔نہا گدرہ کا ملک شیر عظیم کہتا ہے کہ ''نواب باجہ بجاتا اور میں ڈھول، جب وہ تھک جاتا تو مجھ سے کہتا کہ ''لاؤ مجھے ڈھول دو'' اور اسی طرح میں باجہ بجاتا نواب ڈھول اور باقی سازندے دوسرے ساز بجا کر موسیقی کا ایک سماں باندھ دیتے تھے۔ محل گونج اٹھتا تھا مگر یہ آواز باہر نہیں سنی جاتی تھی۔

شاہی رقاصائیں (ڈمے)

خلوت میں رقاصائیں ناچ گا کر نواب کا دل بہلاتی تھیں۔ شمندروزہ اور امتولئی نامی رقاصاؤں کو باقاعدہ اناج (نیم سیرے) دیا جاتا تھا۔ ان حسیناؤں نے اپنی آواز، پائل کی جھنکار اور ناز نخرے سے کئی سالوں تک حکمران کو مدہوش کئے رکھا۔ ان کے چند گیت جو اس زمانے می زبان زدہ خاص وعام تھے مثلاً،

خانہ رازہ رازہ وڑو کیہ پہ دیدن موڑ شہ چہ مخ بیا در واڑومہ

ماہِ تابان اور بادشاہی لعل موضع نہا گدرہ کی دو حسین بہنیں تھیں۔ یہ دیر سے سوات جا کر رقص وسرود کی محفلیں سجا کر پیسے کماتی تھیں۔ یہ والی سوات کی محفل میں بھی جلوے دکھاتیں۔ جب نواب کو معلوم ہوا تو اس نے کارندے بھیجے۔ یہ لوگ محفل کے بہانے ان حسیناؤں کو اغواء کر کے مشرقی پہاڑوں میں سے گزار کر دیر لے آئے۔ اس طرح ایک عرصے تک یہ نواب کی محفل کی زینت بنتی رہیں۔ آزاد زندگی کی عادی محل کی چار دیواری میں قید ہو کر رہ گئیں۔

ان میں سے ایک کو محل کے ملازم محمد کریم سے عشق ہو گیا۔ جس کے ساتھ وہ محل سے فرار ہو گئی نواب اس پر سخت برافگیختہ ہوا اور تعاقب میں سپاہی دوڑائے مگر وہ دونوں برفیلے پہاڑوں سے ہوتے ہوئے چترال فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد محمد کریم کے والد پر دباؤ بڑھا تو کریم کا بھائی ان کے تعاقب میں چترال گیا اور حسینہ کو گولی ماردی۔

حکمران کی دلچسپی اور توجہ سے فن موسیقی اپنے عروج کو پہنچا۔ سازندوں اور گلوکاروں نے کئی لوک گیت، ٹپے اور چار بیتے تخلیق کئے۔ جب حکمران گرفتار ہوا تو یہ لوگ محل سے چلے گئے۔ بدقسمتی سے ایسے لوگوں کی شاعری اور تخلیق بھی ہمیشہ ہمیشہ کیلئے دفن ہو گئی۔

حقیقت حال

۱۔ اللہ بخش یوسفی لکھتے ہیں کہ حکمران عیش و نشاط کی زندگی بسر کرتا تھا نواب کے محل میں لاتعداد بیگمات تھیں ۲۔ مصنف ریاض الحسن لکھتے ہیں حکمران دیر خواہشات نفسانی کا حد درجہ شیدائی اور شراب و کباب اور عیاشی میں بابر اور جہانگیر سے بھی بہت آگے تھا۔ عورتوں میں چار کی حد کا خیال نہیں رکھتا تھا۔ بہت وسیع المشرب تھا۔

۳۔ ایرانی سیاح محمود دانشور لکھتے ہیں ''ریاست میں رہنے والے یہ کہتے ہیں کہ نواب صاحب کی حرم سرا میں چھ بیویاں ہیں اور دو سو کنیزیں جو ریاست کے مختلف حصوں سے حسن و جمال کی تلاش کے سلسلے میں جمع کی گئیں تھیں۔ ان کنیزوں میں کچھ مر گئیں، کچھ بوڑھی ہو گئیں اور کچھ بیمار، لیکن دو صد کنیزوں کی تعداد میں کمی کبھی نہیں آئی''۔

۱۔ یوسفزئی پٹھان صفحہ ۳۶۵ ۲۔ داستان دیر ۶۰ ۳۔ بسوئے کافرستان ۵۸

سلطان روم لکھتے ہیں'' کہ والی کے بنگلے پر رقاصائیں آکر ناچتی گاتی تھیں۔ والی نے ایک رقاصہ سے شادی بھی کی''۔ مگر فرق یہ تھا کہ رقاصائیں ناچ گا کر آزاد تھیں جبکہ نواب شاہ جہان اور مہتر چترال مظفر الملک کے حرم سراؤں میں موجود دوشیزائیں اپنے آقا کو خوش کرنے کیلئے قید و بند کی زندگی گزارنے پر مجبور تھیں۔

انتظامیہ میں اگرچہ کھرے اور ایماندار لوگ بھی تھے لیکن ایک ٹولہ دلالی کر کے دوشیزاؤں کو مختلف حیلوں بہانوں سے پھنسا کر حرم سرا میں پہنچاتا۔ مشہور ہے کہ یہ افسر گھروں کے اندرونی حالات کچھ اس انداز اور رمز و کنایہ میں بیان کرتے "صاحب د فلانکی په کور کی منڅه زیڑه شوی ده" صاحب فلاں شخص کے گھر میں سیب پک گیا ہے"۔ غیرت مند قوم سے عیاشی کو چھپانے کے علاوہ محل تک لڑکیاں طرح طرح کے حربوں سے لائی جاتی تھیں۔ جس میں ایک یہ بھی تھا کہ اپنے کارندے کو سمجھا کر اسے کسی دوشیزہ کے پیچھے لگایا جاتا وہ اسے عشق و محبت کے جال میں پھنسالیتا جس میں دلال عورتیں اہم کردار ادا کرتیں۔ اغواء کرنے والے کارندے کو حکومت کی سرپرستی حاصل ہوتی اور حسینہ کو حکام پکڑ کر امان دینے کے بہانے محل میں پہنچادیتے تھے

ایسی جوان لڑکیاں "کنڈ و دربار" جو ذاتی محل کے متصل تھا، میں ٹھہرائی جاتیں۔ بزرگ بتاتے ہیں کہ مسلح سپاہیوں کے پہرے میں صبح سویرے ایک لمبی قطار بنائے یہ دوشیزائیں طالبانو نامی چشمہ سے پانی بھر کر لاتیں۔ کبھی کبھار انھیں پہاڑوں پر لکڑیاں جمع کرتے ہوئے دیکھا جاتا۔ پاک فوج کی چڑھائی کے بعد ان خادماؤں کو آزادی ملی، بعض اپنے گھر چلی گئیں اور جن کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا وہ ریاست کے بااثر خاندانوں میں محنت مزدوری کرنے لگیں۔ یوں جبر، تاریکی اور ظلمتوں کا ایک اور قصہ، قصہ پارینہ بن گیا۔

ایک دکھ بھری کہانی

1951ء میں ایران کا سیاح دیر آیا اور چترال جاتے ہوئے اس نے ایک سفرنامہ تحریر کیا۔ اتفاقاً اسے لواری کی طرف جاتے ہوئے کنڈ و دربار کی ایک لڑکی ملی جس کی کہانی بعد میں سفرنامے کا حصہ بنی۔ کہانی کچھ یوں ہے۔ ایرانی سیاح لکھتا ہے [1] کہ "سہ پہر کے وقت نواب سے ملاقات کر کے میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ دیر سے نکل کر چترال سڑک پر جارہا تھا۔ راستے میں ہمیں ایک جھونپڑی نظر آئی۔ ہم کیا دیکھتے ہیں کہ ایک سفید رنگ کی عورت مٹکا لئے باہر نکلی ہمیں دیکھ کر وہ زیادہ متوجہ نہ ہوئی۔ اس عورت کی عمر کوئی بتیس کے لگ بھگ لیکن آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اور گورے جسم کی بوسیدگی سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی عمر سے پہلے بوڑھی ہو چکی تھی۔

---

[1] صفحہ ۵۶ بسوئے کافرستان

میں نے اپنے دوستوں سے اصرار کیا کہ کیا آپ لوگ اس عورت کو مجبور نہیں کر سکتے کہ وہ کچھ دیر کیلئے ہمیں مہمان ٹھہرائے۔ میرے دوست نے ان سے پشتو زبان میں بات کی۔ اس عورت کی آنکھوں کی چمک اور بھی تیز ہوگئی۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ اس پر غیر معمولی بوجھ ڈال دیا گیا ہے۔ انتہائی اصرار کے بعد وہ اپنی داستان بیان کرنے لگی تو ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں سے اپنے بچے کی طرف دیکھا جو باہر سڑک پر ننگا کھیل رہا تھا۔ وہ عورت اپنی کہانی کچھ یوں بیان کرتی ہے۔

''میں ایک عورت ہوں، ایک عورت تھی دوسری عورتوں کی طرح ایک عورت۔ بچپن سے ابھی باہر قدم نہیں رکھا تھا کہ مجھ پر ایک ایسی مصیبت نازل ہوئی جو آج تک میرے ایام پر چھائی ہوئی ہے اور میں کسی حال میں بھی اب دوبارہ عورتوں کی سی زندگی بسر نہیں کر سکتی۔

یہ میرا بچہ میری زندگی کا سہارا ہے لیکن یہ سہارا ابھی کس قدر کمزور ہے۔ مجھے اس دنیا میں سب بھیڑیئے ہی بھیڑیئے نظر آتے ہیں۔ مجھے کسی کی نگاہوں میں رحم و کرم اور انسانیت کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی بلکہ یہاں سب ڈاکو، رہزن اور چور ہیں جو اجلے اجلے کپڑے پہن کر ہر جگہ ڈاکے ڈالتے ہیں اور شریف لڑکیوں کی عصمت سرراہ لوٹ لیتے ہیں۔

میری عمر کے ابھی تیرہ برس پورے نہیں ہوئے تھے کہ میرے باپ کو لالچ نے آ کر گھیر لیا، وہ بیچا رہ غریب تھا کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ دو وقت کی روٹی بھی نصیب نہیں ہوتی تھی۔ میری ماں ہر وقت کڑھتی رہتی تھی۔ افلاس کی وجہ سے ہمارے گھر میں کبھی اجالا نہیں ہوا تھا۔ ہمارے گھر کی دیواروں نے کبھی بلند قہقہے نہیں سنے تھے۔ آخر کار وہ تنگ آ گیا اس نے اپنے سینے پر پتھر رکھ کر ایسا فیصلہ کیا جو میری تباہی اور اس کی خودکشی کا باعث بنا۔ ہمارے شہر کے ایک بہت بڑے آدمی کو ایک چھوٹی عمر کی لڑکی کی ضرورت محسوس ہوئی۔

میرے باپ نے اپنی تمام مجبوریوں کو سامنے رکھتے ہوئے مجھے اس بڑے آدمی کے سامنے پیش کر دیا۔ میں عرض کر چکی ہوں کہ میری عمر اس وقت تیرہ برس تھی میرا جسم ابھی پختہ نہیں ہوا تھا۔ میرے خیالات کا آپ اندازہ کر ہی سکتے ہیں گھر میں کھلونوں سے کھیلتی ہوئی بڑے آدمی کے حضور میں پیش کر دی گئی۔ میں آج محسوس کرتی ہوں کہ میں اس وقت بڑی حیران تھی کہ مجھے یہ لوگ بڑے مکان میں کیوں لے جا رہے ہیں۔ میرا باپ، میری ماں دونوں میرے ساتھ تھے۔ میرے باپ کی نگاہیں بلند مکان کی

سفید دیواروں سے ٹکرا کر واپس آ رہی تھیں۔

اس کی حالت یہ تھی کہ جیسے ہارا ہوا قمار باز اپنی آخری بازی پر اپنا آخری سرمایہ لگانے جا رہا ہو۔ میں اس وقت بچی تھی اور اس کے دل کی حالت کا اندازہ اس وقت نہیں کر سکتی تھی آج کر رہی ہوں وہ بڑا غیرت مند انسان تھا لیکن کنبے کی چند زندگیوں کو بچانے کیلئے اس نے مجھے ایک درندے کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ مجھے اپنے باپ سے شکایت نہیں لیکن اپنی قسمت سے گلہ ضرور ہے۔ اس دنیا میں غریب ہونا سب سے بڑا گناہ ہے۔ غریبی میں انسان کیا کچھ نہیں کرتا۔ غریبی میں اگر کچھ بھی نہ کرے تو ذلیل ہو جاتا ہے اور پیسے والے دن دہاڑے ڈاکہ ڈالتے رہیں تو انھیں کوئی کچھ نہیں کہتا۔

میں اس بڑے مکان میں داخل ہوئی تو بہت گھبرا گئی۔ میں نے اپنی باپ کی انگلی پکڑ لی لیکن میرے باپ نے جھٹکا دے کر انگلی چھڑا لی۔ ''بیٹی یہ مکان تیرا ہے'' میں نہ سمجھ سکی اتنا بڑا مکان میرا کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم جیسے لوگوں کو تو پہرہ دار بھی ایسے مکان میں گھسنے نہ دینگے۔ یہ تو کسی بڑے حاکم کا مکان معلوم ہوتا ہے۔ میرا کیسے ہو سکتا ہے۔

مجھے یاد نہیں کہ اس مکان میں کتنے کمرے تھے۔ جب زندگی میں مات کھایا ہوا ہمارا مختصر سا قافلہ وہاں پہنچا تو کئی خادماؤں نے ہمارا استقبال کیا۔ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں، دوسرے سے تیسرے اور جب تیسرے سے چوتھے کمرے میں گئے تو میرا باپ مجھ سے چھوٹ چکا تھا۔ اس نے آخری بار میری طرف دیکھا میں آج تک اس کی آنکھوں کے آنسو نہیں بھول سکتی۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن نہیں کہہ سکا۔ وہ چیخ کر رونا چاہتا تھا رو نہ سکا، وہ مجھے چومنا چاہتا تھا چوم نہ سکا، اس کا ہاتھ تھوڑا سا بلند ہوا اور اس کے بعد دروازہ بند ہو گیا۔

میری ماں میرے ساتھ تھی مجھے تسلی تھی لیکن میں خوف سے کانپ رہی تھی۔ اتنا بڑا مکان اتنا ساز و مان، کیا اس میں انسان رہتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد کیا دیکھتی ہوں کہ چند عورتیں ہمارے کمرے میں آئیں۔ میرے لئے فاخرہ لباس لائے گئے۔ میں ان کپڑوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ میرا بچپن موٹے اور کثیف کپڑوں میں گزرا تھا چمکیلے اور ریشمی کپڑوں کو دیکھ کر میں خوب مسکرائی۔

پہلے مجھے غسلخانے میں لے جا کر خوب نہلایا گیا اس کے بعد مجھے وہ لباس پہنایا گیا۔ دو تین خادماؤں نے بڑی اچھی طرح میری کنگھی پٹی کی میرے جسم اور سر میں خوشبوئیں بسائی گئیں۔ میں حیران

تھی کہ میری اس قدر خاطر کیوں کی جارہی ہے، کیا میں دلہن بننے والی ہوں، مجھے کیا پتہ تھا کہ مجھے قربانی کیلئے پیش کیا جارہا ہے۔ مجھے ایک بت کے سامنے ذبح کیا جائیگا۔

مجھے اس بات کا احساس تک نہیں تھا میں اس ریشمی لباس کو دیکھ کر پھولی نہیں سماتی تھی اور میری ماں بالکل خاموش تھی۔ اس پر موت کی خاموشی طاری تھی۔ میں حیران تھی وہ میرے کپڑے دیکھ خوش نہیں ہوتی۔ وہ میری بلائیں کیوں نہیں لیتی۔ کیا وہ حسد میں جل رہی ہے۔ میں بالکل دلہن سی بن گئی۔ اس کے بعد مجھے یاد نہیں کہ کتنی دیر بعد ایک بہت مکروہ صورت، تنومند، بھاری بھرکم، درندہ صفت آدمی اندر آیا سب کنیزوں نے جھک کر سلام کیا اور وہ موٹا سا اور بے ڈول آدمی مجھے گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ مجھے اس شخص کو دیکھتے ہی نفرت سی پیدا ہوگئی۔ لیکن وہ ریچھ کی طرح دانت نکال کر میری طرف دیکھ رہا تھا۔

میں سہم گئی، کانپنے لگی کیونکہ مجھے معلوم ہوگیا کہ یہاں اسی ''بڑے آدمی'' کا حکم چلتا ہے۔ اس درندے نے اپنی کنیزوں کی طرف اشارہ کیا تو اس وقت نہایت اعلیٰ قسم کے کھانے چن دیئے گئے۔ گوشت کی ایک بھنی ہوئی ران میرے سامنے رکھ دی گئی۔ میں نے ایسی بھنی ہوئی ران نہیں دیکھی تھی میں لپک کر کھانے لگی پھر خوشبودار کباب میرے سامنے آئے۔ کئی چیزیں میرے سامنے رکھی تھیں میں حیران تھی کیاں کھاؤں کیا نہ کھاؤں۔ زندگی میں پہلی بار اتنے لذیذ کھانے میں نے دیکھے تھے۔

میری ماں کچھ نہیں کھا رہی تھی اور میں حیران تھی کہ وہ اتنے لذیذ کھانے کیوں نہیں کھاتی۔ کھانا ختم ہونے کے بعد مجھے ایک نرم سی کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ پہلے تو میں چونکی کہ شاید میں گیلے آٹے پر بیٹھ گئی ہوں میں نے نیچے ہاتھ لگایا بڑی نرم نرم جگہ تھی۔ ''بڑا آدمی'' میری یہ حرکت دیکھ کر ہنسنے لگا اور مجھے اس کی ہنسی بہت بری معلوم ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد ایک کنیز نے میری ماں کے کان میں کچھ کہا اور میری ماں باہر چلی گئی میں اپنی ماں کے ساتھ باہر جانے لگی تو کنیزوں نے مجھے روک لیا۔ اس وقت مجھ پر ایک عجیب و غریب خوف طاری ہوگیا۔ میرے سارے جسم میں ایک لرزہ پیدا ہو چکا تھا میں حیران تھی کہ یہ بڑا آدمی کیوں مجھے اس قدر کھلا پلا رہا ہے۔

تھوڑی دیر بعد کیا دیکھتی ہوں کہ کنیزیں بوتلوں میں بند سرخ سا پانی لے آئیں اور مجھے پینے کو کہا میں نے سمجھا شاید یہ شربت ہے۔ جلدی جلدی کئی گھونٹ پی گئی لیکن وہ تلخ شربت تھا۔ شربت پینے کے بعد مجھے کوئی ہوش نہیں رہا۔ جب میں ہوش میں آئی تو میں نے محسوس کیا کہ میرا تمام جسم

انگارے جل رہے ہیں۔ میں نڈھال پڑی ہوئی تھی اور میں نے یہ بھی دیکھا کہ کہ دو کنیزیں میرا وہ لباس باہر لے جارہی تھیں جو میں نے پہلے پہنا ہوا تھا معلوم نہیں وہ خون آلود کیوں تھا۔ بے ہوشی میں مجھے دوسرا لباس پہنا دیا گیا تھا۔

اس روز کے بعد میں اس بڑے مکان میں رہنے لگی۔ مجھے ایک کنیز نے بتایا کہ تمھارے باپ کو زمین کا ایک ٹکڑا مل گیا ہے اور تمہارا باپ بڑا خوشحال ہو گیا ہے مجھے اپنے باپ سے نفرت ہو گئی۔ میں نے کنیز سے کہا'' میرے سامنے میرے باپ کا ذکر نہ کرو''۔ میں کوئی دو برس اس جنت نما جہنم میں رہی ۔آخر بڑے آدمی کو اس بات کا علم ہو گیا کہ میں ایک بچے کی ماں بننے والی ہوں تو مجھے وہاں سے نکال دیا گیا اور ایک گنوار آدمی سے میرا نکاح کر دیا گیا۔

ہم اس جھونپڑی میں آکر رہنے لگے وہ بچہ اسی بڑے آدمی کی نشانی ہے میں اس بچے کو پال رہی ہوں، میرا نیا خاوند مجھے ہر روز طعنے دیا کرتا تھا میں تنگ آگئی ہر روز رونے دھونے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا آخر کار وہ شخص بھی مجھے چھوڑ گیا۔ اور اب میں ہوں اور یہ بچہ جو ایک بہت بڑے آدمی کی نشانی ہے میں محنت کرتی ہوں اور اس بچے کو کھلاتی ہوں۔

ہاں! میں یہ کہنا تو بھول ہی گئی کہ میرا باپ زیادہ دیر تک زندہ نہ رہ سکا اس نے خودکشی کر لی اسے خودکشی کر لینی چاہیے تھی۔ آپ میری کہانی سن کر بہت محفوظ ہوئے ہونگے۔ آج میں یہ کہانی ان لوگوں کو سناتی ہوں جو مہذب ہیں اور زندگی میں بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں۔ جو انسانیت کے نام پر اس مہذب دنیا کا نام روشن کرتے ہیں۔ بہت کم لوگ ہیں جو میری اس کہانی سے واقف ہیں لیکن میں نے آپ کو اپنی داستان سنا دی مجھے آپ کی ہمدردی کی ضرورت نہیں میں ایک بڑے آدمی کی بیوی ہوں اس کے بعد وہ مسکرائی اور پھر مٹی کا مٹکا لے کر چشمے سے پانی لینے کیلئے چلی گئی۔

یہ کتاب شائع ہوئی تو خبر پاتے ہی نواب نے درباریوں سے کتاب کے متعلق رائے طلب کی۔ جس میں مارکیٹ سے ساری کتابیں خریدنے کا فیصلہ کیا گیا۔ مصنف نے کتاب دوبارہ شائع کی تو پولیٹیکل ایجنٹ کی وساطت سے کتاب بند کروادی۔ یہ کتاب بہت نایاب ہے۔ یاد رہے کہ ایرانی سیاح نے جس ہوٹل میں رات کو قیام کیا یہ ہوٹل سید باؤ جان نامی تاجر کا تھا جسے نواب کے حکم پر سرکاری تحویل میں لے لیا گیا۔

نواب اور پختون ولی

غیرت اور ناموس کے نام پر اس نے سختی سے ستر اور پردے کا اہتمام کیا۔لیکن مقصد ذاتی زندگی اور محل کے رازوں کو خفیہ رکھنا تھا۔خود کو غیرتمند اور کٹر پختون ظاہر کرنے کیلئے رشتہ داروں سے قطع تعلق کیا۔نزدیکی رشتہ داروں کے ہاں بھی شادی بیاہ کے موقع پر صرف جمالدار کپڑوں کا جوڑا لے کر جاتا۔خود بیگمات کی رہائش سے الگ محل کے بیرونی حصے میں رہتا تھا۔حکمران نے ذاتی محل میں جو نوکر رکھا تھا وہ گونگا (چاڑا) تھا۔یوں محل کو سیل رکھنے، رشتہ داروں کے آنے جانے پر پابندی اور گونگے کو رکھنے کی وجہ سے ذاتی زندگی رعایا کی نظروں سے اوجھل رہی۔

نواب اسلامی نظام شریعت اور عدالت کا دعویدار تھا اور اس کا تعلق بھی ایک مذہبی گھرانے سے تھا۔دیر کے لوگ غیرت منداور اسلام پسند تھے۔لہذا حکمران کیلئے لازمی تھا کہ وہ اپنی عیش پرستانہ زندگی کو رعایا سے اوجھل رکھے۔محل کے راز طشت از بام ہونے کے ڈر سے اس نے اپنے گھر والوں کا کہیں آنا جانا بند کر دیا تھا۔اس نے قریبی رشتہ داروں کے محل کے اندر جانے پر بھی پابندی لگا رکھی تھی۔بیگمات کو چوکھٹ سے باہر قدم رکھنے کی اجازت نہ تھی نہ وہ کبھی میکے جا سکیں اور نہ ہی ان سے کوئی ملنے آ سکا۔طرفہ تماشہ تو تھا یہ کہ نواب کی پانچ بیٹیاں بیاہی گئیں لیکن کوئی بھی واپس محل نہیں آ سکی۔

اس کا نعرہ پختون ولی کا تھا مگر اس کے اپنائے ہوئے پردے کے انداز پختو روایات سے بہت مختلف تھے۔وہ گھر میں مرغا نہیں رکھتا تھا۔ایک دفعہ چھوٹا محمد شاہ خان دوڑ کر آیا کہ بی بیاں کہتی ہیں کہ ہم قربانی کے دنبے دیکھنا چاہتیں ہیں اس نے بیٹے کو ڈانٹا اور کہا کہ جا کر کہو کہ آئندہ ایسی فرمائش نہ کریں۔ ایک دفعہ نواسی (محمد شاہ خسرو کی بیٹی) بیمار تھی۔ڈاکٹر معائنہ کیلئے ڈیوڑھی تک آیا۔مگر جمعدار کو اس وجہ سے نوکری سے ہٹا دیا گیا کہ بچی کا خوب پردہ کیوں نہیں کیا گیا تھا۔

اس کے متعلق ایک کہاوت مشہور ہے کہ ''دنواب دبی بی جاپلو نہ دولید لے'' (نواب کی بی بی کا کسی نے پلو بھی نہیں دیکھا تھا)۔جس خاتون نے دلہن بن کر محل کی چوکھٹ پر قدم رکھا وہ سفید کفن پہن کر ہی باہر نکلی۔محل کے اندر گمنامی کی زندگی گزارتے ہوئے جو بھی بیگم وفات پاتی تو علی الصبح بغیر منادی کے دفنا دی جاتی۔یوں رشتہ دار میت کے دیدار سے بھی محروم رہتے۔

محل میں داخلہ کتنا مشکل امر تھا یہ اندازہ اس مشہور واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے۔ مردان کے نواب اکبر خان ہوتی نے بیٹے کیلئے نواب کی بیٹی کا رشتہ مانگا۔ کچھ عرصہ بعد جب بارات دیر آئی تو نواب حیا سیر ئی چلا گیا۔ سارے مہمانوں کا انتظام باہر کیا گیا تھا جب عورتیں محل کی جانب بڑھنے لگیں تو افسروں نے صدر دروازے پر روک لیا اور کہا کہ نواب کا حکم ہے کہ کسی کو محل کے اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ باراتی سخت پریشان ہوئے اور ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ نواب کو ٹیلیفون پر اطلاع دی گئی لیکن اس نے پھر وہی الفاظ دہرائے کہ مہمانوں کی خوب خاطر تواضع کی جائے مگر کسی بھی عورت کو محل کے اندر نہ جانے دیا جائے۔ پھر ایسا ہی ہوا محل میں داخل ہوئے بغیر ہی باراتی ڈولی لے کر چل پڑے۔

الغرض اپنی گھناؤنی حرکتوں کو قوم سے چھپائے رکھنے کیلئے بیگمات کو عمر بھر نظر بند رکھا۔ بیگمات پر جو ظلم وستم ہوا وہ شاید رعایا کے ظلم وستم سے کسی طرح کم نہ تھا۔ نواب نے آٹھ شادیاں کیں۔ محل کے اندر محصوران عورتوں کو ازدواجی حقوق ملتے تھے یا نہیں۔ مہر کی ادائیگی اور جاگیر میں ان کا حصہ بھی سوالیہ نشان ہے۔

مذہبی زندگی

مصنف ریاض الحسن لکھتے ہیں۔ ''نواب شاہ جہان دین سے محروم تھا۔ حقیقت میں کسی کو معلوم نہ تھا کہ اللہ کی ذات کا قائل تھا یا منکر۔ بظاہر شاید کلمہ طیبہ بوقت ضرورت پڑھ لیتا ہوگا۔ مگر نماز، روزہ، حج اور زکواۃ کسی ایک پر بھی عمل پیرا نہ تھا۔ روز قیامت کا بھی شاید منکر تھا''۔ نزدیکی افسران نے کبھی صوم وصلواۃ بشمول آدائیگی جمعہ وعیدین کی گواہی نہیں دی۔ خیرات وزکواۃ، یتیم خانہ اور بیت المال کا نظام بھی قائم نہ تھا۔ 1640ء میں شاہی خاندان کے جد اعلیٰ اخون الیاس حج کیلئے گئے اس کے بعد یہ خاندان دنیاداری اور حکمرانی کی بھول بھلیوں میں ایسا کھویا کہ کسی حکمران کو حج کرنے کی سعادت حاصل نہیں ہوئی۔ نواب شاہ جہان کا دادا خان محمد شریف خان اور نواب اورنگریب باقاعدگی سے نماز پڑھتے، خیرات وزکواۃ دیتے حتی کہ نواب اول اعتکاف میں بھی بیٹھتے تھے۔ اخون الیاس کے بعد عالمزیب خان اس خاندان کا پہلا شخص تھا جس نے 1929ء میں حج کی سعادت حاصل کی۔ نواب شاہ جہان، اس کے بیٹوں اور نواسوں کو بھی حج کی سعادت حاصل نہیں ہوئی۔

---

۱ داستان دیر صفحہ ۶۰

حکمران سوات میاں گل عبدالودود المعروف بہ بادشاہ صاحب اپنی سوانح عمری میں لکھتے ہیں ۔کہ ''میں گیارہ سال کی عمر میں چار سال خلوت میں مصروف عبادت رہا۔ پھر گیارہ سال کے بعد چچازاد بھائیوں سے اقتدار کی کشمکش کی وجہ سے نمازیں قضاء ہوتی رہیں ۔میرے ہاتھوں دو چچازاد بھائی بھی قتل ہوئے ۔بائیس سال کی عمر میں مجھے ایک مرض لاحق ہوا۔ میں نے دوبارہ نماز پڑھنی شروع کی اور چھتر سال کی عمر میں مجھ سے نہ سفر میں اور نہ حضر میں کبھی نماز قضاء ہوئی اس کے ساتھ تہجد پڑھنے کے علاوہ گیارہ سال تک میں قضاء نمازیں بھی ادا کرتا رہا۔

اس طرح میاں عبدالودود کے بیٹے والی سوات جمعہ اور عید کی نماز سیدو بابا کے مسجد میں پڑھتا تھا۔ باقی نمازیں وہ گھر پر پڑھتا تھا 1974ء میں والی نے حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی ۔اس نے بیٹے عالم زیب خان کو قران کریم حفظ کروایا۔ 1941ء کو سوات میں سیدو بابا کی تاریخی یادگار مسجد بنائی گئی۔ 1963ء میں مینگورہ اور چارباغ میں اسلامی دارالعلوم بنائے گئے ۔1966ء میں تاریخی ''اللہ اکبر'' مسجد بنائی گئی۔

شکار کا شغل

شکار

شکار نواب کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ شکاری لوگ ''مشکار'' یا ''بازوان'' کہلاتے تھے۔ نواب موسم سرما میں درجنوں مشکاروں کو لئے پھرتا جن میں ہر ایک کی تنخواہ حوالدار کے برابر تھی۔ مشر جمالدار شہزادہ سمیت اکثر کا تعلق براول سے تھا۔ کئی ایک کو چترال اور بدخشان سے بھی بلوایا گیا تھا۔ محمد عمر اور چپہ تاڑے نامی مشکار شاہی بازوں کو شکار کے گر سکھاتے۔ نواب تیمر گرہ آتا تو کئی جگہ بازاروں میں مشکار بازوؤں پر باز بٹھائے نظر آتے۔

نواب کے خاص شکاری پرندوں کے نام ''کٹاباز'' اور ''جُراباز'' تھے۔ ایک سفید باز کا نام ''تیغون'' تھا۔ عقاب ''سرخ'' کے علاوہ شنداور بیرئی بھی پالے ہوئے تھے۔ بیرئی نامی پرندہ جو مرغابی شکار کرنے کیلئے مشہور ہے پنجاب سے منگوایا تھا۔ کٹا، جرا، تیغون، عقاب کے علاوہ چھ شومقار، پانچ شند، آٹھ بیرئی سمیت کئی درجن پرندے شکار میلے میں شریک ہوتے تھے۔ محل کے سامنے مشکاروں اور پرندوں کا الگ مکان تھا جو باز خانہ کے نام سے مشہور تھا۔

شکاری کتے

پالتوں کتوں کی اصل تعداد نامعلوم تھی کیونکہ تعداد بڑھنے پر یہ انگریزوں، پڑوسی حکمران اور قبائلی سرداروں کو تحفے میں بھیجے جاتے۔ اللہ بخش یوسفی لکھتے ہیں [1] کہ ''نواب نے سینکڑوں کتے پال رکھے تھے۔ ان کتوں کیلئے کثیر تعداد میں ملازم بھرتی تھے''۔ اس کے پاس کوئی دیسی کتا نہیں تھا۔ جب اس کو ضرورت پڑتی تو ایوب جان دہلی میں واقع ایک کمپنی سے کتوں کا کوائف نامہ لے آتا۔ جس میں کتوں کی نسل، عمر اور خواص وغیرہ درج ہوتے۔ فرانس، جرمنی ورافریقی نسل کا جو بھی کتا اسے پسند آجاتا۔ تو کمپنی سمندری جہاز میں کتے منگوا کر ایوب جان کے حوالے کر دیتی۔ پھر اسے دہلی سے سمندری جہاز کے ذریعے کراچی پہنچایا جاتا اور وہاں سے جمالدار اسے دیر لے آتا تھا۔ کتوں کی قیمت اور کرائے پر بھاری رقم اٹھ جاتی۔ ایک جوڑا تقریباً تین چار ہزار میں پڑتا تھا۔ دلاور جان کے مطابق بادامی نسل کا آخری جوڑا سولہ ہزار روپے میں خریدا گیا تھا اور کراچی میں دو نوکروں کے کئی دن قیام اور کرایہ کا خرچہ الگ تھا۔

---

[1] یوسفزئی پٹھان صفحہ ۴۶۵

کتوں کی دیکھ بھال کیلئے ایک ہسپتال تھا۔ایک ماہر حیوانات المعروف بہ ڈاکٹر میاں (ضلع مردان سرخ ڈھیرئی) ان کے علاج پر مامور تھا۔بیمار پڑنے کی صورت میں کمپنی متعلقہ ادویات بھیجتی ۔تربیت دینے کیلئے بھیجی گئی انگریزی کتب کا بادین استاد اور میر منشی نے فارسی میں ترجمہ بھی کیا تھا۔کثیر تعداد میں پالے گئے کتوں کا الگ مکان تھا۔ان کتوں میں برگٹ، بخمل، کپتان، سارینکا مشہور تھے ایک کتیا کا نام لیلی تھا۔ایک نوکر کتوں کے ایک جوڑے کو تربیت دینے پر مامور تھا۔ان کتوں کا افسر اعلیٰ'' سپو جمالدار'' کے نام سے مشہور تھا۔

کتوں پر اصراف

کتوں کیلئے روزانہ آٹا گوندھ کر روٹیاں پکائی جاتیں۔کلال نامی قصائی بکرے ذبح کر کے گوشت شاہینوں اور کتوں کو کھلاتا۔بعض اوقات ان کیلئے سالم بیل بھی ذبح کیا جاتا۔شوربے اور دودھ میں روٹی ڈال کر ڈاکٹر میاں کی موجودگی میں کتوں کو کھلایا جاتا۔کلشو (ایک جگہ کا نام ہے) کے مقام پر بھینسیں انھیں دودھ مہیا کرنے کیلئے موجود تھیں۔سردیوں میں کتوں کو گرم رکھنے کیلئے آگ جلائی جاتی۔ سردیوں میں پلہ لین اور ململ کے کپڑے میں روئی بھر کر سبز یا سرخ رنگ کے واسکٹ بنا کر بھی پہنائے جاتے۔گرمی میں صابن سے نہلا کر تولئے سے صاف کیا جاتا۔کمپنی کی طرف سے خوبصورت زنجیر اور پٹی بھی کتے کے گلے میں ہوتی تھی۔ہر صبح کئی سپاہی دو دو کتوں کو لے جا کر دریا کی سیر کراتے تھے۔

شکار کے انتظامات

نواب ہفتے میں دو یا تین بار شکار کھیلتا۔شائی درّہ، تنگی درّہ، پیڑو درہ، رباط درّہ، میدان، ملاکنڈ درّہ، داروڑہ، براول بانڈئی، قشقاری، پل منزئی، وادی اسبڑ کے علاوہ کئی مقامات پر شکار گاہیں تھیں۔جندول کو غیر محفوظ خیال کرتے ہوئے نواب شکار کے واسطے کبھی جندول نہیں گیا۔البتہ چند دفعہ بیٹے جندول خان کے ساتھ ولئی کنڈاؤ میں شکار کھیلا۔

شکار سے ایک دن پہلے مقامی تحصیلدار بیگاریان کی مدد سے'' شکار ڈبہ'' تک راستہ بناتا۔پھر چونا لگا کر پودوں اور درختوں کی ٹہنیاں کاٹ کر کناروں پر لگاتا۔ویرانے کو ایسا سجایا جاتا کہ جیسے کوئی تقریب ہو رہی ہو۔شکار کے دن صبح چار بجے گاؤں والوں کو جگا کر مسجد میں لایا جاتا۔اندھیرا چھٹتے ہی

جمالداروں کی نگرانی میں یہ لوگ شکارگاہ کے دونوں جانب پہاڑوں سے پرندے ہانکتے۔ ''واہے واہے'' کی آواز لگا کر بیگاریان ڈنڈے لئے پتھروں اور جھاڑیوں سے پرندوں کو اڑانے کی کوشش کرتے۔ ادھر نقارچی کے اعلان پر لوگ مرغیاں اور کتے گھروں میں بند کردیتے۔ تاکہ شکار کے تعاقب میں لگا شاہین انھیں دیکھ کر بے راہ نہ ہو جائے۔ لکڑہارے اور چرواہے بھی اس دن گھر پر رہتے۔

شکار کا میلہ

جہاں تک گاڑی کا راستہ ہوتا وہاں تک نواب گاڑی میں جاتا۔ پھر ابلیق گھوڑے پر سوار، جس کی لگام کوئی وزیر یا مشیر تھامے ہوتا، شکارگاہ تک پہنچتا۔ پہلے سے موجود ڈبہ پر صوفے میں بیٹھ جاتا۔ ادھر پرندوں کے غول اوپر منڈلارہے ہوتے۔ مشکاروں کے ہاتھوں میں جکڑے شاہین اور باز چکور اور دوسرے پرندوں کو شکار کرنے کیلئے مشکار کے ہاتھوں سے نکلنے کیلئے زور لگاتے۔ نواب آسمان پر نظریں جما کر بندوق کرسی کے پاس رکھ کر با آواز بلند پکارتا۔ ''شابہ حلکہ بازراوڑہ'' (جلدی سے باز لے آؤ) ہر مشکار باری باری باز نواب کے ہاتھوں میں دیتا جو اسے پرندوں کے پیچھے چھوڑتا۔ گہما گہمی کے اس عالم میں نواب دونالی بندوق سے نشانہ لگاتا۔ مشکار نشانہ بازی میں نواب کے قائل تھے۔

آسمان پر بدحواس پرندے موت کے چنگل سے فرار کی راہ ڈھونڈتے پھرتے۔ جبکہ باز اور شاہین انھیں پنجوں میں دبوچنے میں سرگرداں رہتے۔ مشکار چلاتے، کتے بھونکتے، باز چیختے اور نواب کی بندوق کی آواز، اس سے ایک سماں بندھ جاتا۔ نشانہ ٹھیک لگنے پر نواب کا چہرہ چمک اٹھتا تھا۔

شند پرندہ غول میں گھس کر اپنے تیز پنجے چکور کے سر پر مار کر اسے نیچے گراتا۔ شکاری کتا زخمی پرندوں کو نیچے آتا دیکھ کر ان کی طرف دوڑ پڑتا اور جھاڑیوں میں تلاش کر کے منہ میں اٹھا کر نواب کے حضور پیش کرتا۔ شومقار کے ذمہ گرگس (ٹپوس) کو بھگانا ہوتا تھا جو غول میں گھس کر اپنا شکار کرتا تھا۔ پرندے کٹا اور جرا سے بھاگ نکلنے کی کوشش کرتے جبکہ یہ انھیں دبوچ کر نیچے لاکر مشکار کو پکڑا دیتے تھے۔ مشکار پرندے کا سر کاٹ کر باز کے منہ میں دیتا اور باقی پرندہ تحصیلدار کے حوالے کرتا جو اسے ایک چادر میں ڈال دیتا تھا۔

شکار میں اتنا مزہ ہوتا تھا کہ وقت کا پتہ ہی نہ چلتا۔ صبح آٹھ بجے سے شروع شکار کہیں تین بجے

ختم ہوتا۔شکاری پرندوں سے چادر بھر جاتی، کتے ہانپتے، باز اور شند بھی غول کا دور دور تک تعاقب کر کے لوٹ کر اپنے مشکاروں کے ہاتھوں پر بیٹھ جاتے۔

اتنے میں مقامی گاؤں کے ملک اور خوانین مرغ پلاؤ کے تھال سروں پر رکھ کر لے آتے ۔نواب اپنی کرسی کے پاس پڑا تھرماس اٹھاتا اور دودھ کے قہوے سے پیالہ بھر کر پینا شروع کر دیتا۔بھوک سے نڈھال سب مشکاران کھانے پر ٹوٹ پڑتے۔نواب یہ دیکھ کر کہتا۔'' بـچو آرمان به کوني ،عمر بــه مــو ډيــر وي خــو عــزت بــه مو نــه وي '' (یعنی میرے بعد لمبی عمر پاؤ گے مگر عزت نہیں رہیگی)۔اِدھر مشکار پلاؤ اڑا رہے ہوتے اُدھر بیگاریان خالی پیٹ حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بھاری قدموں سے گھروں کو چل دیتے تھے۔

طعام کھا کر نواب کرسی سے اٹھتا، پہرے دار الرٹ ہو جاتے، تحصیلدار اور مشیران حکم کی تعمیل میں سر جھکائے اس کے پیچھے پیچھے چلتے،نواب رکاب میں پاؤں رکھ کر گھوڑے پر سوار ہو جاتا۔دور سے گاؤں کے لوگ اس شان وشوکت کا تماشہ کرتے۔دارالحکومت پہنچ کر پرندوں کو صاف کیا جاتا،ان سے قبائلی عمائدین کی ضیافت کی جاتی اور باقی کو ڈبوں میں بند کر کے ملاکنڈ کی پولیٹیکل انتظامیہ کو تحفے کے طور پر بھیجا جاتا۔

گھوڑے پالنا اور بٹیر بازی

کتوں اور پرندوں کے علاوہ نواب کو گھوڑوں سے بھی شغل تھا۔ذاتی اصطبل میں موجود گھوڑے اکثر پنجاب کے میلوں میں خریدے جاتے۔جنہیں مقامی شاہسواروں کے علاوہ پنجاب سے بلایا گیا انجون نامی شخص سدھارتا۔ہر دوسرے روز ایک گاڑی جا کر ان کیلئے تخیلہ سے مکئی لاتی تھی ۔سمند،وزیرے اور پنجابی نسل کے کالے، بھورے، سبز،سفید اور بادلی رنگت کے یہ گھوڑے بہت چست و چابک اور خوشنما تھے۔

گرمیوں میں بٹیر بازی کا شغل رہتا۔نواب نے ریاست میں چکور کی طرح بٹیر کی شکار پر بھی پابندی لگا رکھی تھی۔جو تالاش کے علاقے میں بکثرت پائے جاتے تھے۔تالاش سے خان اور ملک بٹیر پکڑ کر پنجروں میں لئے دارالحکومت لے جاتے۔نواب تجزیہ کر کے مخصوص پرندے لے کر باقی پرندوں کو فضا

نواب شاہ جہاں شکار کے دوران

شہاب الدین خان کا معتمد خاص جمروز خان عرف آفسر صاحب، شکار کے دوران ملیشیا کے ساتھ

شہاب الدین خان نیزہ بازی کے دوران

میں چھوڑ دیتا۔

نواب تیمر گرہ قلعہ میں دو ماہ قیام کرتا۔ قبائلی عمائدین چادریں بچھا کر بٹیروں کی لڑائی کا تماشہ کرتے۔ نواب اور گل بادشاہ ہوٹل والا اپنے اپنے بٹیر میدان میں چھوڑتے۔ نواب کا حریف دل ہی دل میں شاہی بٹیر کی جیت کی تمنا کرتا تا کہ نواب خوش ہو جائے۔

شاہی بٹیر وار کرتا تو تماشائی والہانہ انداز میں اسے داد دیتے مگر مخالف بٹیر شاہی بٹیر کو پچھاڑتا تو اس سے نواب کے تیور بدل جاتے اور تماشائیوں پر ایک خوف سا طاری ہو جاتا اور ہر طرف خاموش چھا جاتی۔ کافی تجسس اور کانٹے دار مقابلے کے بعد اکثر شاہی بٹیر جیت جاتا کیونکہ ریاست کے عمدہ بٹیروں میں سے چناؤ کے علاوہ انھیں خوب تربیت دی جاتی تھی۔ شاہی بٹیر جیتتا تو نواب اسے لے کر سینے تک اٹھاتا اور ناز بھری نگاہوں سے اسے تھپکی دیتا۔ بٹیروں سے عمر بھر پیار رہا۔ لاہور میں جو لوگ ملاقات کیلئے جاتے تو چارپائی پر لیٹے نواب کو بٹیرا چھالتا دیکھتے۔

رعب و دبدبہ

نواب کا رعب

جنگجو اور نڈر نواب اورنگزیب کا پڑوسی حکمرانوں پر کافی رعب تھا۔ لیکن بیٹے نے رعایا کو مرعوب رکھنے، شاہانہ زندگی گزارنے اور عجیب قوانین مسلط رکھنے کیلئے حد سے زیادہ رعب جمایا۔ نواب شاہ جہان کی شخصیت اگرچہ بارعب تھی مگر اس نے ایسا ماحول بھی بنا رکھا تھا جس سے اس کی لوگوں پر دھاک بیٹھ گئی تھی۔ جیسے

اس کی مجلس میں خاموشی رہتی وہ اکثر تند خوئی سے پیش آتا تھا۔ اس نے انتظامیہ میں بڑے بارعب اور تند خو لوگ رکھے تھے۔ وہ آزادانہ طور پر رعایا سے نہیں ملتا تھا۔ اس کے باہر جانے کے موقع پر بازار بند رکھے جاتے تھے۔ باہر نکلتا تو پہرہ دار انتہائی سخت پہرہ دیتے ایسی خاموشی، تنہا پسندی اور پہرہ داری نے اس کے رعب و دبدبے میں اضافہ کر رکھا تھا۔

پہرے یا شکار کیلئے دو چار کتے رکھنے میں کوئی عار نہیں ہے۔ مگر سینکڑوں کتے پالنے میں کوئی خاص مقصد ہی کارفرما ہو سکتا ہے۔ شاید رعایا اور دربار میں آنے والوں پر رعب جمانا مقصد رہا ہو۔ کوئی خان یا ملک دربار میں داخل ہوتا تو اس کا گزر پہلے کتوں کی جھونپڑی پر سے ہوتا۔ اس کے بعد نواب کے پاس جاتا تو اس کے ذاتی پہرہ دار کتوں کو اس کے اردگرد پاتا۔

رعایا پر رعب جمانے کا یہ حربہ بھی ملاحظہ ہو۔

نواب میدان میں انگوڑی شکار کیلئے گیا تھا۔ ندی کے کنارے ایک جگہ چائے پینے بیٹھ گیا۔ قریبی گاؤں کے قبائلی سردار سامنے بیٹھے تھے۔ نواب نے پیالہ اٹھاتے ہوئے کہا، اگر میرا بیٹا پیدا ہوا تو میں اس کے لئے حیاسیرئی میں رہائش گاہ بنواؤنگا کیونکہ یہ جگہ بہت خوش منظر ہے۔ پیالہ میز پر رکھا تو آستین سے ایک سانپ نکل آیا۔ پیالہ اٹھایا تو سانپ واپس آستین میں گھس گیا۔ جیسے ہی پیالہ میز پر رکھتا کالا سانپ نکلتا اور ہاتھ اٹھاتے ہی اندر چلا جاتا۔ سانپ کو دیکھ کر بھی کسی نے نواب کی بات نہیں کاٹی۔ وہ برابر بولتا رہا۔ آخر سانپ آستین سے نکل آیا۔ پرچ پیالی کے گرد چکر کاٹا اور رینگتے ہوئے ندی کی طرف چل دیا۔ سکون سے چائے پینے کے بعد شکار کیلئے اٹھ کھڑا ہوا۔

اس کی اس حرکت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ رعایا پر اپنی دلیری کا رعب اور دہشت جمانا چاہتا تھا۔ کثیر تعداد میں کتے پالنے، دربار کے راستے میں کتوں کی جھونپڑی بنانے اور اپنے اردگرد کتے بٹھائے رکھنے کا مقصد بھی شاید درباریوں اور ملاقاتیوں پر رعب جمانا اور خوف طاری کرنا ہو۔

سپاہیوں کا رعب

سپاہی بندوق ''یوبندے'' اور دو کارتوس لئے پھرتے جو شاید ناکارہ بھی ہو سکتے تھے۔ لیکن رعب اتنا کہ راہ گیر چلتے ہوئے خاص احتیاط برتتے اور آپس میں سرگوشی کرتے ہوئے کہتے ''غلے شہ هلكه دنواب صاحب سپاهي دیے ''۔ (چپ ہو جاؤ نواب صاحب کا سپاہی آرہا ہے)۔

سپاہی پھٹے پرانے لباس میں کسی گاؤں میں پہنچتا۔ تو گاؤں کا خان نہ صرف والہانہ استقبال کرتا بلکہ حجرہ لے جا کر خوب خاطر تواضع کرتا۔ یہ سپاہی سرکار کا جو بھی حکم لے جاتا خان اس پر فوری عمل کرتا۔ کسی گاؤں میں چوری ہوتی تو ایک سپاہی درجن بھر مشکوک افراد کو پکڑ کر پوچھ گچھ کے لئے نزدیکی قلعے میں لے جاتا خواہ اس میں کوئی معزز شخص ہی کیوں نہ ہوتا۔

باؤرے نامی جمالدار دریا میں غسل کرتے وقت اپنی بندوق وہاں بھول گیا۔ اس کے خیال میں بندوق حسب معمول تحصیلدار کے حوالہ کی گئی تھی۔ مگر جب اگلی صبح اسے غسل والا واقعہ یاد آیا۔ وہ جلدی سے وہاں پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ بندوق جوں کے توں پڑی ہے اور لوگ اس راستے کو چھوڑ کر دوسرا راستہ استعمال کر رہے تھے۔

نواب سہ پہر کو محل سے نکلتا تو دربار کے کونے پر بندوق تھامے پہرہ داروں سے نواب کی موجودگی کا اندازہ لگا کر راہ گیر تیز تیز قدموں سے چلتے۔ بچے ساتھ میں ہوتے تو ان کے منہ پر ہاتھ رکھ کر انھیں خاموش کیے رکھتے۔ نواب کی عادت تھی کہ اکثر بالکونی میں دوربین لگا کر دارالحکومت کا نظارہ کرتا ڈاک بس دارالحکومت پہنچتی تو سواریاں نظر اٹھا کر محل کی طرف دیکھنے سے کتراتیں کہ کہیں نواب دیکھ نہ لے۔

---

[1] والی سے ملاقات کا شرف ہر کسی کو حاصل ہو سکتا تھا، لوگ قطار میں کھڑے ہو کر اسے مسائل سناتے جس پر فوری عمل کرنے کا حکم دیا جاتا۔ ایرانی سیاح لکھتا ہے کہ ''ایک روز میں ایک چوک پر کھڑا تھا ایک موٹر آئی اور چند سواریاں اتار کر چلی گئی۔ پوچھنے پر مجھے بتایا گیا کہ یہ والی سوات تھا اور یہ سواریاں عام راہ گیر تھے جن کو گاڑی میں بٹھا کر وہ یہاں تک چھوڑ گیا ہے''۔

نواب کے ذاتی پچیس پہرہ دار اس سے کچھ فاصلے پر انتہائی چست و چابک پہرہ دیتے۔ان کی نظریں سامنے پہاڑوں جمی ہوتیں جبکہ کان نواب کی طرف تاکہ کوئی حکم ہو تو فوراً بجالائیں۔نواب حکم دیتا تو اردلی سپاہی دوڑ کر نزدیک پہنچ کر حکم سنتا پھر دو تین قدم آہستہ پیچھے ہٹ کر دربار کے دوازے تک تیز تیز قدموں سے جاتا اور وہاں دوڑ لگاتا ہوا مخصوص بندے تک پہنچتا۔جنگل ہو یا کھیت سپاہی مطلوبہ شخص کو ڈھونڈ نکال کر اپنے ساتھ دوڑا کر حاضر کرتا۔

درباریوں کے کلمات

پھولے ہوئے سانس سے جب وہ شخص صدر دروازے پر پہنچتا تو دربان اسے دربار کے آداب بتاتے۔کہ ''نواب صاحب تہ بہ نہ گوری'' (نواب صاحب کی طرف نہیں دیکھو گے) ہر حکم کی تعمیل کروگے، یہ الفاظ کہو گے ''واک دخدائے اختیار دنواب''۔(خدائی خدا کی حکم نواب کا)۔
پھر دربان اس کا لباس اور حلیہ ٹھیک کرتا۔پہلے وہ شخص ٹوپی سیدھی کرتا بٹن بند کر کے پائچے اٹھاتا اور چادر درست کرتا ہوا کسی آیت کا ورد کرتا ہوا دربار کے دروازے سے اندر جاتا۔مظلومانہ چہرہ لئے تھوڑا جھکتا پھر نظریں جھکائے دوزانوں بیٹھ جاتا جیسے تشہد میں بیٹھا ہو۔
گھٹن اور دباؤ کی فضاء سے بدحواس نواب کی باتوں کو غور سے سنتا اور اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے سر ہلاتا۔جیسے ہی وہ جانے کا حکم دیتا یہ لرزتے کانپتے ہاتھوں کو جوڑے، دو چار قدم پیچھ ہٹ کر دروازے کی راہ لیتا اور باہر نکل جاتا جہاں دربان اسے سرگوشی کے انداز میں سمجھاتا کہ ملاقات میں جو باتیں ہوئیں اس کا کسی سے ذکر نہ کرے۔باہر جو شخص ملاقات کے بابت پوچھتا تو نواب کے منہ سے گالیاں اور سخت الفاظ سن کر بھی اس کی تعریفیں کرتا۔''نوا ب صاحب ڈیر خه سڑے دے ،خدائے دی اوبـه خی ڈیرے خبے خبرے ی او کڑے''.(نواب صاحب بہت اچھے انسان ہیں اللہ ان کی مغفرت فرمائے مجھ سے بڑے اچھے انداز میں باتیں کیں)۔

انتظامیہ پر رعب

نواب محل سے نکلتا تو سناٹا چھا جاتا۔افسر اشاروں کنایوں میں بات کرنے لگتے۔چادر اوڑھے دھیمی چال سے چلتے ہوئے چادر کا ایک پلو زمین پر گھسیٹتا۔مزاج کا اندازہ افسریوں لگاتے۔اگر چلتے

ہوئے ہاتھ ہل رہے ہوتے تو مطلب ہوتا کہ نواب موڈ میں ہے اور ہاتھ سینے پر باندھ کر چلتا تو درباری سمجھ جاتے کہ اس کا مزاج بگڑا ہوا ہے۔

سنجیدہ اور حاکمانہ برتاؤ روا رکھنے والے نواب کا رویہ اپنے ماتحتوں سے کبھی بھی دوستانہ نہ رہا ۔چند ایک کے علاوہ باقی افسروں کو گالیاں اور طعنے دیتا۔ان سے ذاتی قسم کے کام بھی لیتا مثلاً بعض افسروں سے مٹھی بھرواتا اور مالش کرواتا، جب تھوکتا تو ایک افسر دوڑ کر رومال آگے کرتا۔کوئی افسر زندگی بھر نواب کے برابر نشست پر نہ بیٹھ سکا۔شکارگاہ تک نواب گھوڑے پر تو یہ افسران پیدل معیت میں چلتے۔ کسی افسر نے کبھی بھی گاڑی میں اس کے ساتھ سفر نہیں کیا بلکہ گاڑی نواب خود پیچھے بیٹھتا اور اگلی سیٹ پر اس کے دو کتے بیٹھے ہوتے۔

حاکمانہ حربوں کے علاوہ اسے افسروں کو خوش رکھنے کے گر بھی آتے تھے۔جیسے احکامات کی بروقت بجا آوری پر لباس، اناج اور عہدوں میں ترقی سے نوازنا۔افسروں کو جائیداد دینے کے علاوہ ان کے بچوں کے حصول تعلیم پر خاموشی اختیار کئے رکھنا۔

حساس اور شکی مزاج

اگرچہ ریاست پر نواب کا گرفت مضبوط رہا مگر وہ کافی حساس اور شکی مزاج رہا۔اس نے بیٹوں کو انتظامی امور میں محدود اختیارات دیئے۔بااثر لوگ ریاست سے باہر جاتے تو جاسوس ان کے تعاقب میں لگے رہتے۔ریاست میں کوئی خان کسی دوسرے خان سے رشتہ کرتا تو نواب کو پیشگی اطلاع دیتا۔وہ اقتدار کے چھن جانے کے ڈر سے ریاست سے باہر بہت کم جاتا تھا۔1925ء اور 1929ء کے دہلی کے دوروں کے علاوہ اس نے کبھی ریاست سے باہر قدم نہیں رکھا۔شکی مزاج نواب نے ریاست سے باہر جاتے وقت بھی کسی کو ایک دن کیلئے بھی قائم مقام مقرر نہیں کیا۔

نواب کی عادت تھی کہ اچانک کہیں بھی وارد ہو جاتا۔چند سال پہلے جندول خان فضل غفور تحصیلدار کے ہاں مہمان تھا۔ایک واقعہ یاد دلاتے ہوئے جندول خان نے کہا ''فضل غفور تمہیں یاد ہے کہ ایک دفعہ میں سیگریٹ پی رہا تھا کہ اچانک بابا نکل آئے تو میرے اوسان خطا ہو گئے۔میں نے سیگریٹ تمہاری واسکٹ کے جیب میں ڈال دیا۔دھواں اٹھتا دیکھ کر بابا نے بارعب آواز میں پوچھا کہ ''اچھا! تم

سگریٹ بھی پیتے ہو''۔ محفل میں موجود لوگ ہنس پڑے جندول خان نے لوگوں سے کہا'' پھر فضل غفور نے سہمے ہوئے اپنی جیب کو دبانا شروع کیا۔اور'' نہ صاحب نہ صاحب'' کہتا رہا۔ بابا سمجھ گئے اور چشم پوشی کی''

ایک نشانہ باز سے سلوک

اس زمانے میں موضع حیا گی میں ایک مشہور ڈاکو تھا۔ اس شخص کے نواب سے تعلقات خراب تھے۔ یہ شخص بہت دلیر بھی تھا۔ اس کے پیچھے جاسوس لگا دیئے گئے۔ یہ شخص گاؤں چھوڑ کر دارالحکومت کے آس پاس پہاڑوں میں روپوش ہو گیا۔ گڈریا نے دیکھ لیا اور انتظامیہ کو مطلع کیا۔ مگر وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ خوئیداد خان اس زمانے میں انتہائی ماہر نشانہ باز تھا جس نے اس مفرور کو بڑی مہارت سے گولی کا نشانہ بنایا۔

نشانہ بازی میں اس کی مہارت دیکھ کر نواب کو اپنی فکر لاحق ہوئی۔ ایک دن دربار کے ڈبہ پر کھڑا دریا کا نظارہ کر رہا تھا۔ کہ ایک عورت کو دیکھا جو مٹکا لئے'' طالبانو چشمہ'' سے پانی بھرنے جا رہی تھی۔ ایک کٹورا بھی مٹکے کے اوپر رکھا ہوا تھا۔ نواب نے نشانہ باز کو بلوا کر کہا۔'' کیا تم کٹورے (برتن) کو نشانہ بنا سکتے ہو''۔ اس نے حامی بھر لی اور بندوق تھام کر کھڑا ہو گیا دو ڈھائی سو میٹر کا فاصلہ تھا، عورت بے خبر جا رہی تھی، اس نے نشانہ باندھ کر کٹورے کو اڑا دیا۔ مٹکا اور عورت بالکل محفوظ رہی۔ نشانہ باز نے خوشی سے نواب کی طرف دیکھا تو بڑا حیران اور خوفزدہ ہوا کیونکہ نواب اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ نواب نے کہا'' تم دور پڑی ہوئی چیز کو ٹھیک نشانہ بنا سکتے ہو تو کسی دن سامنے پہاڑی (ناغہ غر) سے میری گردن کو بھی نشانہ سکتے ہو''۔ اس نشانہ باز کو اسی وقت گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔

نواب کے دفاعی تدابیر

نواب شاہ جہان کا نام سنتے ہی لوگوں پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ ریاست میں اس کا بڑا رعب تھا مگر وہ خود دشمنوں سے خائف رہتا تھا۔ نواب ہمیشہ اندھیرا چھانے سے پہلے پہلے محل میں داخل ہو جاتا تھا۔ رات کو محل کے گرد سو مسلح سپاہیوں کا کڑا پہرہ رکھتا۔ پچیس سپاہی ہمہ وقت اس کے ساتھ رہتے تھے۔ ہمیشہ بھرا پستول اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ اس نے ہمیشہ پہرہ دار کتے ساتھ رکھے حتیٰ کہ رات کو خوابگاہ میں بھی کتے ساتھ رہتے۔

سفر کے دوران بھی اس کے حفاظتی اقدامات مثالی ہوتے تھے۔ سفر کا ارادہ خفیہ رکھتا، جب سفر کا وقت آتا تو اسی وقت تحصیلدار کو حفاظتی پہرے کا حکم دے کر روانہ ہو جاتا۔ بازار بند رکھنے کا حکم دیتا تھا۔ شاید اس خدشے سے کہ ہجوم کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کوئی دشمن حملہ نہ کر دے۔

دیر خاص سے تیمر گرہ کے 75 کلومیٹر کے سفر کے دوران مسلح سپاہیوں کے کڑے پہرے میں سفر کرتا تھا۔ جب سفر شروع ہوتا تو سڑک کے دونوں جانب سپاہی کئے جاتے۔ جیپ اور بس میں محافظین عقب میں چلتے۔ جبکہ والی سوات سفر کرتا تو اس کے عقب میں ایک جیپ میں صرف دو سپاہی ہوتے تھے۔ وہ کبھی چترال یا باجوڑ کے حکمرانوں کے ہاں بھی نہیں گیا۔ ریاست سے باہر کا سفر تو درکنار وہ جندول تک جانا بھی اقتدار کیلئے خطرہ سمجھتا تھا 1929ء میں عالمزیب خان سے جندول قبضے میں لینے کے بعد وہ وہاں گیا۔ ریاست کا بڑا اور اہم حصہ ہوتے ہوئے بھی اس نے کبھی ادھر کا رخ نہیں کیا۔

نواب شاہ جہان کی خوبیاں

نواب محمد شاہ جہان اپنے زمانے کا ایک چالاک، ہوشیار اور بیدار مغز حکمران گزرا ہے۔ جب وہ حکمران بنا تو خزانہ خالی تھا، عدالتی نظام بگڑا ہوا اور انتظام سلطنت کمزور۔ اس نے مختصر عرصے میں پوری ریاست پر اپنی گرفت مضبوط کی، خود کو اور حکومت کو معاشی طور پر طاقتور بنایا۔ اس نے اپنی ریاست کو بیرونی سازشوں اور انتشار سے محفوظ رکھا۔ اس میں کئی ایسی خوبیاں تھیں۔ کہ اگر وہ ان کا ریاست کے حق میں صحیح استعمال کرتا تو ریاست دیر کو باقی ریاستوں کیلئے نمونہ بنا سکتا تھا۔ اس کی خوابیدہ خوبیوں کے چند پہلو مندرجہ ذیل ہیں۔

بحیثیت انتظامی سربرہ

نواب کی سیاست، حکومت، معاہدوں اور خارجہ پالیسی کو دیکھ کر بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ انتہائی زکی، فہیم اور زیرک حکمران تھا۔ مردم شناس اور موقع شناس بھی تھا۔ اسے معاملات کو سمجھنے اور انھیں سلجھانے اور دوسروں سے کام لینے کا ایک خاص ملکہ حاصل تھا۔ اس نے ایک ایسا سیٹ اپ تشکیل دیا کہ صرف تین گھنٹے ریاستی معاملات اور انتظامی امور کو دیتا۔ اور اس طرح پوری ریاست کا انتظام ٹھیک ٹھاک چلتا۔

لڑکپن میں نواب نے ایک دن کہا کہ ''میں دیر پر ایسی حکومت کرونگا کہ ایک خوبصورت حسینہ سونے کی ٹوکری سر پر لئے چکدرہ سے روانہ ہو کر لواری پار کریگی اور کسی کو اسے آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرات نہ ہوگی'' اور یہ ثابت کر کے دکھا دیا۔ دارالحکومت میں رات کو دکانوں کے باہر سامان پڑا رہتا لیکن کسی کو اسے چھونے کی جرات نہ ہوتی تھی۔

قوت ارادی

نواب مضبوط قوت ارادی کا مالک تھا۔ اقتدار سے پہلے حکمرانی کے جو خواب دیکھے انھیں عملی جامہ پہنایا۔ زندگی بھر اپنے کسی موقف سے پیچھے نہ ہٹا۔ اس نے جو قوانین بنائے ان میں اصلاحات کیلئے انگریزوں اور پاکستان نے کئی دفعہ دباؤ ڈالا، بغاوتیں ہوئیں لیکن وہ اپنے موقف پر ڈٹا رہا اور کوئی اس کے مصمم ارادوں کو ڈگمگا نہ سکا۔

علوم وفنون میں مہارت

نواب کو پانچویں جماعت تک فارسی تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ وہ قبائلی عمائدین کی مجلس میں بیٹھ کر بہت کچھ سیکھتا تھا۔ کتابی مطالعے کے شوق کے علاوہ خبریں سننا معمول تھا۔ اس نے اسلامیہ کالج اور دوسرے اداروں سے فارغ التحصیل معلموں کو تنخواہ دار رکھا جنہوں نے اسے انگریزی خبریں اور دستاویزات کو سمجھنے اور جدید علوم سیکھنے میں مدد دی۔

علم طب، نفسیات اور جنسیات سے اشنا اور قانونی پیچ وخم سے واقف تھا۔ ماہر لسانیات بھی تھا اسے پشتو اور فارسی پر مکمل عبور حاصل تھا جبکہ اردو بھی سمجھ اور بول سکتا تھا۔ ماہر حیوانات تھا حیوانی اوصاف سے باخبر تھا۔ گھوڑوں، کتوں اور شکاری پرندوں کی تربیت میں دلچسپی رکھتا تھا۔ ماہر معاشیات تھا۔ اناج، گھی، سبزی میں ریاست کو خود کفیل بنایا۔

علم نجوم میں دلچسپی رکھتا تھا۔ اس نے اپنی گرفتاری کی خود پیش گوئی کی تھی۔ ایک دفعہ دارالحکومت میں واقع پہاڑی ''پل منزئی'' میں شکار پر گیا۔ وہاں شاہی کرسی پر بیٹھنے لگا کہ کرسی سرک گئی وہ یکدم اٹھ کھڑا ہوا۔ کرسی پہاڑی سے نیچے لڑھک گئی، وہ بغور اسے دیکھتا رہا۔ دو سپاہی دوڑتے ہوئے گئے اور دریا کے کنارے سے کرسی واپس لے آئے۔ کرسی کا ایک پاؤں ٹوٹا ہوا تھا۔ اس واقعہ سے بہت زیادہ فکر مند ہوا۔ شکار ادھورا چھوڑ کر واپسی کی راہ لی۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اس واقعہ کے دو دن بعد اسے اقتدار سے ہٹا دیا گیا۔

حاضر جواب

نواب بہت حاضر جواب تھا۔ وہ دوسروں کو اپنی بات پر قائل کرنے میں بھی بہت ماہر تھا۔ اس نے اپنی پالیسیاں جاری رکھنے کیلئے قوم، انگریزوں اور پاکستانی حکام کو اعتماد میں لئے رکھا۔ وہ زمینداروں اور تاجروں سے ایسے باتیں کرتا جیسے خود اس پیشے سے وابستہ رہا ہو۔ ریاست میں اصلاحات لانے کی غرض سے کئی انگریز اور پاکستانی حکام آئے مگر نواب انھیں لفظوں کی ایسی مار مارتا کہ وہ لاجواب ہو کر لوٹ جاتے۔

بعض اوقات پاکستانی حکام سے تکرار کی نوبت بھی آجاتی تھی۔ پولیٹکل ایجنٹ جو ایک آنکھ سے نابینا تھا، نواب سے مخاطب ہوکر کہنے لگا کہ ''نواب صاحب ہماری حکومت اندھی نہیں آپ جو کچھ کرتے ہیں اسے سب معلوم ہے۔ نواب نے جواب میں کہا۔ ''حکومت کہ ژوند نہ وے نو ژاندہ بہ ی نہ بھرتی کولے '''' حکومت اندھی نہ ہوتی تو اندھوں کو بھرتی نہ کرتی''۔

حکومت پاکستان نے والی سوات کی اجازت سے دریائے سوات پر پانی کے بہاؤ اور سطح کی پیائش کرنے والا آلہ نصب کیا۔ جب نواب زادہ زریف خان آفریدی نے نواب سے دریائے پنجکوڑہ پر یہ آلہ نصب کرنے کی فرمائش کی۔ تو نواب نے کہا ''دریائے سوات پر پہلے سے آلہ نصب ہے۔ دیر اور سوات کے دریا ''ورشئی'' کے مقام پر ملتے ہیں۔ تم لوگ ورشئی کے مقام پر ایک اور آلہ لگاؤ پھر سوات کے دریا کی پیائش کو اس سے منفی کرلو تو دریائے پنجکوڑہ کے بہاؤ اور سطح کا پتہ خود بخود چل جائے گا''۔

بے باک پختون

ایک یوسفزئی پختون اور خان کی حیثیت سے پختون روایات کی پاسداری کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھا۔ وہ پختون ہونے پر فخر کرتا تھا۔ سر اٹھا کر بات کرنا اس کا شیوا تھا۔ وہ وائسرائے ہند یا گورجنرل کی تعظیم میں اٹھ کھڑا ہونا بھی اپنے لئے باعث عار سمجھتا تھا۔

وفاشناس

وہ احسان کرنے والوں کا ہمیشہ قدردان اور احسان مند رہا۔ اس نے انتظامیہ میں بیشتر وہ لوگ رکھے جو اس کے باپ دادا کے وفادار رہ چکے تھے۔ ایک دفعہ نہا گدرہ شانگا کے ملک پام جان نے ایک مشر کے خلاف شکایت کی کہ وہ حکومت کے خلاف کام کرتا ہے۔ نواب نے جواباً کہا ''مجھے معلوم ہے جو کچھ وہ کررہا ہے لیکن اس کے دادا نے میرے والد کی خدمت کی ہے جب اس کے برے اعمال دادا کی خدمات پر بھاری پڑ جائینگے تو پھر اس پر ہاتھ ڈالیں گے''۔

قلعہ باڑوہ کے اصطبل کے جنگی گھوڑے نیلام کئے جارہے تھے۔ نواب کو ہر گھوڑے کی نسل اور دوسری صفات کے بارے میں مختصر بتایا جاتا۔ ایک گھوڑے کے متعلق مرزا نے یہ بتایا کہ یہ وہی گھوڑا ہے جب چاڑا نواب کے عہد میں عبدالمتین خان سے جندول قبضہ کیا جارہا تھا تو اس گھوڑے پر دیر لشکر کا

سپہ سالار سوار تھا۔نواب نے کہا" ایسے گھوڑے بیچنے کے لئے نہیں ہوتے" اور پھر اس گھوڑے کی اصطبل میں خصوصی خوراک اور نگہداشت کا حکم دیا۔

ضد اور ہٹ دھرمی

نواب شاہ جہان کی زبان سے ادا کئے گئے الفاظ میں تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی تھی ۔ایک بار جو سزا دیتا اس میں کمی یا نرمی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔نواب کے ہاں خانساماں سے برتن چوری ہو گئے تو خانساماں کو ریاست بدر کر دیا۔وہ شخص پہلے کابل گیا اور پھر کراچی میں محنت مزدوری کرتا رہا ادھر مارکیٹ سے اسی طرز کے قیمتی برتن خرید کر نواب کی خدمت میں پیش کر دیئے۔نواب برتنوں کو دیکھ کر آگ بگولہ ہو گیا اور کہا" تم مجھے وہی برتن لا کر دو گے جو چوری ہوئے ہیں جب تک وہ برتن نہیں لاؤ گے تب تک ریاست میں داخل نہیں ہو سکتے" یہ شخص نواب کی گرفتاری تک جلاوطن رہا۔

جمالدار قلندر شاہ نواب کیلئے بٹیر لے جارہا تھا۔بمقام گورگوری چوک تیمرگرہ بس میں سوار ہوا۔ڈرائیور نے سرکاری نوکر ہوتے ہوئے بھی اس سے کرایہ وصول کیا اور اس کو چھت پر بٹھایا۔جمالدار نے نواب سے ڈرائیور کی شکایت کی۔

اگلی صبح ڈرائیور کو حاضر کیا گیا۔"برا بھلا سنانے کے بعد نواب نے اسے کرایہ واپس کرنے کو کہا ۔ڈرائیور نے لرزتے ہوئے دو سکے جیب سے نکال کر دے دیئے۔"هغه روپئی ور کڑه کومی چه ددنه اغستی دی "(اسے وہی سکے دو جو تم نے اس سے لئے ہیں)۔ڈرائیور حیران اور ششدر رہ گیا کیونکہ پچھلے دن کی ریزگاری کنڈکٹر خزانے میں جمع کرا چکا تھا۔ڈرائیور سر جھائے کھڑا تھا کہ سپاہیوں کو حکم دیا گیا جنہوں نے ڈرائیور کی گھونسوں اور لاتوں سے خوب مرمت کی۔

زیرک اور مردم شناس

روزانہ درجنوں قبائلی سرداروں سے ملتا اور ان کی جان کاری رکھتا۔ہر قوم اور ہر گاؤں میں لوگوں کے شجرہ نسب بھی یاد رکھتا۔اس حد کا مردم شناس تھا کہ دربار میں ملاقات کیلئے آنے والے اجنبی سے پوچھتا۔"هلکه ته د فلانکی کا کا سه ئيے "(تم فلاں کا کا کے کیا لگتے ہو)۔وہ جوان واقعی اس گھرانے کا فرد نکلتا۔وہ سپاہیوں کا انتخاب خود کرتا تھا۔ہر شخص کی طبیعت اور مزاج کے مطابق اسے فرائض

سونپتا تھا اس کا انتخاب ہمیشہ درست ثابت ہوتا تھا۔

مجرم پہچانے میں مہارت

مجرم کو پہچانے میں نواب کو ملکہ حاصل تھا۔ کسی گاؤں میں چوری ہوتی تو اس گاؤں کے اوباش اور آوارہ جوانوں کو سامنے لا کر کھڑا کر دیتا۔ نواب جس پر انگلی رکھتا اکثر وہی چور نکلتا۔ سردی کے موسم میں صبح کے وقت ایک سپاہی خبر لایا۔ کہ دارالحکومت کے شمال میں چند کلومیٹر کے فاصلے پر ایک چترالی باشندے کی لاش پڑی ہے۔ ملیشیا کو حرکت میں لا کر درجنوں سپاہیوں کو دارالحکومت میں گشت پر لگا دیا اور بعض کو جائے وقوعہ بھیجا گیا۔ حکام کافی تگ ودو کے باوجود کھوج لگانے میں ناکام رہے۔

قاتل کو معلوم کرنے کیلئے افسران سرگوشیوں میں مصروف تھے۔ تحصیل دار گل زرین بھی بڑے دباؤ میں تھا۔ نواب یہ خبر سن کر محل میں داخل ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بعد نکل کر حبیب الحسن سے کہا کہ گل زرین کو بلاؤ جب وہ آیا تو نواب نے حکم دیا جتنی جلدی ہو ڈاک بس کو اپنی گرفت میں لے لو۔ ایک مقام پر بس کی ناکہ بندی کر دی گئی جب تلاشی لی گئی تو دو چترالی باشندے اس میں سے سوار تھے جنہیں گرفتار کر کے دربار لایا گیا ان سے پوچھ گچھ کی گئی تو انھوں نے جرم کا اقرار کر لیا۔

ایک دفعہ والئی کنڈاؤ کے مقام پر میاں کلے کا ایک تاجر لوٹنے کے بعد قتل کیا گیا۔ خبر پا کر بلامبٹ تحصیلدار نے خیمہ اور دیارون گاؤں کا محاصرہ کیا۔ جب قاتل کا کھوج نہ لگایا جا سکا تو نواب نے تحصیلدار کو حکم بھیجا کہ وہ اپنے سپاہیوں کے کارتوس گن لے جو انھیں خاص مقدار میں دیئے جاتے تھے۔ جب گنتی ہوئی ایک سپاہی کے پاس ایک کارتوس کم نکلا۔ بعد میں اسی سپاہی نے قتل کا اقبال جرم کیا۔

جانوروں کی پہچان میں مہارت

صبح مشکاروں کو بلوا کر نواب پرندوں کا مشاہدہ کرتا۔ کمزور پرندہ دیکھ کر متعلقہ مشکار کو ڈانٹ پلاتا اور مخصوص خوراک دینے کا حکم دیتا۔ ایک سہ پہر کو نواب دربار میں کھڑے تھا نیچے دیکھا کہ ایک کوہستانی ملک گھوڑے کی لگام پکڑے آرہا ہے۔ نواب نے دیوار کے اوپر سے گھوڑے کی پشت پر ہاتھ پھیرا جس کے بال سیدھے کھڑے تھے، چیخ کھینچی اور یوں مخاطب ہوا۔

''کوھستان کاکا دے مور خو درنہ نہ دہ مڑہ (کوہستان چاچا! اس کی ماں تو نہیں مری)۔

وہ شخص چونکا اور کہا ہاں صاحب۔ پھر پوچھا، اسے گائے کا دودھ پلایا ہے۔ اس شخص نے حیران ہو کر کہا۔ ہاں صاحب۔ نواب نے گھوڑا قبول کر کے گرڑئی خان کو عنایت کیا۔

کتوں کو خوراک ڈالتے ہوئے نواب ان پر بھی نظر رکھتا۔ ایک دن کتوں کیلئے مختص برتنوں میں شوربہ رکھا گیا تھا۔ ایک کتا اپنا برتن چھوڑ کر دوسرے کتے کے برتن کے پاس گیا۔ نواب نے افسروں سے کہا" داپسے حرامی او بے ایمانہ دے (یہ کتا حرامی اور بے ایمان ہے) اس کتے کو ایک افسر کے گھر بھیج دیا گیا۔

خزانہ پر گرفت

نواب کے والد چاڑا نواب سے افسران نے بہت ساری دولت ہتھیالی تھی۔ نواب نے ایماندار خزانچی رکھے۔ اس کے دور میں پائی پائی کا حساب رکھا جاتا۔ نواب کے حکم کے روسے کابلی سکہ بھی خرچ کیا جاتا تو اسے اعتماد میں لینا ضروری تھا۔ صبح اٹھتے ہی درجن بھر رجسٹروں میں مہمان خانہ، اسلحہ کارخانہ، کتوں اور گھوڑوں کی خوراک، محل کے خرچ اخراجات وغیرہ کا سارا حساب کتاب نواب خود چیک کرتا تھا جس پر چار افسروں انبار مرزا، طور خان (مشیر مال)، حبیب الحسن (وزیر خزانہ آمدن) اور فاتح جان (وزیر خزانہ خرچ) کے دستخط لازمی تھے۔ نواب اخر میں اپنا دستخط کر کے مہر لگاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ چھتیس سالہ اقتدار میں خزانہ میں خرد برد کا کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا۔

نواب کی زندگی کا مختصر جائزہ

نواب کی زندگی کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ بطور ولی عہد انتیس سال، چھتیس سالہ اقتدار اور چھ سالہ نظر بندی۔ تینوں ادوار کٹھن اور پر آزمائش تھے۔ بچپن اور لڑکپن بغاوتوں اور جنگوں میں گزارا، باپ کی مسند پر دوسروں کو قابض پایا، والد پر درباریوں کے ہاتھوں ڈھائے جانے والے ظلم نے ذہن پر اثر ڈالا۔ باپ پر فالج کا حملہ ہوا تو کسی رشتہ دار نے سر پر شفقت کا ہاتھ نہیں رکھا۔ درباریوں کی بے ایمانی، والد کی بیماری، رشتہ داروں کی بیگانگی جیسے عناصر نے اسے ایک تندخو، سخت گیر، حساس اور شکی مزاج اور خود غرض بنا دیا تھا۔

زندگی کے دوسرے دور میں باپ کو زہر دے کر حکمران بنا۔ تو تاج کانٹوں کا تاج ثابت ہوا کیونکہ خزانہ خالی، ریاست پر گرفت کمزور اور عدالتی نظام درہم برہم تھا۔ اس نے مختصر عرصے میں ریاست پر گرفت مضبوط، جاہ وجلال بڑھایا، قوم اور بااثر لوگوں کو مطیع بنایا۔ رشتہ داروں سے قطع تعلق کئے رکھا، بھائی، بیٹے، گھر والوں کو حکمرانی کی خاطر قربان کیا۔ مگر اقتدار کا دور اسلئے مشکل تھا کہ ریاست میں ہزاروں دشمن اس کا تختہ الٹنے کیلئے ہمہ وقت کاروائیوں میں مصروف رہتے، اسلئے قوم کو اعتماد میں لینا، گروہ سازی کرنا، ریاستی معاملات سے باخبر رہنا، جاسوسوں کا جال پھیلائے رکھنا اور اپنی جان کی حفاظت کرنا لوہے کے چنے چبانے کے مترادف تھا۔

زندگی کے تیسرا دور اور بھی کٹھن اور درد والم کا دور ثابت ہوا۔ شان وشوکت اور جاہ وجلال سے قید تنہائی۔ بیٹے کی برائے نام حکمرانی، جاگیر کا بٹوارہ، خاندان کے اثر ورسوخ کا خاتمہ اسے پل پل ستاتا رہا۔ سب سے بڑا غم یہ تھا کہ وہ لوگ جو اس کی خدمت میں دست بستہ کھڑے رہتے تھے، اس کی جائیداد کے وارث بن بیٹھے۔ اپنے بیٹوں کی نااہلی، انتظامیہ کی طوطا چشمی اور خاندان کے برے حشر نے اسے دل کا مریض بنا دیا تھا۔ بے بس ولاچار آہیں بھرتا رہتا، بڑھاپے اور بیماریوں کی لپیٹ میں آکر دل میں کئی حسرتیں لئے دنیا سے چل بسا۔ نواب شاہ جہان کی زندگی سے بہت کچھ سیکھا جاسکتا ہے۔ اگر وہ باپ اور خاندان سے کی گئی زیادتیوں کو بھول کر سب کچھ خدا پر چھوڑ دیتا اور انتقامی کاروائیاں نہ کرتا تو شاید اسے اور اس کے خاندان کو اتنے کٹھن مراحل سے نہ گزرنا پڑتا اور وہ آج بھی لوگوں کے دلوں پر راج کرتا۔

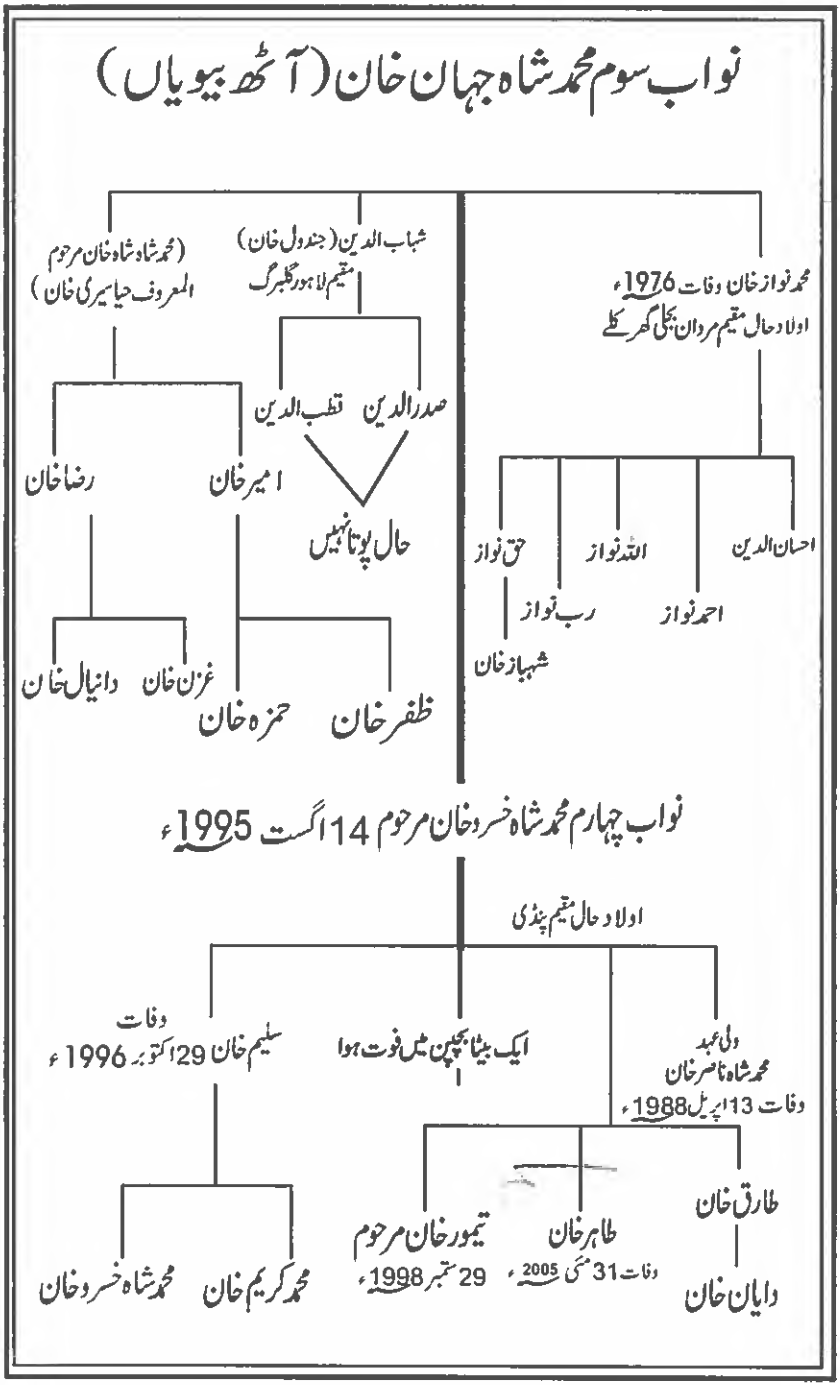
نواب سوم محمد شاہ جہان خان (آٹھ بیویاں)
محمد نواز خان وفات 1976ء
اولاد حال مقیم مردان بکلی گھر کلے
احسان الدین
اللہ نواز
حق نواز
شہباز خان
رب نواز
احمد نواز
شہاب الدین (جندول خان)
مقیم لاہور گلبرگ
صدرالدین
قطب الدین
حال پوتا نہیں
(محمد شاہ شاہ خان مرحوم
المعروف حیاسیری خان)
امیر خان
رضا خان
غزن خان
دانیال خان
حمزہ خان
ظفر خان
نواب چہارم محمد شاہ خسرو خان مرحوم 14 اگست 1995ء
اولاد حال مقیم پنڈی
ولی عہد
محمد شاہ ناصر خان
وفات 13 اپریل 1988ء
ایک بیٹا بچپن میں فوت ہوا
وفات
سلیم خان 29 اکتوبر 1996ء
طارق خان
دایان خان
طاہر خان
وفات 31 مئی 2005ء
تیمور خان مرحوم
29 ستمبر 1998ء
محمد کریم خان
محمد شاہ خسرو خان

شاہی خاندان کا موجودہ حال

نواب زادہ محمد نواز خان (مرحوم)

نواب محمد شاہ خسرو خان (مرحوم)

جندول خان (شہاب الدین خان حیات ہیں)

نواب زادہ محمد شاہ خان (حیا سیرئی خان)

نواب زادہ محمد شاہ ناصر خان (مرحوم)

(مرحوم) نواب زادہ شاہ سلیم خان محل ملازمین کے ساتھ

نواب زادہ محمد شاہ طارق خان

نواب زادہ محمد شاہ طاہر خان (مرحوم)

بخت جہان زیب خان المعروف بہ تیمر خان

C M K SET-4

نواب زادہ محمد شاہ تیمور خان (مرحوم)

نواب محمد شاہ جہان کے دور میں شاہی خاندان شہرت، دولت اور ناموس کے لحاظ سے اپنے عروج پر تھا۔ سونے جواہرات سے کھیلنے والا یہ خاندان ریاست کے پڑوسی حکمرانوں سے زیادہ بااثر اور صاحب جائیداد تھا۔ مگر جب اقتدار کا خاتمہ ہوا تو یہ خاندان اتنا متاثر ہوا کہ شاید ہندوستان کی سابقہ ریاستوں میں اس کی مثال نہ ہو۔

یہ قدرت کا نظام ہے کہ جب کسی خاندان کو بادشاہت ملتی ہے تو وہ عروج کی منزلیں طے کرنے لگتا ہے۔ اور جب زوال آتا ہے تو عقل وفہم اور ساری کی ساری ترکیبیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ دیر کا شاہی خاندان بھی اسی صورت حال سے دوچار ہوا مگر اس میں کچھ اپنی کمزوریاں بھی تھیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

محمد شاہ خسرو کی نااہلی

حکومت پاکستان کی جانب سے نواب کا خطاب ملتے ہی یہ محمد شاہ خسرو کی ذمہ داری تھی کہ وہ موروثی اقتدار، خاندان کے ناموس اور جائیداد کی حفاظت کرتا۔ بدقسمتی سے اس میں باپ جیسی صفات اور صلاحیتوں کی کمی تھی۔ وہ ریاستی معاملات میں دلچسپی کم لیتا تھا۔ اکثر شہری زندگی کی طرف مائل رہا اور زیادہ تر راولپنڈی اور پشاور میں مقیم رہا۔ اس نے اپنی انتظامیہ کے اہلکاروں کو بے پناہ اختیارات دیئے۔ زیادہ اعتماد کیا جس کی وجہ سے انتظامی اہلکاروں نے اختیارات کا ناجائز استعمال کر کے کافی جائیداد بنائیں۔ محمد شاہ خسرو کے عہد میں شاہی خاندان سنبھل نہ سکا اور زوال پذیر ہوتا گیا۔

باہمی اختلافات

نواب شاہ جہان کے کئی بیویاں تھیں۔ اسلئے سوتیلے پن کی وجہ سے بیٹے ایک دسترخوان پر جمع نہ ہو سکے۔ نواب محمد شاہ خسرو اور جندول خان کا دیر کی حکمرانی پر اختلاف رہا اور یہ کئی دہائیوں تک چلتا رہا۔ نواب شاہ جہان کی اولاد نہ صرف آپس میں اختلافات کا شکار رہی بلکہ آباؤ اجداد کے قبیلے اخون خیل اور نواب اول کی اولاد سے بھی رشتہ داری نہیں پالی۔ جس سے شاہی خاندان کمزور پڑ گیا اور بہت سے لوگوں نے اس نااتفاقی کا فائدہ اٹھایا۔

شہری زندگی اور باہر شادیاں

نواب شاہ جہان کے بعد نوابزادے شہری زندگی کی طرف مائل ہوئے۔ محمد شاہ خسرو پہلے بال بچوں سمیت راولپنڈی منتقل ہوا۔ جندول خان نے لاہور میں بنگلہ خریدا اور ایک رقاصہ سے شادی کی۔ حیا سرئی خان نے پشاور کے ایک جج حبیب اللہ خان کی بیٹی سے شادی کی۔ اور ولی عہد ناصر خان نے ایک فرانسیسی خاتون سے شادی کی۔ ریاست سے باہر شادیاں کر کے شہزادوں میں مہمان نوازی، سیاست، جائیداد کی رکھوالی پختون ولی، رشتہ داری پالنے جیسی خصوصیات کا فقدان پیدا ہوا۔ اس کمزوری کی وجہ سے شاہی خاندان اپنوں اور بیگانوں میں تمیز نہ کر سکا۔

نواب شاہ جہان جہاں قدامت پسندی، پختون ولی اور رواج پر زور دیتا تھا اس کی اولاد نے اپنی ثقافت اور روایات کو بھول کر شہری طرز زندگی کے علاوہ مغربی ثقافت کو اپنایا اور بے دریغ دولت خرچ کر کے عیش و عشرت کی زندگی بسر کی۔ اگر یہ خاندان شہری زندگی کے ٹھاٹ باٹ کا گہرا اثر نہ لیتا تو شاید کسی حد تک سنبھلنے کا موقع مل سکتا تھا۔

جائیداد کی حدود سے بے خبری اور کم قیمت پر فروخت

شاہی خاندان کے شہزادے اپنی جائیداد کی حدود (برید) سے بے خبر تھے۔ ذریعہ معاش بھی جائیداد بیچ کر کھانا تھا جو اب بھی جاری ہے۔ کاغذات اور اختیار افسروں کے پاس رہا۔ شہزادے اسلام آباد سے فون کرتے کہ مجھے گاڑی خریدنا ہے یا یورپ جانا ہے۔ فلاں جنگل کو فروخت کرے مجھے رقم بھجوا اس طرح یہ افسران اونے پونے داموں بیچ کر اپنا کمیشن بھی لیتے۔ حتیٰ کہ ان افسران نے نواب شاہ جہان کے جعلی دستخط کر کے جائیداد اپنے نام کروالی۔ شاہی خاندان کی بہت کم جائیداد باقی ہے اس حد تک کہ اب لوگوں کی نظریں چالیس کنال محل اور تاریخی دربار پر ہیں۔

شہزادوں کی جوانی میں موت

جب ولی عہد محمد شاہ ناصر خان 1988ء اور محمد شاہ خسرو 4 اگست 1995ء کو بروز جمعہ وفات پا گئے تو خاندان کا بوجھ شہزادہ سلیم خان اور تیمور خان کے کندھوں پر آ پڑا۔ حساس طبیعت کے مالک ان شہزادوں کو اپنی جائیداد اور اپنے خاندان کے زوال کا بہت رنج تھا۔

یہ شہزادے بڑے افسردہ رہتے اور دل ہی دل میں دوبارہ سنبھلنے کے لئے سوچتے رہتے۔ آخر میں ان شہزادوں نے نشوں کا سہارا لیا۔ پرنس سلیم خان اور تیمور خان شراب نوشی کے علاوہ چرس بھی پیتے تھے پھر ہیروئن کے عادی ہوئے۔

سلیم خان اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ اپنے آباؤ اجداد کی تاریخ اور کارناموں میں دلچسپی رکھتا تھا یہ ایک عقلمند اور نڈر جوان تھا اسے شاعری سے لگاؤ تھا۔ ایک ایرانی لڑکی سے محبت ہوگئی مگر گھر والے اڑے آگئے۔ گھر والوں کی خاطر اس نے اپنی محبوبہ کو تو چھوڑ دیا لیکن اسے عمر بھر بھلا نہ سکا۔ 1995ء میں سلیم خان کا والد محمد شاہ خسرو وفات ہوا۔ لوگ دربار فاتحہ کیلئے آئے۔ سلیم خان نشے میں دھت سر جھکائے، نیلے ہونٹ زرد چہرہ لئے اپنے باپ سے بے خبر بیٹھا تھا۔ جب لوگ ہاتھ اٹھاتے تو جان عالم مولوی صاحب اسے ہاتھ اٹھانے کیلئے کہتے۔

اسی طرح تیمور خان نشے میں گاڑی نکال کر بازار میں نکلتا تو ایک شور مچ جاتا کہ ''بچو! تیمور خان آرہا ہے''۔ کیونکہ وہ نہ ہارن بجاتا، نہ ہی بریک لگاتا اور نشے سے چور بھرے بازار میں بہت تیزی سے گزر جاتا۔ تیمور شہزادہ، نڈر اور بے باک تھا، اکثر اسلحہ ساتھ رکھتا تھا۔ اس نے اسلام آباد سے میٹرک کر کے باقی تعلیم امریکہ سے حاصل کی تھی۔ اس کے شغل میں گھوڑے، دنبے اور کتے پالنا تھا، اس نے پشاور کے قریب کوچیانوں کلی سے کتا خریدا تھا جس کا نام ''لیو'' تھا۔ پشتو موسیقی کو پسند کرتا اور خود پیانو بجاتا تھا۔ اس کی پسندیدہ گاڑی جیپ تھی جسے خود چلاتا تھا۔ شکار میں اسے کبوتروں کا شکار پسند تھا اور ان کے پیچھے ڈبرغر کے علاوہ کمرات تک جاتا تھا۔ تیمور خان اور سلیم خان دونوں کا سسر چترال کا پٹی شہزادہ تھا تیمور خان بھی بعد میں ہیروئین کا عادی بنا اور چترال ہی میں سسر کے گھر میں وفات پائی۔ اس کی ایک بیٹی ہے جس کا نام ایمان ہے۔

تیسرا شہزادہ تیمور خان کا چھوٹا بھائی طاہر خان ہے جس نے گریجویشن امریکہ سے کی تھی۔ اس کو مچھلی کا شکار پسند تھا۔ اس کے کتے کا نام ''چنو'' تھا۔ اسے کتابیں پڑھنا بھی پسند تھا۔ محمد شاہ خسرو کی ایک بیوی خال اخونزادگان سے تھی، طاہر خان کا رشتہ اس خاندان میں اسلئے کرایا گیا کہ اخونزادگان شاہی خاندان اور اس کی جائیداد کی رکھوالی میں ساتھ دیگا۔ شادی کے چند مہینے بعد ایک رات شہزادہ طاہر خان کو [illegible] محمد شاہ سلیم

خان، محمد شاہ تیمور خان اور محمد طاہر خان کی جوانی میں موت سے شاہی خاندان کی کمر ٹوٹ گئی۔

شاہی خاندان کی موجودہ سربراہ

شاہی خاندان کی موجودہ سربراہ دو خواتین ہیں، ایک محمد شاہ خسرو کی بیوہ حیا گی بی بی جو سلیم خان کے یتیموں کو پال رہی ہے۔ اور دوسری محمد شاہ ناصر خان کی بیوہ فرانسیسی خاتون المعروف بہ بیگم صاحبہ۔ یہ خواتین بڑی جرات، حوصلے اور صبر سے اس ڈوبتی ہوئی کشتی کے پتوار چلا رہی ہیں۔ تیمور خان مرحوم اور تیمور خان مرحوم کا بھائی طارق خان بھی ان خواتین کا ساتھ دے رہا ہے۔ طارق خان کی بیٹی اور بیٹا دایان خان اپنی ماں کے ساتھ اسٹریلیا میں زیر تعلیم ہیں۔ سلیم خان مرحوم کی ایک بیٹی اور دو بیٹے ہیں۔ بڑا بیٹا کریم خان اور چھوٹا رحیم خان المعروف بہ نونو خان راولپنڈی میں حیا گی بی بی کے ساتھ رہائش پذیر ہیں۔

سلیم خان مرحوم کی ایک بہن کا رشتہ حال ہی میں تیمر خان کے پوتے عالمگیر خان سے کرایا گیا۔ اسلام آباد میں رہائش پذیر یہ جوڑا بھی حیا گی بی بی کے ساتھ مختلف امور کو نمٹانے، جائیداد کی رکھوالی اور خاندان کو سہارا دینے میں مصروف ہے۔ الغرض نواب شاہ جہان کی اولاد میں معاشی اور افرادی قوت کے فقدان کے لحاظ سے محمد شاہ خسرو کا خاندان سب سے زیادہ متاثر ہوا۔

محمد نواز خان

محمد نواز خان نواب محمد شاہ خسرو کا بڑا بھائی اور نواب شاہ جہان کا بڑا بیٹا تھا۔ اس کو والد نے جلاوطن کر دیا تھا۔ محمد نواز خان مرحوم کی اولاد آجکل مردان نزد بجلی گھر رہائش پذیر ہے۔ بیٹوں نے سعودی عرب میں محنت مزدوری کر کے ایک چھوٹا سا گھر بنایا ہے۔ جو نواب شاہ جہان کے پوتوں کا کل اثاثہ ہے۔

شہاب الدین خان المعروف بہ جندول خان

محمد شاہ خسرو کے بعد خان شہاب الدین نوابی دور میں کافی جائیداد کا مالک تھا۔ باوثوق ذرائع کے مطابق منڈا اور ثمر باغ میں اس کی آٹھ ہزار جرب یعنی بتیس ہزار کنال کے لگ بھگ جائیداد تھی۔ 1960ء میں والد کے ہمراہ اسے بھی لاہور میں نظر بند کیا گیا۔ 1970ء میں خصوصی اجازت نامہ لیکر دیر آنے کی اجازت دی گئی۔ ریاست سے کئی سال باہر رہنے کی وجہ سے لوگوں نے اس کی بہت ساری جائیداد پر قبضہ کر لیا۔ جندول خان آج کل لاہور گلبرگ میں رہائش پزیر ہے۔ اس نے دو شادیاں کیں۔

عمر ستر سال سے تجاوز کر گئی ہے۔ گرمیوں کے موسم میں کبھی کبھار منڈا بنگلے میں آ کر جمروز خان کے بیٹوں کے ہاں قیام کرتا ہے۔

دوران اقتدار جب جندول خان موٹر میں گزرتا تو سینکڑوں مسلح سپاہی باادب اور چوکس کھڑے رہتے، روزانہ درجنوں خوانین اور ملک اس کے حضور میں پیش ہوتے۔ لیکن آج جب جندول خان ایک کالے ڈبل کیبن ڈالسن میں جندول آتا ہے تو کسی کو خبر تک نہیں ہوتی۔

محمد شاہ خان (حیاسیرئی خان)

نواب شاہ جہان کے سب سے چھوٹے صاحبزادے محمد شاہ خان نے پشاور میں جج حبیب اللہ خان کی بیٹی سے شادی کی۔ اس کے بیٹے امیر خان اور رضا خان راولپنڈی میں رہ رہے ہیں۔ اس خاندان نے بھی بہت ساری جائیداد بیچ ڈالی ہے مگر کافی نوابی جائیداد اب بھی باقی ہے۔ نوابزادے ایک خاص موسم میں دیر آ کر اپنے محل واقع حیاسیرئی میں قیام کرتے ہیں۔

عالمزیب خان

1940ء میں ایک معاہدہ ہوا تھا کہ نواب اپنے بھائی عالمزیب خان کو سالانہ پانچ سو (500) روپیہ کابلی وظیفہ دے گا۔ مردان میں گرداس نامی ایک گاؤں تھا جو ایک ہندو جواری ''گرداس'' کے نام سے منسوب تھا اور سرکار کے قبضے میں تھا۔ نواب نے سرکار سے یہ گاؤں دس ہزار پانچ سو روپے میں خریدا۔ جہاں اب بھی عالمزیب خان کی اولاد بستی ہے۔ اس پسماندہ گاؤں میں عالمزیب کی اولاد کی دو مختلف گھرانوں سے دشمنی چھڑ گئی۔ یہی وجہ ہے کہ شاہی خاندان سے تعلق رکھنے کے باوجود آج عالم زیب خان کی اولاد کی زندگی کافی مشکل سے گزر رہی ہے۔

بخت جہانزیب خان المعروف بہ تیمر خان

بخت جہانزیب خان (تیمر خان) نواب محمد شاہ جہان کا سوتیلا بھائی تھا۔ نواب شاہ جہان نے اس کو پدری جائیداد سے محروم کر کے صرف اس کی ماں کو مہر میں ملنے والی جائیداد دی جو تیمر گرہ میں واقع ہے۔ 1925ء میں نواب شاہ جہان اور تیمر خان کے مابین ایک معاہدہ ہوا اس وقت تیمر خان کی عمر بارہ سال تھی۔ انگریزوں کو گواہ بنا کر نو عمر کیلئے سالانہ پچیس روپیہ کابلی وظیفہ مقرر کیا گیا۔ اور اس کو ریاست میں

اس شرط پر رہنے کی اجازت دی گئی کہ وہ ریاست کے معاملات میں مداخلت نہیں کرے گا۔ یہی وجہ تھی کہ تیمر خان ہمیشہ ریاست کے داخلی معاملات سے کنارہ کش رہا۔

اس کی مثال رعایا کے عام آدمی کی سی تھی۔ 1931 میں تیمر گرہ پل کے پاس بند (وٹے) بن رہا تھا، بیگاریان کام میں مصروف تھے نواب ان دنوں نوے قلعہ تیمر گرہ میں مقیم تھا، ادھر آنکلا تو دیکھا کہ تیمر خان بھی بیگار میں لگا بڑے بڑے پتھر اٹھا کر لا رہا تھا۔

ایک دفعہ تیمر خان کے گھر کی دیوار گر گئی۔ کافی عرصہ یہ دیوار جوں کی توں رہی کیونکہ نواب کے ڈر سے وہ اسے تعمیر نہیں کر سکتا تھا۔ نواب نے اس کے ساتھ سوتیلا پن روا رکھا۔ ایک دن نوے قلعہ میں بلایا گیا نواب کے ہاں کرسی پڑی تھی۔ نواب نے کہا کہ کرسی پر بیٹھو مگر تیمر خان عام رعایا کی طرح چمن میں دوزانوں بیٹھ گیا، متعلقہ بات چیت ہوئی اور پھر عاجزی سے دو چار قدم پیچھے ہٹ کر نوے قلعہ سے نکل گیا۔

اخونزاہ بی بی کی مہر جائیداد

تیمر خان مہتر شجاع الملک (1895ء تا 1936ء) کا بھانجا تھا۔ شاید ماموں کی خاطر اس کی ماں کو مہر میں ملنے والی جائیداد میں تصرف کا حق دیا گیا۔ یہ جائیداد نواب اورنگزیب نے اپنی بیوی تیمر خان کی ماں اخونزا بی بی کو مہر میں دی تھی جس کی تاریخ کچھ یوں ہے۔

پرانے زمانے میں تیمر گرہ کے ابراھیم خیل قبیلہ کی فصل جب تیار ہوتی تو انڈھیرئی (پورے غاڑہ) کے پختون غربت کے مارے حملہ آور ہو کر لے جاتے تھے۔ اس زمانے میں تالاش میں لنڈئی خانان بڑا اثر ورسوخ رکھتے تھے۔ قبیلہ ابراہیم خیل نے اپنی حفاظت کی خاطر ان کو یہاں لا کر آباد کیا۔

کچھ عرصہ بعد لنڈئی خانان کی آپس میں دشمنی چھڑ گئی جس سے وہ کافی متاثر ہوئے۔ ایک بیوہ آمنہ بی بی رہ گئی وہ نواب اورنگزیب کے پاس گئی اور اسے اپنی جائیداد فروخت کرنے کو کہا۔ نواب اورنگزیب نے ان سے زمین خرید کر اپنی بیوی شہزادی قشقار اخونزاہ بی بی (تیمر خان کی والدہ) کو دے دی۔ آمنہ بی بی زمین کی قیمت لے جا کر تخت بھائی میں جا بسی اور ادھر ہی وفات پا گئی۔

دیر خاص میں واقع نوابی دور کا زنان خانہ اور محل

دیر خاص میں نواب کے حجرے محل اور زنان خانے کا بیرونی منظر

نواب محل کا دو منزلہ عمارت

نواب کا ذاتی کمرہ

نواب کا محل

تیمر خان کی بلند اقبالی

نواب کے دور میں تیمر خان اپنی زمینوں پر کاشت کاری کر کے ایک خان کی حیثیت سے زندگی بسر کرتا رہا۔ 1978ء میں جب تیمر گرہ نے ہیڈ کوارٹر کا درجہ حاصل کیا تو تیمر گرہ ایک تجارتی مرکز بن گیا ۔1979ء میں دیر کے لوگوں نے خلیج کا رخ کیا اور تیمر گرہ میں جائیداد مہنگی ہونا شروع ہوئی۔ تیمر خان کی قسمت جاگ اٹھی کیونکہ وہ تیمر گرہ کی بیشتر جائیداد کا مالک تھا۔ آج تیمر خان کی اولاد جائیداد کے لحاظ سے ایک امیر خاندان ہے۔ تیمر خان کی زندگی کسی درویش سے کم نہ تھی اس نے فلاحی کاموں میں حصہ لیا اور سکولوں، ہسپتال اور مساجد کیلئے مفت جائیداد دی۔

شاہی دربار کا حال

جب شاہی خاندان کا عروج تھا۔ تو دربار میں بڑی گہما گہمی نظر آتی تھی ۔ پہرہ داروں اور دربانوں کی موجودگی کے علاوہ قبائلی عمائدین کے جرگے آتے تھے ۔ نواب کے ذاتی دستے چاق و چوبند کھڑے رہتے ۔ درخت کے پتے اور پھول جھومتے ۔ پرندے پھڑ پھڑاتے، چہچہاتے، گھوڑے دم ہلاتے تو کبھی کتے سپاہیوں کے گریبانوں تک اچھلتے کودتے ۔

اسلحہ کارخانہ کے اندر ٹیک ٹیک کی آوازیں آتی بارعب نواب جب اس دربار تک نکل آتا تو سپاہی الرٹ ہو جاتے مگر کتے اور گھوڑے نواب کے رعب سے بے خبر اس طرح دم ہلا کر موج مستی کرتے ۔ نواب زرا چہل قدمی کے بعد دربار کے سامنے سبزہ زار کے آخری ایک کونے میں ڈبہ پر بیٹھ جاتا۔ جب شام ہوتی تو ٹمٹماتے ہوئے چراغوں والے گاؤں سے دور چٹان پر واقع نواب کا محل بجلی کے قمقموں سے روشن نظر آتا۔

چار دہائیوں بعد اس پر رونق دربار میں نہ وہ گہما گہمی ہے نہ چہل پہل آج وہاں سینکڑوں کی بجائے دو نوکر چارپائی پر بیٹھے آپ کو خوش آمدید کہیں گے ۔ یہ قلعہ نواب خاندان کا ایک بڑا قیمتی اثاثہ اور دیر کے آثار میں بڑی اہمیت رکھتا ہے ۔ اس کے وارث بھی بہت کم باقی ہیں یہی وجہ ہے کہ بعض لوگوں کی نظریں اس دربار کو قبضہ کرنے پر جمی ہوئی ہیں ۔

شاہی خاندان کے مزار

حکمرانان دیر تین مقامات پر دفن ہیں، لاجبوک، بیبیوڑ، دیر خاص۔ حکمران خاندان کا جداعلی اخون الیاس اور زوجہ بمقام لاجبوک دفن ہیں جن کے مزاروں پر نواب اورنگزیب کے عہد میں چبوترے بنائے گئے۔ سب سے پرانا اور بڑا قبرستان دیر خاص میں بازار میں واقع ''خان شہید قبرستان'' ہے جن میں قاسم خان المعروف بہ خان شہید، خان غزن خان، خان رحمت اللہ خان، خان محمد شریف خان کے علاوہ ان کی ازواج اور اولاد دفن ہے۔ نواب اورنگزیب نے اپنے عہد میں ان مزاروں کو سنگ مرمر سے مزئین کیا اور اور اس پر خوبصورت چبوترے بنائے جو آج بھی خستہ حال حالت میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

نواب دوم اورنگزیب اور نواب شاہجہان سمیت کئی ازواج کی قبریں محل کے نیچے ایک چھوٹی سی مسجد میں واقع ہیں۔ جبکہ نواب محمد شاہ خسرو، محمد شاہ ناصر خان، سلیم خان اور دوسرے شہزادوں کے مزار محل کے اندر شاہی مسجد کے سامنے ایک باغیچے میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان مزاروں پر عمدہ اور قیمتی سنگ مرمر لگایا گیا ہے، جنہیں دیکھنے کیلئے سیاح بھی آتے ہیں۔

ریاست دیر انقلاب کے بعد

1960ء میں نواب شاہ جہان گرفتار ہوا تو ریاست دیر ترقی کی راہ پر گامزن ہوئی۔ نواب محمد شاہ خسرو کے عہد میں ریاست میں علمی، معاشی اور زرعی ترقی ہوئی۔ 1979ء میں دیر کے عوام نے خلیج کا رخ کیا، پیسہ آیا، لوگ خوشحال ہوئے جس کی وجہ سے دیر نے مختصر عرصے میں تیز رفتار ترقی کی۔

گزشتہ چالیس سالوں میں دیر میں کئی قصبے آباد ہوئے، کاروبار نے خوب ترقی کر لی ہے، دیر کے طلباء ملکی اور غیر ملکی یونیورسٹیوں میں کثیر تعداد میں علم حاصل کر رہے ہیں۔ رعایا کو تعلیم سے روکنے والے حکمران کی ریاست میں آج ملاکنڈ یونیورسٹی قائم کی جا چکی ہے۔ سیاست میں لوگ باشعور ہے اور دیر کے سیاستدانوں کا صوبائی اسمبلی پر کافی اثر ورسوخ ہے۔ کئی ارب روپے کی لاگت سے آٹھ کلومیٹر لمبا ملک کا سب سے بڑا لواری ٹنل تکمیل کے مراحل میں ہے۔

مذہبی میدان میں بھی دیر کے لوگ آگے آگے ہیں۔ پاکستان بننے کے بعد دیر واحد علاقہ تھا جہاں سے شریعت کے نفاذ کیلئے بھرپور تحریک چلائی گئی۔ دیر کے عوام کے دل بین الاقوامی سطح پر مسلم امہ کے ساتھ دھڑکتے ہیں۔ دیر کے عوام نے تحریک خلافت، جہاد کشمیر اور روسی یلغار روکنے میں اپنے جانوں کے نذرانے پیش کئے۔ آج دیر میں ہزاروں کی تعداد میں حافظ قرآن موجود ہیں لوگوں میں دینی تعلیم کے حصول کا رجحان بھی بہت زیادہ ہے۔

الغرض وہی ریاست جس میں چار بسیں، تین آئل پمپ اور دو سو کے لگ بھگ دکانیں تھیں آج اُسی دیر میں بیس ہزار سے زائد Dir کے نام سے رجسٹرڈ گاڑیوں کے علاوہ بارہ سو سے زائد کلومیٹر کچی اور پکی سڑکوں کا جال پھیلا ہوا ہے۔ تین لاکھ کے قریب دیروجی خلیج اور ملک کے باقی شہروں میں حصول تعلیم اور روزگار کیلئے مقیم ہیں۔ اس زمانے میں نوابی قلعوں میں صرف نو ٹیلیفون تھے اور آج تیس ہزار پی ٹی سی ایل کے علاوہ پچاس ہزار سے زائد موبائل کنکشن موجود ہیں۔

کتاب کے سلسلے میں کئی سالوں کی تحقیق کے دوران چار سو نامی گرامی معروف شخصیات سے تاریخی معلومات حاصل کی گئیں۔ جن میں کئی بزرگ اب اس دنیا میں نہیں رہے ایسے ہی چند اہم نام درجہ ذیل ہیں۔

بزرگ شاہ زیب مردان (بیٹا عالمزیب خان)۔ سلطان خان جان بٹئی براول (بیٹا عالمزیب خان)۔ نور محمد بیٹا داروڑہ خان چچا زاد بھائی نواب شاہ جہان چکدرہ مانوگی۔ میاں گل جان فیملی ممبران (حال کاٹ پائی)۔ سنگر خان فیملی ممبران (میدان)۔ اللہ نواز پوتا نواب شاہ جہان بیٹا محمد نواز خان موضع مردان۔ امیر خان، رضا خان پوتے نواب شاہ جہان بیٹے محمد شاہ خان حیاسیرئی، محمود زیب خان، احمد زیب خان عالمگیر خان، ٹیپو خان (پوتے بخت جہانزیب خان المعروف تیمر خان)۔

محمود جان مرحوم (حیاسرئی) سابقہ نواب شاہ جہان تحصیلدار، سردار ملک پسر بارکند ملک (گاؤں گلکوڑ)، نوشیروان ملک (عشیرئی خاص)، محمد یار ملک پسر بارکند ملک تحصیلدار عشیرئی، اسفندیار صوبیدار پسر محمد شاہ تحصیلدار (الماس عشیرئی)، ڈائریکٹر ارجمند خان سیکرٹری نواب محمد شاہ خسرو (دیر خاص)، جان عالم صوبیدار مرحوم، سید حسن صوبیدار دیر خاص، دلاور خان مرحوم پسر رضا خان تحصیلدار۔ سر قاضی سابقہ جمالدار دیر خاص۔ جمالدار کبل مرزا (دیر خاص)۔ عثمان زرین پسر گل زرین تحصیلدار دیر خاص۔ انعام اللہ پسر تحصیلدار امان اللہ خان وزیر دیر خاص۔ خضر حیات پسر فضل غفور تحصیلدار۔

عابد جمالدار مرحوم حیا سرئی (نواب لاہور ملازم)۔ وزیر جمالدار بھائی عابد جمالدار دیر خاص۔ مشتاق احمد پوتا قاضی القضاء نواب شاہ جہان جڑ جوڑئی مولوئی صاحب، عبدالصمد جان پسر عبداللہ جان تحصیلدار، شفیق الدین بھتیجا فضل غفور تحصیلدار تیمر گرہ۔ سرلڑہ صوبیدار جندول جمشید خان (پوتا سید احمد خان سسر شاہ جہان نواب، عالمزیب خان) ثمر باغ۔ مرحوم جمال کچکول ملک تیمر گرہ۔ میاں سید جمالدار منڈا، قلندر شاہ جمالدار منڈا۔ بھادر خان، طوطی مرزا، علی محمد اور دربار ملازمین۔ نادر حاجی دائی والد تیمور شہزادہ۔ نواب شاہ جہان ڈرائیور بادشاہ زادہ ملک تالاش ناسافہ۔

دلبر ملک مرحوم نہا گدرہ، ملک شیر عظیم خان نہا گدرہ۔ جمالدار گل ملک (محمد امین ملک)۔طور لعلی ملک باغ میدان۔محمد امین ملک المعروف گل ملک، حیان اللہ خان نہا گدرہ۔مختیار علی اینڈ سید حسین شاہ نزد داروڑہ نرہانڑ گاؤں۔عبدالقیوم خان (سمکوٹ خان)۔زاہد خان ملک شجادئی۔سید بہرور جان خزانہ۔فاتح محمد گجر (گلدئی کوہستان)۔مفتاح الدین پسر سید باؤ جان (دیر خاص)۔پاچی بابا نواب ہوٹل بیرہ۔عبدالحکیم فارسڑ (دیر)۔تالاش ڈھیری قاضی بابا مرحوم۔

صاحب علی تیمر گرہ (سابق مالی باغ نواب دیر۔ منیجر جمال (دیر)۔میاں کلی ایوب حکیم پسر (محمد شاہ حکیم نواب)۔حاجی گل بادشاہ اخون خیلماندیش۔عزیز اللہ خان ایکسین اوچ خان پسر اکرم خان۔حضرت صاحب طوطہ کان۔مبارک بخت خان باغڈئی میدان، عنایت خان باغڈئی خان۔حیدر شعیب سیٹھ خال، رشید سیٹھ خال۔لائق سید اخونزادہ مرحوم (خال)۔اخونزادہ چی بابا۔اخونزادہ اکبر سید۔مراد سید اخونزادہ۔رحمت باری اخونزادہ پوتا عبدالجلیل اخونزادہ، منیر سید اخونزادہ، عنایت سید اخونزادہ۔محبوب اخونزادہ (منڈا)۔عزیزادہ ملک تیمر گرہ۔منور ملک تیمر گرہ، خائستہ ملک خیمہ۔ملک شاد محمد خان المعروف شاہ ملک خونگی۔فرید خان پسر جلاد ملک اوچ۔بختیار خان اوچ۔ملک حبیب اللہ خان حاجی آباد

ولی عہد میاں گل اورنگزیب (سابقہ گورنر بلوچستان داماد صدر ایوب خان)۔عدنان باچہ پوتا والی سوات سابقہ ایم این اے۔اسفندیار باچہ پوتا والی سوات سابقہ وزیر تعلیم وناظم اعلی۔شاہ جہان بابا (والی سوات ڈرائیور)، کپتان شاہ روان بجوات۔عمرا خان پوتا اسد اللہ متین مرحوم (غالیگے سوات) فضل ربی راہی (مورخ تاریخ سوات)۔زین الوہاب (ڈائریکٹر چکدرہ میوزیم)۔پروفیسر ڈاکٹر حسن دانی صاحب (ڈائیریکٹر ٹیکسلا انسٹیوٹ قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد)۔ڈاکٹر تقی بنگش (چیئرمین ہسٹری ڈپارٹمنٹ)۔اباسین یوسفزئی (پختو اکیڈمی یونیورسٹی آف پشاور)۔پروفیسر ڈاکٹر عباس (اسلامیہ کالج پشاور)۔

(1) (Chitral and Kafiristan by L.t Col. M.Afzal Khan)

(2) زماژوندا وجدوجہد — باچاخان

(3) داستان دیر — ریاض الحسن

(4) یوسفزئی پٹھان — اللہ بخش یوسفی

(5) دیر سوات باجوڑ اینڈ ارنگ برنگ — ایم سی میمن

(6) دیرو باجوڑ — اشرف درانی

(7) گجر — اجمل خٹک

(8) پیر مانکی شریف — سید وقار علی کاکاخیل

(9) سوانح عمری بادشاہ صاحب — سید عبدالغفور

(10) بسوئے کافرستان — ایرانی سیاح محمود دانشور

(11) نوے دیر — محمد اسلام (اجملی)

(12) ریاست دیر تاریخ کے آئینے میں — حبیب الرحمٰن میر منشی

میں اللہ تعالیٰ کا بہت شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے قومی تاریخ محفوظ کرنے کی توفیق عطاء فرمائی میں اپنی قوم اور دوست واحباب کا بھی ممنون ہوں جنہوں میرے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔

گمنام ریاست محض ایک تاریخی کتاب لکھنا نہ تھا بلکہ ایک قوم کے ماضی اور اس کی ثقافت کو محفوظ کرنے کا ایک ایسا بڑا منصوبہ تھا کہ اگر حکومت یہ کام کرتی تو اس پر درجنوں افراد کام کرتے اور ایک خطیر رقم خرچ ہوتی لیکن اللہ نے مجھے یہ توفیق عطاء فرمائی کہ زمانہ طالب علمی میں میں نے قوم کی خدمت کے جذبے سے سرشار ہو کر اس کام کا بیڑا اٹھایا۔

اگر میں اپنی پہلی کتاب ''گمنام ریاست'' میں قوم سے وعدہ نہ کرتا تو شاید یہ دوسری کتاب نہ لکھ پاتا کیونکہ دیر کی تاریخ کافی متنازعہ ہے، نواب شاہ جہان نے ایسی تاریخ چھوڑی ہے جسے قلمبند کرنا نہایت ہی مشکل کام ہے۔ گویا کہ یہ ایک دلدل ہے لیکن میں نے تعصب سے بالاتر ہو کر حقیقت کو سامنے لانے، حقیت پر مبنی حوالے ڈھونڈنے اور کتاب کو مستند بنانے کیلئے شب و روز محنت کی ہے۔ جس کا اندازہ آپ لوگ کتاب پڑھنے پر کر سکتے ہیں۔ گمنام ریاست میرے سات سالہ شبانہ روز محنت کا نتیجہ ہے۔ مجھے فخر ہے کہ میں نے اپنی قوم کو ''گمنام ریاست'' کی صورت میں ایک بیش قیمت تحفہ دیا ہے۔

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ آج مغرب والے تحقیق و تخلیق، سائنسی ایجادات، اور تسخیر کائنات میں مصروف ہیں جبکہ ہماری قوم مال و زر کی رسیا، موبائل، گاڑی، بنگلہ کی بھول بھلیوں میں کھوئی ہوئی ہے آج اگر ہماری قوم میں کتاب پڑھنے والے کم ہے مگر مجھے امید واثق ہے کہ آئندہ نسلیں صدیوں تک ''گمنام ریاست'' سے مستفید ہونگی۔ گمنام ریاست تحقیقی مقالے لکھنے اور سی ایس ایس اور پی سی ایس کے امتحانات میں بھی مددگار ثابت ہوگی۔ نئی نسل ان کتابوں کو پڑھ کر اپنی آباؤ اجداد کے تاریخ سے واقف ہوگی۔

میرا خیال تھا کہ گمنام ریاست لکھ کر آئندہ کچھ نہیں لکھوں گا۔ لیکن اب میرا فکر و تخیل اور میری تخلیقی صلاحیتیں مجھے مجبور کر رہیں کہ میرا قلم آئندہ بھی روشنی پھیلاتا رہے۔ اس غرض کیلئے میں بعض ترقی یافتہ ممالک کی سیاحت کا ارادہ رکھتا ہوں جہاں کے مشاہدات سے میرا قلم اور بھی زوراور ہوگا۔ میری دعا ہے کہ اللہ میرے ذہن اور خداداد صلاحیتوں کو ملک، مذہب اور انسانیت کی بھلائی کیلئے استعمال کرنے کی توفیق عطاء فرمائے۔ (امین)

قوم کے نام پیغام

بحیثیت دیروجی قوم اب ہمارا وژن ریاست یا ضلع کی حد تک نہیں بلکہ پاکستان اور پوری دنیا تک ہونا چاہیے۔ ہمارا اولین مقصد اللہ اور اس کے رسول کے احکامات کی پیروی ہونا چاہیے۔ دینی علوم کو ابتدائی سیڑھی بنا کر جدید علوم کے حصول کی سعی کرنی چاہیے۔ ہمیں تعصب اور تنگ نظری سے بالاتر ہو کر معاشرہ کی خوشحالی اور ترقی کیلئے کام کرنا چاہیے۔ قومی مفاد کو ذاتی مفاد پر ترجیح دینی چاہیے۔ شاید ان باتوں پر عمل کر کے ہم اپنی آئندہ نسلوں کو پرامن اور خوشحال زندگی دے سکیں۔

سلیمان شاهد

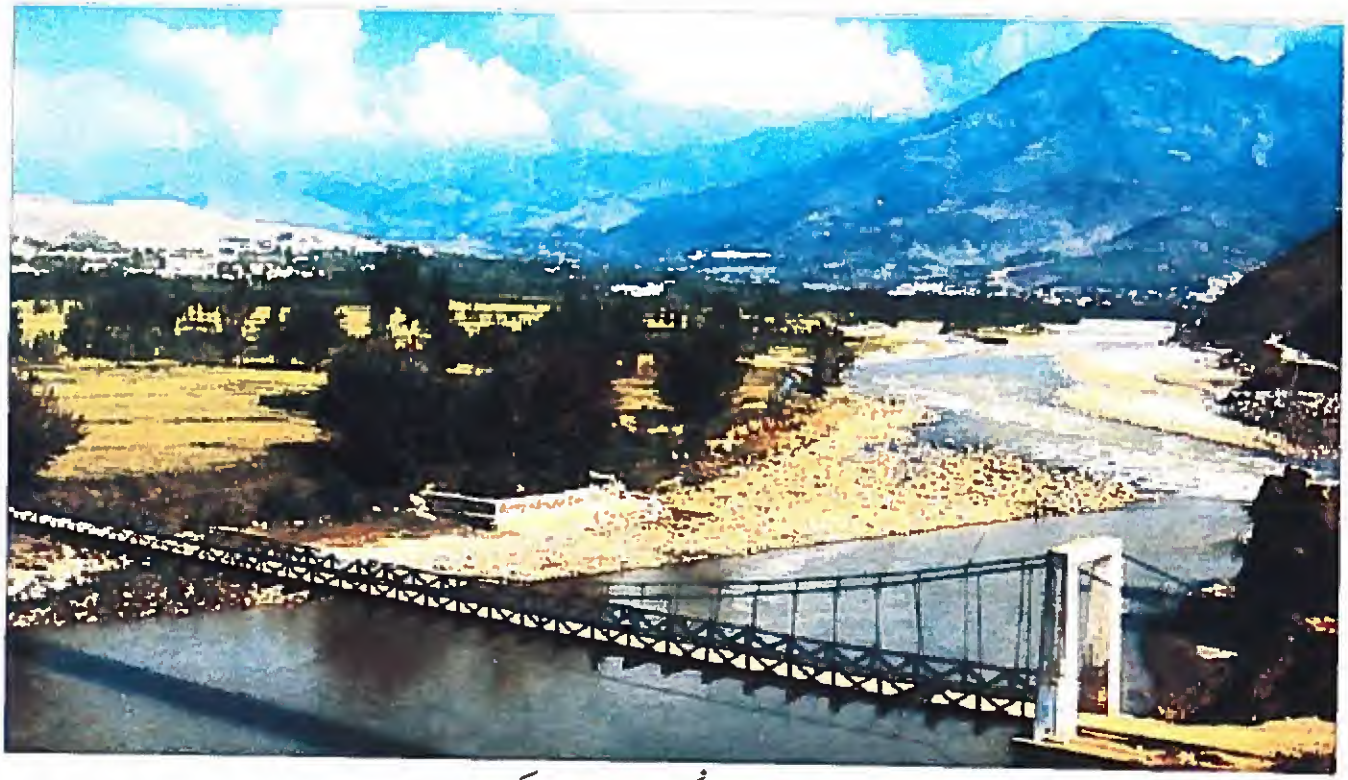

بمقام ذوال بابا دریائے پنجکوڑہ اور لہلہاتے کھیتوں کا نظارہ

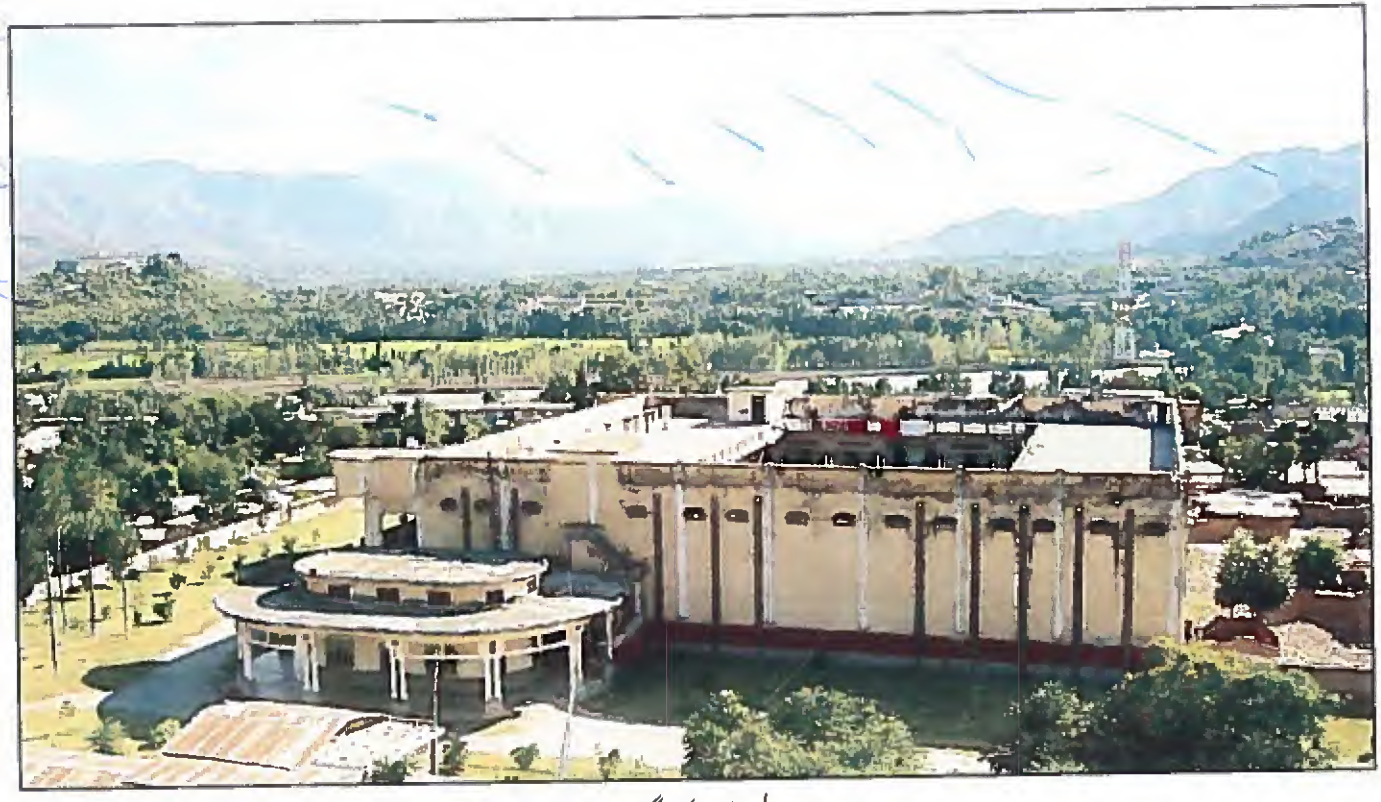

جندول خان کا بنگلہ منڈا

SULEMAN SHAHID
Cell: 0300-9030423
encyclopedia_dir@hotmail.com
:encyclopedia_dir@yahoo.com